اختری بیگم

# اختری بیگم

از

مرزا رسوا بی۔ اے

مصنف امراؤ جان ادا

کتب خانہ علم و ادب کراچی ۳

کتابیں ملنے کا پتہ ۔ اکرام احمد تاجر کتب

ڈنڈاس اسٹریٹ صدر کراچی ۳

نبیران مرزا رسوا کی اجازت سے



طبع جدید　　سنہ ۱۹۵۲ء　　قیمت (۳/ سے)

۷۸۶

# باب ۱

نہ ہوگا یاد لیکن جب کبھی اچھے ستارے تھے ٭ ہمیں تو اک تمہارے تھے تمہیں تو اک ہمارے تھے

جاڑے کا دم نکل چکا ہے۔ مگر ابھی تک نہ بدن سے گرم روئی بھرے ہوئے دگلے اترے ہیں نہ کندھوں سے رضائیاں نہ چارپائیاں اندر کے دالانوں اور بند کمروں سے باہر نکلی ہیں، نہ فراشی پنکھے چھتوں سے لٹکائے گئے ہیں۔ نہ ہاتھ کے پنکھے خریدے گئے ہیں۔ نوروز کے دن کا انتظار ہو رہا ہے۔ ابھی پندرہ دن باقی ہیں۔ دن کو گرمی ہونے لگی ہے۔ آفتاب کی تمازت کسی قدر بڑھ گئی ہے۔ مگر رات کو خصوصاً صبح ہوتے اچھی سردی ہوتی ہے۔ پت جھڑ کا موسم ہو چکا مگر ابھی تک درخت ڈنڈ کھڑے ہیں نئی کونپلیں پھوٹنے والی ہیں، ہولی ابھی تک نہیں جلی۔ پپیہے کا شور، کوئل کی کوک ابھی تک کانوں میں نہیں پہنچتی۔ پتلی پتلی ککڑیاں سچ مچ لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں، بازاروں میں دو ایک میوہ فروشوں کی دوکانوں میں پانی سے بھیگی ہری ہری دکھائی دیتی ہیں۔ مگر نوروز کے انتظار کرنے والوں نے ابھی نئی نہیں کیں۔ کورے کورے جھجھر کے گھڑے جھجریاں صراحیاں ابھی تک آبدار خانوں میں نہیں سجائی گئیں۔ مشک بکنا موقوف ہو گئی۔ دو ایک فالودے والے گلیوں میں کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں مگر ابھی تک سردی باقی ہے۔ اس لئے نگاہیں شوق سے پانی میں تربتر لال صافیوں

---

؎ قدیم دہلی میں گگڑیوں کے بیچنے کی یہی صدا تھی ۱۲۔

پر نہیں پڑتیں۔ مسلمان ہر نئے دن دوپہر کو اور ہندو رات کو ملائی کی برف کے پکارنے والے اب کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ کل کی برف بیچنے والوں کی آواز ابھی نہیں سنائی دی ہے۔

اس موسم میں معالی خاں کی سرائے کے قریب میاں الماس کے امام باڑے کے پچھواڑے، ایک وسیع پختہ سہ منزلہ مکان کا دروازہ شاندار مگر بہت قدیم جس کی برنجی کیلیوں پر چمک کا نام نہیں ہے، احاطہ کی دیواریں جا بجا سے شکستہ مرمت طلب، استر کاری تو مدت سے اُڑ گئی۔ اب لکھوری اینٹیں جو جوڑ سے جوڑ ملا کے لگائی گئی تھیں اُن پر جا بجا لونی لگی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں دو چار اینٹیں بھی ٹوٹ ٹوٹ کر نکل گئی ہیں۔ اسی پھاٹک کے پاس گلی میں ایک دربان مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ مدار یہ حقہ منہ سے لگا ہے چلم میں آگ کی چنگاری شاید راکھ کے کریدنے سے نکل آئے تو نکل آئے مگر حقّے کے کش سے دھواں نہیں نکلتا۔ پھاٹک کے اندر جانے والے کو دونوں طرف دو کمروں کے دروازے دکھائی دیں گے۔ اس کے بعد زنانی ڈیوڑھی کا دروازہ ہے، ٹاٹ کا پردہ پڑا ہے۔ بہت پرانا جا بجا سے پھٹا ہوا ہے، یہی پردہ اندرونی شان و شوکت کے ہٹے ہوئے آثار کا پردہ پوش ہے۔ باہر کے کمروں میں ایک مردانہ نشست کا مقام ہے۔ فرش فروش کسی حد تک آراستہ ہے۔ سفید چاندنی کا فرش ہے، اس کمرہ کے تین دروازے باہر گلی کی طرف کھلتے ہیں۔ مگر اسوقت بند ہیں، مقابل کے کمرے میں جو ڈیوڑھی کے دوسری جانب ہے نوکروں کا قبضہ ہے۔ تین چار پائیاں بچھی ہیں۔ بان کے پلنگ بہت دنوں کے بُنے ہوئے ہیں۔ بان لٹک رہے ہیں، ایک ایک پلنگ میاں مدار بخش کا ہے۔ جن کو دروازے کے پاس مدار یہ حقہ منہ سے لگا اونگھتے ہوئے ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ شاید اس وقت چونکے ہیں۔ کس نے چونکایا ہے ایک ادھیڑ سی کالی لمبی سی کسی قدر موٹی مہری اودی چھینٹ کا میلا گھیر دار لہنگا

لال شال باف کی گوٹ بہت چوڑی آدھے لہنگے سے کچھ ہی کم ہوگی۔ لال لوٹل کا نیفہ نین سُکھ کی کرتی بادامی رنگی ہوئی تن زیب کا زرد رنگا ڈوپٹہ جو پچھلے بسنت کی خبر دیتا ہے۔ مگر بہت ملگجا۔ مدار بخش سے دو دو باتیں ہوتی ہیں، معمولی پرسش کے بعد اندر جانے کی اجازت ملتی ہے۔ گویا اسی کے ساتھ ساتھ اس قصہ کا راوی بھی اندر جاتا ہے زنانخانہ بہت وسیع صحن کے سامنے دالان، پیش دالان طرفین میں صحنچیاں، صحن کے دونوں طرف دو دو کمرے، ڈیوڑھی کے قریب ایک کمرہ جس میں اسوقت بھی دھواں ہے یہی باورچی خانہ ہے۔ آگے کے دالان میں تختوں کے چوکے پر فرش قرینے سے بچھا ہوا ہے۔ اس وقت خورشید مرزا صاحب دونوں صاحبزادیوں کے ساتھ خاصہ نوش فرمارہے ہیں۔ بڑی صاحبزادی جعفری بیگم ماں کے مرنے کے بعد جس کو تین برس گذر چکے ہیں۔ زنانخانہ کی مہتمم اور مالک ہیں، گورا رنگ لمبا قد، سن تو کچھ ایسا نہیں ہے صرف سولہ برس مگر اچھی خاصی بیس پچیس برس کی عورت معلوم ہوتی ہیں۔ نہ خوبصورت نہ بدصورت، نہ سر جھاڑ نہ منہ پہاڑ، نہ بہت بنی سنوری، سادہ سادہ لباس ہلکا ہلکا گہنا، اسوقت دسترخوان پر پکانے والی حاضر ہے۔ اور ایک ماما نوجوان باورچی خانہ سے گرم گرم چپاتیاں لاتی جاتی ہے۔ پکانے والی سالن، دال، خشکا، چٹنی اچار، مربہ، ملائی اور دہی جعفری بیگم صاحبہ کے حسب الحکم حاضر کرتی جاتی ہے۔ کیونکہ گھر کی منتظم سمجھو مالک سمجھو یہی صاحبزادی ہیں۔

چھوٹی صاحبزادی نادری بیگم کوئی چودہ برس کا سن وسال جن کا خوبصورتوں میں شمار ہے کسی قدر بنی سنوری مگر شریفانہ سیدھی مانگ چوٹی گندھی، ڈھیلی ڈھیلی کرتی نیچا دوپٹہ، پائجامہ کے پائنچے نہ بہت بڑے نہ بہت چھوٹے۔ اِس سن وسال صورت شکل پر بہت دبی دبائی شرمائی ہوئی باپ کا پہلو دبائے بیٹھی ہیں، خورشید مرزا بہت خوش نظر نہیں آتے۔ یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ ابھی کسی پر خفا ہوچکے ہیں، تیوریاں

پڑھی ہیں۔ لیکن انداز سے کچھ خوش مزاج بھی نہیں معلوم ہوتے، کچھ اس طرح سے بیٹھے ہیں جیسے کوئی فکر مند ہو۔ اس صورت سے کہ کسی کو مشکل سے بات چیت کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے۔ اگرچہ طبیعت کے بہت نیک امیرانہ صورت اگر اسوقت فکرمند نہ ہوتے تو خواہ مخواہ اُن سے دو باتیں کرنے کو جی چاہتا مگر اب جرأت نہیں پڑتی اسوقت پر موقوف نہیں اکثر یہی حالت رہتی ہے۔ اگرچہ لڑکیوں پر کبھی خفگی ظاہر نہیں کی، نوکروں پر کبھی برہم نہیں ہوئے۔ بیٹیاں باپ کو بہت چاہتی ہیں مگر کبھی خوش مزاج نہیں پاتیں کہ دلوں کی خواہشیں زبان پر لائیں یا کچھ خاص فرمائشیں کرسکیں۔ باواجان کو کبھی ہنستے کیا مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔ شاید اماں جان کے مرنے کا غم ہے۔ مگر اُن کے جیتے جی بھی یہی حال تھا۔ کچھ طبیعت کا انداز ہی ایسا ہے اماں جان سے بھی جیسا اخلاص چاہیئے ویسا نہ تھا۔ ہم کیا جانیں سب کہتے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی کسی نے میاں بیویوں کو آپس میں بہت خوش و خرم ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی۔ روپیہ پیسہ گہنا پاتا کپڑا لتہ، کھانا پینا، گھی تیل نون غلہ ترکاری ہر چیز افراط سے، فصل پر گنوں کی بھانڈیاں، پنسیریوں خربوزے، ٹوکرے کے ٹوکرے آموں کے کبھی کسی چیز کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی، ہر چیز اپنے وقت سے موجود کبھی خرچ کا حساب نہیں لیا آج خرچ دیا یا اناج یا گھی آیا۔ اگر مہینہ کے خرچ کا تھا اور آٹھ دن میں صرف ہوگیا تو اُس خدا کے بندے نے یہ نہیں کہا کہ ابھی سے کیوں خرچ ہوگیا۔ اماں جان نے جس کو چاہا دیدیا۔ لٹا دیا۔ پھینک دیا۔ ابا جان نے کبھی نہیں پوچھا کہ کیا کیا۔ اے لو جب سے خدا بہشت نصیب کرے وہ مرگئیں ہم دونوں کے ساتھ وہی حال ہے بلکہ اماں جان کے وقت سے زیادہ اللے تللے کرتے ہیں۔ خدا باواجان کو جیتا رکھے جیسا ہم کھاتے پیتے ہیں اوڑھتے پہنتے اوٹھاتے لٹاتے ہیں۔ شاید ہمارے بھرے کنبہ میں تو کسی کی بیٹیاں تو

کیا۔ بیٹوں کو بھی نصیب نہیں۔ ہاں ایک بات ہے کہ باداجان کو کبھی ہم نے خوش مزاج نہیں دیکھا، خدا جانے کیا غم ہے کیا فکر سوار ہے، اچھا پھر اسے کیا کریں ایک شخص کا مزاج ہی ایسا ہے۔ جب بیا ہتا بیوی کے ساتھ یہی حال تھا تو ہم تو بیٹیاں ہیں کیوں زیادہ چو چو پو چو کریں، کیوں زیادہ منہ لگائیں، یہ خیالات لڑکیوں کے دلوں میں تھے خورشید مرزا کے دل کا حال خدا ہی جانے۔

ابھی دستر خوان ہی پر ہیں، باہر سے آنے والی مہری نے ادب سے تین تسلیمیں کیں۔ ایک سر بند لفافہ مرزا صاحب کے ہاتھ میں دیا پھر تین تسلیمیں کر کے رخصت ہو گئی یہ ہم کیا لکھتے کہ نوکروں چاکروں ماما اصلیوں نے اس مہری کی کیا آؤ بھگت کی معمولی باتیں تھیں۔

ماما ئیں۔ اے بوا تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، اچھا لے لو ٹکڑا پان تو کھاتی جاؤ مہری چپکی آئی اور جس کام کے لئے آئی تھی وہ کام کیا یعنی خط نواب صاحب کو دیا اور چلتی ہوئی، نہ کسی بات کا جواب دیا نہ ٹکڑا پان کھایا۔ دروازے سے باہر نکل کے اپنی ڈبیا کھولی ہرے ہرے پانوں کی ایک گلوری بہت سا تمباکو پڑا ہو، کلّے میں دبائی۔ میاں مدار بخش دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس انتظار میں کہ شاید مجھے بھی ایک پان دے، کچھ اپنا نشان دے، یہ خدا کی بندی لمبے لمبے ڈگ بھرتی چند لمحوں میں گلی کے نکڑ تک پہنچ گئی۔ مدار بخش حقہ بھرنے لگے۔ نواب خورشید مرزا نے لفافہ اپنے نام کا دیکھ کے اور لفافہ پر عورتوں کے خط کا خاص نشان ”اسم برخانہ“ پڑھ کے لفافہ کو جیب میں رکھ لیا۔ مہری تو کب کی جا چکی تھی۔ اب اس گھر کی رہنے والیاں دونوں صاحبزادیاں ماما ئیں اصیلین اس اجنبی مہری اور اس سر بند لفافہ کا بھید کیا سمجھیں، نواب صاحب سے پوچھ تو کون سکتا تھا ہاں سب غور سے نواب صاحب کا منہ دیکھ رہے تھے وہ بھی نظریں بچا بچا کے، لفافہ کو دیکھ کے پہلے تو نواب صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار

پائے گئے، پہلے چند لمحہ تک جو سب کا حال تھا یہ کس کا خط ہے؟ یہی نواب صاحب کے چہرے سے پایا جاتا تھا۔ شاید بے ساختہ زبان سے بھی یہ فقرہ نکل گیا ہو کس کا خط ہے؟ پھر چند لمحہ تک حافظہ کا دفتر اُلٹا پلٹا گیا، دماغی دفتر کا معائنہ چند ہی لمحہ کا کام تھا، نہ دماغ کے اندر الماریاں ہیں نہ صندوق نہ مسلیں مرتب ہیں نہ بستے بندھے رکھے ہیں اور پھر گویا سب کچھ ہے لفافہ پر نظر پڑتے ہی چالیس اور دو بیالیس برس کے حالات پر خیال دوڑ گیا۔ اس خط کا سلسلہ کہاں سے ہے؟۔

آہاہ! وہ جس سال لکھنؤ میں سیلاب آیا تھا۔ اس کے ایک برس کے بعد حضرت عباسؑ کی درگاہ، وزیر باغ! شاید وہ تو نہ ہو وہی ہے! ہاں وہی ہے! تو پھر اب کیا؟ وہ دفتر ہی اُلٹ گیا اوہ! پچیس برس کے بعد! ع

دِل کے ناسور کو پھر چھیڑ دیا۔

نواب صاحب کے چہرے کی رنگتیں بدلیں کبھی تیوریاں چڑھیں کبھی اُتریں اور یہ سب بہت جلد جلد لڑکیوں کا خیال ہے کہ جب باداجان دسترخوان سے اُٹھے ہیں تو آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں جھلکتی نظر آتی تھیں۔ آخر جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کے باہر دیوان خانہ کی طرف چلے گئے، روزانہ یہی معمول تھا کہ دو پان نوش فرما کے حقہ سُلگا کے دو ایک کش پی کے باہر جاتے تھے، آج (خط کے پڑھنے کی) جلدی میں یہ کچھ نہیں ہوا۔ باہر تشریف لے گئے، حسینی خانم جب خاصدان اور حقہ لے کے دیوان خانہ میں گئی ہے تو وہی خط نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا اور رومال آنکھوں پر۔

حسینی خانم۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی کہ زار و قطار رو رہے ہیں۔ میں نے آنسو ٹپکتے نہیں دیکھے یہ بھی میں نہیں کہہ سکتی کہ خالی منہ پوچھا یا آنسو پونچھے۔ مگر جب سے کچھ گھبرائے ہوئے اُداس اُداس ہیں۔ گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں مگر بے چین، اس مہری اور اس خط کے آنے سے اس گھر کی سب رہنے والیوں کو حیرت سی تھی۔ خصوصاً دونوں

صاحبزادیوں کے دلوں کی تشویش اور بے چینی بے سبب نہ تھی، جس طرح کسی بڑی سلطنت کسی سخت انقلاب سے اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ اس چھوٹی سی گھریلو جمہوریت کا حال تھا۔ ایک تلاطم تھا جس کے آثار دلوں میں زیادہ اور زبانوں پر کم تھے۔ ہاں چپکے چپکے کچھ باتیں ہوتی تھیں۔ خیال تھا کہ مدار بخش سے کچھ پتہ چلے گا۔ حسینی خانم پوچھ بیٹھیں۔ مدار بخش کو کچھ ایسی فکر نہ تھی۔ خشک چار روپے مہینہ کبھی کبھی دو چپاتیاں دال سالن اندر سے آگیا۔ اس کے سوا نہ زیادہ طلب تھی اور نہ زیادہ کی اُمید رکھ سکتے تھے۔ جس راجہ یا رانی کا راج ہو۔ ان کی حالت وہی رہے گی۔ اگر نواب صاحب نے کسی دوست کی خاطر سے باہر چائے پی تو ایک پیالی بچی ہوئی میاں مدار بخش کو بھی مل گئی۔ یہ خود اپنی چائے حسین علی اور دو ایک افینیوں کے ساجھے میں روز بنا کے پیتے تھے۔ اب اسی کا سامان کر رہے تھے۔ مدار بخش کو اس مہری کے معاملہ سے زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ مہری سے یہ سوال انھوں نے بھی کئے تھے کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ بہ مشکل اتنا پتا لگا تھا کہ سنئے گاؤں سے بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے، کون بیگم صاحبہ؟ کیسی بیگم صاحبہ؟ یہ کچھ معلوم نہ تھا۔ مگر لڑکیوں کی تشویش کے حد سے زیادہ بڑھانے کو یہی کافی تھا۔

صاحبزادیاں! اماں کو مرے تین برس ہو گئے۔ باوا جان کا یہ حال ہے وہ ظاہر ہے کبھی خوش نہیں رہتے، ابھی بوڑھے نہیں ادھیڑ ہیں، عزیز دوست احباب دوسری شادی خانہ آبادی (لڑکیوں کے خیال سے خانہ بربادی)، کے صلاح دیتے ہیں۔ لڑکیوں کو سوتیلی ماں سے جو اندیشے ہوتے ہیں وہ بیجا نہیں اپنی سگی ماں کی جگہ وہ جو اب قبر میں ہیں دوسری عورت کو اپنے باپ کے پہلو میں دیکھنا موت ہے۔ نواب صاحب رو ئے ہوں یا نہ روئے ہوں مگر دونوں صاحبزادیاں خصوصاً بڑی صاحبزادی جب سے یہ کم بخت مہری آئی ہے کئی بار رو چکی ہیں۔ ایک تو سوتیلی

ماں کا رونا، دوسرے اس کا رونا کہ اب جو آزادی ہے وہ پھر کہاں، اب روپیہ پیسہ خرچ سب ہمارے ہاتھ میں ہے جس طرح جی چاہتا ہے صرف کرتے ہیں جو چاہتے ہیں کھاتے پکاتے ہیں۔ پھر تو وہی ناپی بوٹی ناپا شوربہ۔ نوکروں کو یہ خوف تھا کہ بڑی صاحبزادی لاکھ ہوشیار ہیں پھر بھی سامنے کا بچہ ہیں۔ کبھی گھر کیا نہیں، ہم کو اچھی طرح چرانے کا موقع ملتا ہے۔ نئی بیگم صاحبہ گھر کی مالک بن کے بیٹھیں گی ایک ایک چیز کی تول ناپ ہوگی، ذرا ذرا سی بات پر روک ٹوک ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ بڑی مشکل کا سامنا ہے۔

عورتیں ذرا سی بات سے بڑے بڑے نتیجوں تک بہت جلد پہنچ جاتی ہیں اور جن نتیجوں تک پہنچتی ہیں اُن کو یقینی مان لیتی ہیں۔ اور اُسی کے موافق خیالات کے سلسلے بدل جاتے ہیں، ان سب کے خیال میں گویا نواب صاحب کا نکاح ہو ہی گیا۔ بیگم صاحبہ گھر میں داخل ہوگئیں اور اس وقت گویا خاص کمرے میں موجود ہیں۔ جہاں ہماری بیوی خدا جنت نصیب کرے رہا کرتی تھیں۔ مرنے والی کیا نیک بیوی تھی۔ کبھی ہم کو آدھی بات نہیں کہی، ایسی بیوی تو ہونا مشکل ہے کیوں بُوا حسینی بولو۔ بُوا حسینی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے، ایسی مالک چراغ لیکر ڈھونڈیں گے تو نہ ملے گی۔ اور تو اور دیکھیے ان صاحبزادیوں کا کیا بُرا حال ہوگا۔ کہیں پھول بھی تو نہیں کھلتے۔ اے ہے اپنے اپنے گھروں کی ہو جاتیں تو اچھا ہوتا۔ میرا کہنا مانیں تو ابھی نواب صاحب ایسا ارادہ نہ کریں لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں پھر اختیار ہے۔

محل میں تو یہ کھچڑیاں پک رہی ہیں اور نواب صاحب خط کو پڑھ رہے ہیں۔ اب ہم ناظرین کو وہ خط سناتے ہیں جس نے اس گھر میں یہ طوفان برپا کر دیا ہے، القاب آداب کچھ نہیں اس طرح شروع ہوتا ہے۔

خورشید مرزا! اُمید تو ہے کہ تم مجھے بھولے نہ ہوگے اور شاید کچھ میرا حال بھی

تم کو معلوم ہو۔ میں پچیس برس کے بعد دو ہفتے ہوئے لکھنؤ میں آئی ہوں۔ بظاہر علاج کو آئی ہوں۔ علاج کیسا مرنے آئی ہوں۔ ایک بن باپ کی بچی ہے اور میں ہوں لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے عزیز سمجھو جو سمجھو تمہیں ہو۔ تمہارا حال بھی سن چکی ہوں، تین برس ہوئے تمہاری بیوی دو لڑکیاں چھوڑ کے مر گئیں۔

میرا اچھا ہونا مشکل ہے دیکھئے میری بچی کا کیا حال ہوتا ہے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتی ہوں مگر کوئی اپنا نہیں دکھائی دیتا۔ یوں تو خدا رکھے لکھنؤ میں بہت سے عزیز ہیں مگر جیسے ہیں خوب ہیں، تم خوب جانتے ہو، میں نے کسی کو اپنے آنے کی خبر نہیں کی اور نہ تم خبر کرنا۔ مجھے تم سے چند خاص باتیں کہنا ہیں۔ کسی وقت آج ہی کل میں چلے آؤ۔ یہاں نئے گاؤں میں میاں فیضو کا مکان مشہور ہے۔ یہیں اُتری ہوں۔

"راقمہ خورشید بیگم"

یہ خورشید بیگم کون ہیں؟ خورشید بیگم کے والد سلطان مرزا کی والدہ کلثوم بیگم خالہ زاد بھائی بہن تھے، رشتہ اگر قریب کا نہ تھا تو کچھ بہت دور کا بھی نہ تھا۔ حصہ بخرا آمدرفت، شادی بیاہ کی شرکت، میل جول مہمانداری قریب کے عزیزوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ خورشید بیگم یہ نام تو خورشید مرزا کو مشکل سے یاد آیا اور اگر اپنا ہی سا نام نہ ہوتا تو شاید یاد بھی نہ آتا۔ ان کو تو چھٹن یاد تھا اور خورشید بیگم نے بھی بہ مشکل خورشید مرزا یاد رکھا۔ بچپنے میں سب چھٹن چھٹن کہتے تھے۔ کیونکہ یہ اپنے ماں باپ کی اولاد میں جن میں اب کوئی باقی نہ تھا سب سے چھوٹے تھے۔ اس مناسبت سے اور اتفاقاً بھی لڑکپن میں یہی نام پڑ گیا تھا، بے تکلف دوست اسی نام سے اب تک پکارتے تھے، قرابت کے سوا ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ دونوں ساتھ کھیلے ہوئے بھی تھے۔ کسی زمانہ میں شادی بھی انھیں سے ٹھہری تھی اور بعض ناشدنی اتفاقات مانع ہوئے، خورشید بیگم کے والد سلطان مرزا بہت بڑی جائداد کئی لاکھ کے پرامیسری نوٹ

چھوڑ کے دفعتہً انتقال کر گئے۔ کلثوم بیگم خورشید مرزا کی والدہ اور خورشید بیگم کی والدہ میں دلی رنجش تھی۔ ایک دوسرے سے دل صاف نہ تھا صرف ظاہری میل جول تھا۔ محض سلطان مرزا مرحوم کی زورا زوری اُن کی زندگی میں ماہ لقا بیگم والدہ خورشید بیگم کا بس نہیں چلتا تھا اگر وہ زندہ رہتے تو یہ شادی ضرور ہو جاتی۔ نکاح ہونے کو ہی تھا کہ دفعتہً سلطان مرزا مر گئے۔ اب کوئی صورت اس عقد کی باقی نہ رہی۔ کلثوم بیگم نے بہت منت کی کیونکہ اُن کو معلوم تھا بچپن چھٹن میں کچھ ایسی محبت ہے کہ اگر یہ نسبت چھوٹ گئی تو چھٹن (خورشید مرزا) کی جان پر بن جائے تو کوئی عجب نہیں ان کے بھی باپ مر چکے تھے۔ کلثوم بیگم کا بھی یہی اکلوتا بیٹا تھا، مگر ماہ لقا کچھ ایسی کنڑ دل کی عورت تھی کہ اُس نے کسی طرح منظور نہیں کیا۔ مگر جیسا کیا ویسا پایا۔ لڑکی کی شادی کی مگر کس سے۔ کلکتہ میں کوئی دولہ تھے اُن کا ایک لڑکا تھا بیاہتا بیوی کے پیٹ سے نہ تھا۔ علی جان اس کا نام تھا۔ صورت بھی اچھی نہ تھی، سانولی رنگت، میانہ قد ہاں جامہ زیبی اور نمک ضرور رکھتا۔ پھر آخر شریف کا لڑکا تھا اتنا بھی نہ ہوتا۔ مزاج میں ذرا عیش پسندی اور بہت فضول خرچی تھی۔ بہت بڑی جائداد کا مالک ہوتا۔ مگر دولہ کے مرنے کے بعد علی جان کی ماں کا نکاح ثابت نہ ہوا۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے دولہ کے وارثوں کو ڈگری دیدی۔ مگر خورشید بیگم کی تقدیر بلکہ اختری کی تقدیر سے مقدمہ پریوی کونسل سے سرسبز ہوا، اِدھر ایک لاٹری پانچ لاکھ کی علی جان کے نام نکلی ۵ لاکھ نقد۔ یہ دونوں تار ابھی آنے والے ہی تھے کہ علی جان کو دفعتہً سخت ہیضہ ہوا اور چند گھنٹہ میں خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب یہ لوگ کلکتہ میں تھے۔ یہاں خورشید مرزا کی بیوی نے انتقال کیا۔ اگر اس زمانہ میں یہ دونوں عاشق معشوقہ ایک شہر میں ہوتے تو شاید زندگیوں کی حالت بدل جاتی۔

خورشید مرزا کو اس نسبت کے چھوٹنے کا ایسا صدمہ تھا کہ شاید شادی نہ ہوتی

مگر کلثوم بیگم خورشید مرزا کی ماں جن کو خود اس نسبت کے چھوٹ جانے سے بڑا رنج ہوا تھا۔ لیکن اپنے نزدیک بڑی دانائی کی جھٹ پٹ ایک شریف خاندان میں بیٹے کی نسبت ٹھہرا کے عقد کر دیا۔ فرماں بردار بیٹے پر کچھ دباؤ ڈالا کہ انکار نہ ہو سکا۔ شادی کرتے ہی بنی۔ خدا نے تین ہی برس کے عرصہ میں دو بیٹیاں بھی دیدیں۔ خیال تھا کہ بال بچوں میں خانہ داری کے دھندوں میں پڑ کے خورشید مرزا کا دل بہل جائے گا مگر یہ خیال غلط نکلا کہ بچپن کی منگیتر کے چھوٹ جانے سے اور دوسری جگہ وہ منگیتر جو ساتھ کھیلی ہوئی بھی تھی۔ اس کی شادی ہو جانے سے ایسا زخم کاری لگا کہ نہ توں بھر نہ تھما اور رفتہ رفتہ اُس کا زخم ناسور ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ باوصف مقدور نیک بیوی کو پیاری پیاری بچیوں سے بھی کچھ تلافیٔ مافات نہ ہوئی۔ اب پچیس برس کے بعد وہ ناسور پھر چھیڑا گیا۔

---

# باب ۲

## دیکھئے آج کیسی بنتی ہے بعد مدت کے سامنا ہوگا۔

خورشید مرزا کے دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اُس کو ہم نہ کسی زبان سے بیان کر سکتے نہ قلم سے لکھ سکتے ہیں، دل بار بار کہتا تھا پچیس برس کے بعد کچن نے بلا بھیجا ہے۔ وہ پہلے پہل دل کا آنا وہ اُسوقت اور اُس سن کی دلی اُمنگیں، وہ آپس کے کھیل کود، وہ بات بات پر کچن کا بگڑ جانا اور پھر من جانا، وہ پیاری پیاری صورت، وہ سن و سال، وہ نظریں بچا کے ایک دوسرے کو دیکھنا، وہ اُمیدیں، وہ کامیابی کی پوری اُمید، وہ دفعتہً ناکامی وہ رقیب کا دفعتہً پیدا ہو جانا۔ وہ دشمن کا کامیاب ہو جانا وہ اپنی بے بسی وہ دلہن جو اپنی ہونے والی تھی دوسرے کی ہو جانا اُس کا خوشی خوشی لے کے چل دینا اور اپنا دیکھتے رہ جانا، یہ ایسے چرکے نہ تھے جو خون کے آنسو نہ رُلواتے۔ کیسے شعلے دل سے نکلے ہوں گے۔ مگر اب اُس کو پچیس سال ہو چکے تھے۔ ساڑھے نو بجے قبل نصف النہار یہ رقعہ ملا تھا۔ اب ساڑھے تین بجے بعد نصف النہار پورے چھ گھنٹے دیوان خانہ کی کلاک میں تین کے بعد آدھا بجا ہے۔ پورے چھ گھنٹے خورشید مرزا کے دماغ کے دفتر اُلٹ پلٹ ہو رہے تھے، عشق امید وصال اپنی ناکامی، رقیب کی کامیابی آہ! ناکامی اور کیسی ناکامی، کامیابی اور کیسی کامیابی زندگی بھر کے لئے یاس کا سامنا، یہ خیالات اب سے پچیس برس اُدھر کے تھے۔ اسوقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابھی کا واقعہ ہے۔ ابھی کل کا ذکر ہے علی جان بھاری ناچنے

کا جوڑا پہن کے کیسا اتراتا پھرتا تھا۔ اس سے بڑھ کے کیا بدنصیبی ہوگی، ہم نے خود آنکھوں سے دیکھا، اب کیا کہیں کن آنکھوں سے دیکھا۔ لہو کے سے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ برات کا دن کبھی نہ بھولے گا کم بخت (میرے جلانے کو) میرے گھر کے قریب سے برات لے کے گیا۔ (نہیں نہیں، علی جان مجھ کو کیا جانے یہ خبط ہے) محض اتفاق سو اتفاق پھر ادھر ہی برات گئی۔ جہیز میں کیا کچھ نہ تھا۔ دیگیں مٹکے اور تانبے کے برتن چینی کے برتن صندوق، پٹارے، لگن جمنی پلنگ دار ایش گیر، سبز گھوڑا، کیسا سجا سجایا۔ اسی گھوڑے پر سوار ہو کے علی جان شہر میں نکلا کرتا تھا۔ یہ کیا خیالات ہیں دیوانگی، گذری باتیں خواب کی باتیں، علی جان کو مرے ہوئے مدت ہو گئی۔ کچھن نے اپنی بیماری کا حال لکھا ہے کچھ مفصل نہیں لکھا، کہیں وہ خاندانی مرض نہ ہو، ایسے ہے خدا نہ کرے! خدا جانے اب کیسی صورت ہوگی۔ اپنی صورت تو ایسی بدلی کہ جوانی کی تصویر سے اب زمین آسمان کا فرق ہے۔ غم نے گھلا دیا۔ غم اور کیسا غم، خدا دشمن کو یہ غم نہ دے، کیا نامراد زندگی بسر کی۔

خورشید مرزا اسی طرح اپنے خیالات میں غرق ہیں کہ راستہ میں یہ بھی یاد نہیں کب گھر سے نکلتے تھے۔ اے لو، حسین علی پیچھے چلا آتا ہے۔ وہاں لے جانا مناسب نہیں۔ حسین علی گھر کا خفیہ پولیس ہے۔ میرا ارادہ تو عقد ثانی کا نہیں ہے مگر لڑکیوں کو گھر کی ماما اصیلوں تک کو عجیب طرح کی بدگمانی پیدا ہو گئی ہے ایک ایک بات باہر کے نوکروں سے پوچھی جاتی ہے۔ یہ کمبخت بھی روٹیوں کے لالچ سے ملے ہوئے ہیں ہر بات کی گھر میں خبر پہنچاتے ہیں۔ کئی نوکر چھڑا دیئے مگر جو آتا ہے ایسا ہی ہو جاتا ہے کوئی بس نہیں۔ آج صبح کو مہری کا آنا غضب ہوا۔ اور پھر میرا جانا اسی دن خدا جانے کیا خیال ہوگا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا حسین علی کو رخصت کر دیا۔

خورشید مرزا۔ حسین علی۔

حسین علی ۔ حضور ۔

خورشید مرزا ۔ درزی سے کپڑوں کا تقاضہ کرو نوروز قریب آگیا درزی نے ابھی تک گرمی کے کپڑے نہیں تیار کیے، میرے ساتھ جانا کچھ ضرور نہیں میں تھوڑی دیر میں رات سے پہلے آجاؤں گا ۔

حسین علی ۔ سمجھ تو گیا مگر مجال کیا تھی جو کچھ عذر کرتا، بہت خوب کہہ کے رخصت ہوگیا۔ اور درزی سے دو جوڑے تیار تھے لے کے گھر پہنچا ۔ کپڑے گھر میں پہنچے اور راستہ سے رخصتی کی ۔ خبر بھی اب تو گھر بھر کو یقین ہوگیا، انہیں ایسی جگہ گئے ہیں جس کی رازداری حد سے زیادہ ہے کسی دوست کے گھر پر جاتے تو نوکر کو راستہ سے کیوں پھیر دیتے ۔

جعفری ۔ " دیکھیے خدا کیا دکھاتا ہے، خدا غارت کرے جو باوا جان کو ہماری بربادی کی صلاح دے "

نادری ۔ " کے مزاج میں شوخی تھی بڑی بہن کو بکتے جھکتے دیکھ کے، تو کیا ہوگا دوسری اماں جان آجائیں گی "

جعفری " بہت خفا ہو کے ۔ تیرے منہ میں خاک، خدا مجھے اُس دن کو موت دے، تجھے تو کیا کوسوں "

نادری ۔ باجی تو پھر کیا کروگی، ابا جان کی خوشی ۔ بھئی یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ دل کو صدمہ نہ ہوگا مگر کیا مجال زبان سے کچھ کہوں یا چہرہ پر بل آئے ۔

جعفری ۔ ہاں تم تو یہ چاہتی ہی تھیں ۔ میں تو اِس گھر میں نہ رہوں گی ۔ کچھ کھا کے سو رہوں گی ۔

نادری ۔ ہا! باجی حرام موت! جو خدا دکھائے ہم کو، باوا جان پر حاکم ہیں ۔ یہ آپس کی تکرار نوکروں تک بھی پہنچ گئی تھی، اسی وقت سے دو فرقہ ہوگئے ۔

ایک نادری کے ساتھ ہو گیا دوسرا جعفری کا ہمخیال تھا۔

خورشید مرزا انھیں خیالات میں غرق ہیں چلے جاتے ہیں۔ راستہ میں اکثر احباب سے ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت ہوئی مزاج پرسی ہوئی مگر یہ سب ناخواستہ و بیساختہ اگر کسی نے اپنی رَو میں خیال نہ کیا ہو تو اور بات ہے مگر جس نے غور سے دیکھا ہوگا صاف سمجھ گیا ہوگا کہ یہ خورشید مرزا وہ نہیں ہیں جن سے اور بھی اکثر ملاقات ہوا کی ہے۔ مگر کسی کو کیا غرض جو کچھ حال پوچھے اور پوچھے بھی تو کہتا کون۔

شدہ شدہ نئے گاؤں میں پہنچ گئے۔ فیفو کی حویلی تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گئی۔ گھر میں خبر ہوئی۔ اندر بلائے گئے۔ بلانے والی کا بھی کلیجہ اچھل رہا ہے۔ اور جو بلایا گیا ہے اُس کا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ اب سامنا ہوتا ہے، خورشید مرزا ایک مختصر مگر صاف ستھرے مکان کی انگنائی میں سے ہو کے گذرے، وہی مہری جو صبح کو رقعہ لے کے گئی تھی آگے آگے اب ایک زینہ پر سے کوئی سوا ستھرہ سیڑھیوں پہ گذر کے کوٹھے پر ایک ہوادار کمرے میں پہنچے۔ یہاں سامنا ہوا۔ خورشید بیگم ایک نواڑی پلنگ پر لیٹی تھیں قدم کی آہٹ کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھیں، خورشید مرزا سامنے کھڑے ہیں، آمنا سامنا ہوا چار آنکھیں ہوئیں۔ دونوں کا یہ حال ہوا جیسے مرجھائے ہوئے پھولوں میں کچھ مٹا ہوا رنگ کچھ شمہ خوشبو باقی رہتی ہے۔ نہ وہ صورت شکل ہے نہ وہ چلت پھرت نہ آنکھوں کی جلد جلد حرکت نہ چہرے کی رنگتوں کا خوشنمائی کے ساتھ بدلنا نہ وہ تیز تیز شوق آمیز نگاہیں غرض وہ منہدم عمارتیں ہیں۔ جن کے ٹوٹے پھوٹے آثار اب تک باقی ہوں۔ اگلی چہل پہل خواب و خیال ہو گئی پہلے دیر تک ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے رہے نگاہوں میں شائبہ اشتیاق اب بھی باقی ہے۔ خورشید بیگم کی نگاہیں اس طرح پڑیں جیسے کوئی کسی کو دمِ واپسی حسرت بھری نظر سے دیکھے، خورشید مرزا کے دل پر نئی چوٹ لگی۔ اگلی بات چیت کا انداز بمشکل یاد آیا۔ بڑے بڑے ناموں کے زبانوں پر لانے کی تکلیف دونوں

میں سے ایک نے گوارا نہ کی نہ اُنھوں نے خورشید مرزا کہا نہ اُنھوں نے خورشید بیگم، وہ دہی چھٹن رہے یہ کچن رہیں مگر یہ نام اب اس طرح منہ سے نکلتے ہیں جس طرح کند ذہن لڑکے کے منہ سے بھولے ہوئے آموختہ کی لفظیں تھم تھم کے اٹک اٹک کے مگر چند ہی مرتبہ اٹکنے کے بعد کسی قدر روانی آگئی مگر ضعف اور حجاب نے زیادہ روانی نہیں پیدا ہونے دی، کسی نہ کسی طرح مہر سکوت ٹوٹی، پہلے خورشید بیگم ہی نے سبقت کی۔

خورشید بیگم۔ آخر تمہاری بیوی دو لڑکیاں چھوڑ کے مر گئیں۔ اب تو وہ بھی جوان ہوں گی۔ خیر خدا لڑکیوں کو جیتا رکھے، کسی نہ کسی طرح تمہارا دل بہل ہی جاتا ہوگا۔ ہاں تو یہ کہو کہ بڑی کو زیادہ چاہتے ہو کہ چھوٹی کو۔

خورشید مرزا۔ اِن سوالوں کے جواب کے لئے آمادہ تھے نہ اور اُن کو اس استفسار سے دلچسپی تھی۔ کوئی خصوصیت نہیں ہے، میرے نزدیک دونوں ایک ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نہ گھر میں زیادہ ٹھہرتا ہوں نہ کچھ زیادہ دخل دیتا ہوں خرچ دے دیا۔ اناج منگوا دیا۔ مامائیں اصیلین موجود ہیں جو چاہیں کھائیں جو جی میں آئے پکوائیں۔ گہنے کپڑے سب اپنے اپنے موقع سے اور ضرورت کے موافق موجود ہیں۔ میں بھی دونوں وقت کھانا کھا لیتا ہوں۔ لڑکیاں اپنی راہ چلتی ہیں میں اپنی راہ پر جاتا ہوں۔

خورشید بیگم۔ مہری سے معلوم ہوا کہ سب ایک ساتھ دستر خوان پر بیٹھے لڑکیوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے ہو۔ یہ اچھا کرتے ہو بیچاری بے ماں کی بچیاں کچھ تو ڈھارس ہو۔

خورشید مرزا۔ آج اتفاق سے گھر ہی میں کھانا کھایا تھا۔ نہیں تو میں اکثر اکیلا کھاتا ہوں۔ کبھی کبھی ساتھ کھا لیتا ہوں۔

خورشید بیگم۔ اچھا تو کسی وقت اُن کو بلا کے پاس بٹھاتے ہو، گلے لگاتے

ہو، پیار کرتے ہو۔

خورشید مرزا۔ (کسی قدر روکھے ہو کے)، نہیں! یہ مجھ کو کچھ نہیں آتا۔ بس یہ خیال کر لیا کہ ننگی بھوکی نہ رہیں، اور زیادہ منہ نہیں لگاتا۔

خورشید بیگم۔ تو یہ اکل کھرا پن تو کچھ اچھا نہیں ہے۔ اگر تم نے منہ نہ لگایا تو کون منہ لگائے گا۔ خورشید بیگم نے ذرا تیوری بدل کے، ناظرین کو آگے چل کے معلوم ہوگا کہ خورشید بیگم لڑکیوں کے ساتھ طرزِ سلوک کو زیادہ کیوں دریافت کرتی تھیں۔

خورشید مرزا۔ ہاں ہاں خفا نہ ہو یہ بات نہیں ہے کہ مجھ کو لڑکیوں کا خیال نہ ہو البتہ کسی قدر میں بھی آزاد ہوں اور وہ بھی، میں اُن کے کھیل کود میں دخل نہیں دیتا نہ اپنے کاموں میں اُن کو دخل دینے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بجائے خود خوش خرم ہیں۔ میں نے اوّل ہی سے ایسا اخلاص نہیں رکھا کہ اگر کبھی اس میں کمی ہو تو رنجش پیدا ہو۔

خورشید بیگم۔ کہو تمہاری خاطر سے کہدوں کہ چلو اچھا ہے، میرے نزدیک نہ تو زیادہ مہربانی چاہیئے نہ ایسی بے پروائی۔

خورشید مرزا۔ ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ کہا تو کہ وہ بھی خوش ہیں، میں بھی خوش ہوں۔

خورشید بیگم۔ تم کہتے ہو کہ میں خوش ہوں مگر مجھ کو نہ تمہارے چہرے سے خوشی معلوم ہوتی ہے نہ بات چیت سے، کچھ اُکھڑی اُکھڑی اکھل کھری سی طبیعت ہو گئی ہے (پھر پچھلی سوانح عمری خصوصاً لڑکپن کی خصوصیتوں کا خیال کر کے ایک آہ سرد بھر کے) زندگیاں خراب کیں میں تم سے خفا نہیں ہوں اپنا سا حال جانتی ہوں جیسی شادی ہوئی ویسی نہ ہوئی۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ میری شادی کیوں ہوئی تھی کارندوں نے منہ بھرائی پلکے پھنسا دیا تھا۔ میرا منہ بند تھا کر ہی کیا۔ اماں جان نے (اُن کی روح

نہ شرمندہ ہوں اپنی ضد میں مٹایا۔ سچ یہ ہے کہ وہ بھی دھوکا کھا گئیں۔ ایسے ہی ٹھاٹھ دکھائے گئے تھے، خیر جو کیا اچھا کیا کوئی یہ نہیں چاہے گا کہ ہماری اولاد تباہ ہو، اپنے نزدیک اماں جان نے بڑی دانائی کی تھی مگر چوک گئیں، چار پاؤں کا گھوڑا چوک جاتا آدمی کے تو دو ہی پاؤں ہوتے ہیں۔

خورشید مرزا۔ اب اِن اگلے قصّوں کو جانے دو۔ اِن تذکروں کے چھیڑنے سے سوائے رنج کے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

خورشید بیگم۔ انسان ہے کبھی خیال آ ہی جاتا ہے۔ مگر میری زندگی کا آسرا تو میری بچّی ہے۔ اور تمھارا بھی سوا اِن دو لڑکیوں کے خدا اِن کو رکھے رہتی دنیا تک اور کون ہے۔ بس اب انھیں سے دل بہلاؤ۔ ہم کو تو اس کی بھی اُمید نہیں جے دن کی ہوا کھاتے ہیں کھاتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر بات کا رُخ بدل کے ہاں میں نے سُنا تھا تم دوسرا نکاح کرنے والے ہو۔ چلو اچھا تو ہے گھر بس جائے گا برائی کیا ہے۔

یہ فقرہ طعن کے لہجہ میں کہا تھا، یہ سب باتیں خورشید بیگم جس مصلحت سے کہہ رہی تھیں وہ ناظرین کو ابھی معلوم ہو جائیں گی۔ گویا خورشید مرزا کے دل کا بھید لینا چاہتی تھیں۔

خورشید مرزا۔ عورتوں کو سوا شادی بیاہ کے تذکروں کے اور کچھ نہیں آتا۔ تم یہ نہیں خیال کرتیں کہ ایک مرتبہ شادی ہوئی تو کیا دل خوش ہوا، اور اب پھر نکاح ہوگا تو کیا ہوگا۔ جب کسی کام کی ابتدا خراب ہو جاتی ہے۔ پھر اُس کی انتہا کا درست ہونا دشوار ہے۔ اب شادی کر کے کیا کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ میں لڑکیوں سے ذرا الگ رہتا ہوں مگر اُن کی تباہی بھی منظور نہیں ہے۔

خورشید بیگم۔ (چہرا بشاش ہوگیا) ہاں میں تو کہتی تھی تم اور اپنی اولاد کا دل دُکھاؤ۔ تم کو غیروں کی ناخوشی منظور نہیں ہوتی تو بھلا اپنی اولاد کی رنجش کیوں کر

کیوں کر دیکھی جائے گی - اب جو کچھ دنیا میں زندگی کا مزا ہے اِنھیں اولادوں سے ہے - خدا رکھے تمہاری دو ہیں - میری تو ایک ہی اندھے کی لاٹھی ہے مگر الٰہی اختری رہتی دنیا تک رہے - سن تو کچھ بھی نہیں ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں مگر اتنے سے سن میں جو میری دیکھ بھال کی ہے اور کیا کرتی ہے - حکیم، نسخہ، دوا، ٹھنڈائی پرہیزی کھانا سب اُسی کے ہاتھ ہے، میں تو کہتی ہوں اگر میری بچی نہ ہوتی تو میں کب کی مرچکی ہوتی اُس نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی - لیکن مرض ہی لاعلاج ہو تو کوئی کیا کرے - مجھے خوب معلوم ہے کہ میری زندگی کے اب بہت ہی کم دن باقی ہیں - جے دن اور دُنیا کی ہوا کھانی ہے کھانی ہوں -

خورشید مرزا - خدا تمہیں اپنی لڑکی کے سر پر سلامت رکھے - ابھی تو ایسا حال نہیں ہے کہ مایوسی ہو جائے - یہ باتیں محض مریض کی تشفی کے لیے کہنا پڑتی ہیں مگر حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے - خورشید مرزا ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی دل ہی دل میں سمجھ رہے تھے جو خورشید بیگم زبان سے کہہ رہی تھیں، دق دوسرے درجہ سے بھی ترقی کرچکی تھی - چیت کا مہینہ تھا بس اساڑھ ساون تک حد ہے - دو ہی تین مہینہ اس مریضہ کی زندگی کے اور باقی ہیں - اپنی رائے کی تصدیق خورشید مرزا کی زبان سے تو سُنتیں - کون کس کو کہتا ہے کہ ہاں سچ کہتے ہو تم چند روزہ مہمان ہو مگر نگاہوں سے گفتگو کے لہجے سے پایا جاتا تھا کہ خورشید مرزا کو بھی میری زندگی سے یاس ہے -

خورشید بیگم - اچھا مرنا جینا یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے یہ کون جانے گا اور سب سے زیادہ تم کب یہ جاہو گے کہ میں کل کی مرتی آج ہی مرجاؤں، مگر پھر انسان کو عقل سے کام لینا چاہیے - میں نے جس مطلب کے واسطے تم کو بلایا ہے اب وہ کہنا چاہتی ہوں ذرا خوب کان دھر کے سنو اور جو کچھ میں کہوں اُس کو سُن لو -

خورشید مرزا ۔ اس لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے میں نے کب تمہاری بات نہیں سُنی، کب تمہارے حکم کی تعمیل نہیں کی کس دن تمہاری ضدیں نہیں اُٹھائیں ذرا یاد کرو ۔

خورشید بیگم ۔ (چہرہ پر ذرا سا خون دوڑ آیا مگر صرف ایک لمحہ کے لئے پھر ایک آہ سرد بھر کے) ہاں ہاں یہ سب بجا درست ہے تم نے میری ناز برداریاں کی ہیں مگر اب جو کچھ میں کہوں گی وہ میری آخری ضد ہے ۔ بلکہ وصیت کہو تو ٹھیک ہے ۔

خورشید مرزا ۔ مجھ کو رُلوانا ہی منظور ہے تو خیر ورنہ ایسی باتیں مجھ سے نہ کہو میں تمہاری مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت فرمائش کے پورا کرنے کے لئے اب بھی حاضر ہوں مگر تا مقدور ۔۔

خورشید بیگم ۔ سُنو! بات یہ ہے کہ میری شادی جس طرح ہوئی وہ تم خوب جانتے ہو ۔ نہ الفت نہ محبت محض روپیہ کا لالچ ۔ ایک شخص نے چاہا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ آجائے ۔ سونے کی چڑیا جال میں پھنس گئی ۔ پنجرے میں ڈال دی گئی ۔ پنجرا لوہے کا ہو یا سونے کا ۔ مطلب قید سے ہے ۔ ایسی شادی سے کیا خوشی ہو سکتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اب پنجرے کی کھڑکی کھل گئی ۔ مگر اب طاقت پرواز کہاں ۔ ایسا قید سے چھوٹنا اسیری سے بدتر ہے ۔ خیر ۔ آدمی پر جیسی بنتی ہے ویسی اٹھا لیتا ہے اگرچہ کبھی کبھی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور میرے لئے بھی سامان ہوا، خیر شکر ہے مگر اپنی اولاد کے لئے انسان ہر طرح کی بہتری چاہتا ہے ۔ آختری ماں باپ دونوں کی جائداد ملا کے کچھ کم ایک کروڑ کی مالک ہے ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کا بھی وہی دہاڑا نہ ہو جو میرا ہوا ہے تم شکاری لوگ اگر اس کا پتہ پا جائیں گے زندگی دشوار کر دیں گے ۔ بیٹھنا مشکل ہو گا ۔ خدا جانے میری بچی کی آبرو پر بن جائے جان پر بن جائے، سیکڑوں جال پھندے تیار ہوں گے ہر طرح سے پھانسنے کی کوشش کی جائے گی میرا یہ حال

ہے۔ چند ہی روز کے بعد یہ بن ماں باپ کی بچی ہو گی، ایک موٹے کی چڑیا اور سیکڑوں چڑی مار۔ کسی نہ کسی جال میں پھنس جائے گی۔ پھر دشمنوں کے ذبح کرنے کی کوشش ہو گی۔ زندگی دوبھر ہو جائے گی، غرض ہر طرح جان بچنا مشکل ہے یہ ہونا ہے اور ضرور ہونا ہے۔ صرف ایک ہی اس معصوم بچی کی نجات کا سہارا نظر آتا ہے اور وہ تمہاری ذات پر منحصر ہے۔ یہ میں خوب جانتی ہوں کہ اگر تم حامی بھر لو گے تو میری بچی اس عذاب سے چھوٹ جائے گی۔ اس تہلکہ سے بچ جائے گی۔ لو اب اقرار کرو، میرے ہی سر کی قسم کھاؤ کہ جو میں کہوں گی وہی کرو گے۔

خورشید مرزا۔ آخر میں سنوں تو کیا چاہتی ہو۔ کس بات پر قسم کھاؤں۔

خورشید بیگم۔ چاہتی یہ ہوں کہ تم اس بچی کے سر پر ہاتھ رکھو اس کے ولی بنو مگر یہ حال کسی پر نہ کھلے۔ میں دو تین دن سے زیادہ لکھنؤ میں نہ ٹھہروں گی۔ اُس کے بعد ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پہاڑ پر چلی جاؤ۔ میں منصوری پہاڑ پر چلی جاؤں گی، جب تک میں زندہ ہوں بچی میرے دم قدم کے ساتھ ہے۔ جب میں مر جاؤں تو بچی کو اپنے گھر میں لیجانا جہاں وہ دو لڑکیاں ہیں تیسری یہ ہے۔ مگر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ یہ اتنی بڑی جائداد کی مالک ہے۔ اگر کوئی شریف بھلے مانس جس پر تم کو پورا بھروسہ ہو محض شرافت خاندانی کے لحاظ سے لڑکی مانگے خوب پکی پوڑھی کر کے چُپ چپاتے نکاح کر دینا۔ جب قانونی بالغ کا زمانہ آجائے تو جائداد اُس کے سُپرد کر دینا مگر زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑنا، جائداد والی عورتیں بڑی مشکلوں میں پڑ جاتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد بھی اگر شوہر ایماندار ہوا تو خیر ورنہ طرح طرح کی ایذائیں پہنچتی ہیں۔ بس یہی میری خواہش ہے اور آخری خواہش ہے۔ ہاں جب تک وہ وقت نہ آئے تمہاری لڑکیوں تک کو معلوم نہ ہو کہ اختری صاحب جائداد ہے۔ اس میں بڑی بڑی خرابیاں

جن کو میں خوب سمجھتی ہوں، گویا آنکھ سے دیکھ رہی ہوں۔ اور جب یہ بھید کھل بھی جائے اور شادی ہو جائے اُس وقت بھی تمہاری حمایت کی ضرورت رہے گی۔ تم خوب جانتے ہو۔

خورشید مرزا۔ اس رازداری میں یہ خرابی ہے کہ اس معصوم بچی کو لوگ، میری نوکریں چاکریں خود میری لڑکیاں ذلّت کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ اس سے لڑکی کو بھی تکلیفیں پہنچیں گی۔ مجھ سے بھی اُس کے رتبہ کے موافق کسی طرح اُس کی پرورش نہ ہو سکے گی۔

خورشید بیگم۔ ہاں میں خوب سمجھتی ہوں لوگ کہیں گے، نہیں معلوم کس کی لڑکی تمہاری روٹیوں پر پڑی، خیرات کے ٹکڑے توڑتی ہے۔ خیر باشد یوں ہی سہی، اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ تمہاری نیک نظر اور مہربانی کافی ہے دنیا جو چاہے خیال کرے بلا سے۔ تم اپنے اور اپنے گھر کے حاکم ہو۔ لوگ یہ سمجھ لیں گے کہ دُور دراز کی قرابت کے لحاظ سے یا محض خدا ترسی سے کسی غریب کی لڑکی لے کے پال لی ہے۔ پھر اُس میں کیا برائی ہے۔ ہاں ایک تکلیف اور ہو گی، دو تین دن کے لیے کلکتہ جانا ہو گا۔ ولایت کی درخواست کے لیے مگر یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے۔ کلکتہ میں اٹرنی بارسٹر مقدمہ کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لیں گے۔ صرف روپیہ کا خرچ ہے وہ خدا کے فضل سے موجود ہے۔ تم صرف درخواست پر دستخط کر کے چلے آنا۔ وہاں سب کام حسب دلخواہ ہو جائے گا۔ میرا وصیت نامہ مکمل ہے اے لو، بکس منگایا گیا وصیت نامہ رجسٹری شدہ، خورشید مرزا کے نام کا، مع فہرست جائداد ایک پوری مسلسل بکس سے نکلی اور خورشید مرزا کی سپردگی میں پہنچ گئی۔ قول قسم سر کی قسم۔ عذر معذرت مشکلات کُل مرحلے طے ہو گئے۔ اب ایک نظر اُس بچی کو بھی دیکھ لو جس کے تم ولی بنو گے اور جو آج ہی سے تمہاری لے پالک سمجھی جائے گی۔

کریمن نانا کو آواز دی گئی۔ وہ حاضر ہوئی، چھوٹی بیگم کو بلا لاؤ۔ چھوٹی بیگم کوئی چودہ پندرہ برس کا سن، بھولی بھالی صورت، نہ تمکنت نہ غرور۔ سادہ سادہ لباس ہلکا ہلکا زیور، گوری رنگت جیسی گلاب کی پتی۔ بوٹا سا قد۔ شریفانہ بناؤ۔ سیدھی مانگ۔ صورت سے پکا پن معلوم نہیں ہوتا مگر امیرانہ پن تمیزداری ظاہر ہے۔ نہایت ادب سے سامنے آ کھڑی ہوئی، مگر چہرہ اُداس اُداس۔ کیوں نہ ہو ماں کا حال پیش نظر، ایسی نادان نہیں۔

خورشید بیگم۔ بیٹا یہی تمہارے ماموں جان ہیں جن کا اکثر میں تذکرہ کیا کرتی تھی۔

لڑکی نے نہایت ادب سے جُھک کے سلام کیا۔ خورشید مرزا نے گلے سے لگایا۔ چُپکے سے اُس کرسی پر جو اماں جان اور ماموں جان کے درمیان میں پہلے سے بچھی ہوئی تھی ماں کا اشارہ پا کے بیٹھ گئی۔ صانع حقیقی نے جہاں کہیں صورت اور سیرت کو کسی آدمی زاد میں خواہ مرد ہو خواہ عورت ایک جگہ جمع کر کے قدرت نمائی کی ہے۔ وہ فطرت کے بہترین نظاروں سے ہے، یہ لڑکی بہمہ صفت موصوف تھی۔ پیاری پیاری صورت کے ساتھ نیک دلی، نیک نیتی، پاکیزہ خیالات، تمیزداری سلیقہ شعاری، رحمدلی، ترس خدا، معصوم صفتیں، حجاب عورت کا قدرتی جوہر ہے مگر شرط یہ ہے کہ جھینپ کے ساتھ نہ ہو، جھینپنے میں دل کی چوری پکڑ لی جاتی ہے حد سے زیادہ شرم، بہکی ہوئی نگاہیں پہ کچھ اچھے خیالات کے آثار نہیں ہیں۔ بن بیاہی نوجوان عورت میں اکثر بد صحبت سے لذت عشق کی ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بلا چھوٹے سے سن میں خیالات کو ناپاک کر دیتی تھی۔ جہاں یہ داغ لگا، پھر زندگی بھر نہیں چھوٹتا۔ ایسی نگاہیں اُن نظاروں کو ڈھونڈھتی رہتی ہیں جس کی طرف دل کی شوریدگی جذب کرتی ہے۔ پھر یہ نوبت پہنچتی ہے کہ کسی نوجوان کو دیکھا نگاہ بازی

کی مشق ہونے لگی، کسی کو جھانک کے دیکھ لیا کسی کو تاک کے دیکھ لیا۔ یعنی آنکھ لڑائی۔ کسی کو صورت دکھا کے پھر شرما کے منہ چھپا لینا۔ کسی کی طرف بے حجابانہ اشارہ کر دیا۔ کسی کو انگوٹھا دکھایا، کسی کو منہ چڑھایا۔ مشقِ ستم کا اناڑی بھی تاڑنے والی نظروں سے نہیں بچتا۔ خورشید مرزا نے دنیا دیکھی تھی بچپنے ہی سے عشق کی چوٹ کھائی تھی۔ مایوسانہ زندگی گھبرا گھبرا کے دلچسپی کے سامان پیدا کرتی تھی۔ سینہ کی آگ بجھانے کے لیے، عشق کا داغ مٹانے کے لئے علاج بالمثل کے فائدہ سے ایک زخم کے اچھا کرنے کے لئے دوسرے زخموں کی اور ایک داغ مٹانے کے لئے دوسرے داغوں کی ضرورت پڑتی رہی تھی۔ خورشید مرزا نے دلچسپیوں کا سامان تلاش کرنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اگرچہ کوئی تدبیر بن نہ پڑی کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ مگر اچھے خاصے تجربہ کار بن گئے تھے۔ لکھنؤ کے امیرزادوں کی صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک نگاہ سے عورت کی پوری زندگی کا گذشتہ اور آئندہ اُن کے سامنے آجاتا تھا، مگر اس معصوم صفت امیرزادی کو دیکھ کے یہ بہت ہی خوش ہوئے۔ ایک ہی نظر میں ولایت بھی منظور کر لی اور حمایت بھی، لے پالک بنا لیا۔ اس قدر جلد ایک خاص ارادے کے پیدا ہونے اور فوراً مضبوط ہو جانے پر شاید کوئی اعتراض کرے تو اس کو اس واقعہ کے سامان اور اسباب پر ایک نظر ڈالنا کافی نہ ہوگا۔ اوّلاً خورشید بیگم سے دلی تعلق اگرچہ اس معاملہ میں سخت ناکامی ہوئی بھی بڑا چرکا کھایا تھا۔ جس نے اُن کی تمام زندگی کو تباہ کیا۔ لیکن اس میں خورشید بیگم کا کوئی قصور نہ تھا۔ خورشید بیگم کی حالت واجب الرحم تھی، ضدی ماں نے جہاں جھونک دیا تھا وہ جگہ کسی طرح خورشید بیگم کی زندگی کو دلچسپ بنانے کے لئے کافی نہ تھی اور سب سے زیادہ ملک کے دستور کے موافق شکایت کی مجال نہ تھی۔ خورشید بیگم کو وہ

تعلق بھلا دینا پڑا جو بھولنے والا نہ تھا۔ شادی ہونے کے بعد اگر کبھی خورشید مرزا کا نام زبان پر آتا سو عیب لگ جاتے۔ ناکردہ گناہ گار ہو جاتی۔ چرچے ہونے لگتے "اوہو بی! ہم نہ کہتے تھے خورشید مرزا سے بن بیاہے پن میں آشنائی تھی"

ایک شریف عورت کے لیے اس سے بڑھ کے کیا کم بختی ہوگی کہ بن بیاہے پن کی پاک زندگی پر ناجائز تعلق کا جھوٹا الزام لگا دیا جائے، مگر دُنیا وہ نالائق ہے کہ ایک بیہودہ بات کا منہ سے بک دینا آسان سمجھا جاتا ہے اور اُس کے انجام کی مطلق پروا نہیں کی جاتی کہ اس کا دوسرے پر کیا اثر پڑے گا مگر خورشید بیگم اپنی احتیاط کی زندگی پر فخر کرتی تھیں کہ اُن پر کسی کو الزام لگانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کلکتہ کی زندگی میں اُنھوں نے اپنے لکھنؤ کے تعلقات کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا جو کسی کو کچھ کہنے کا موقع ملتا مگر یہ کہو کہ اُن کو خورشید مرزا کا خیال نہ رہا ہو یہ ناممکن تھا۔ اس بچپنے کی محبت کو وہ دل میں چھپائے رہیں۔ دل میں آگ کو اس طرح دبا کے رکھا کہ دھواں تک نہ نکلنے دیا۔ خورشید مرزا کی ایک ایک بات انکو یاد تھی اُن کی صورت کی پوری تصویر اُن کے دِل میں تھی، اُن کی ایک ایک بات یاد تھی، اور یہی حال خورشید مرزا کا تھا۔ یہ پاک محبت ایسی مستقل اور دیرپا تھی کہ باوصف دوری دونوں قریب تھے۔ ایک کو دوسرے پر بھروسہ تھا یہی وجہ تھی کہ خورشید بیگم جب اپنی زندگی سے نااُمید ہوئی اُنھوں نے اپنے کلیجہ کا ٹکڑا خورشید مرزا کی سپردگی میں دیا اور انھوں نے قبول کیا اور اس کو کلیجہ سے لگا لیا۔ اب خورشید بیگم کو اپنی لڑکی کے لیے جو کچھ کرنا تھا کر چکیں اور کیا کرتیں، اب خورشید مرزا کا کام تھا کہ سپردگی کا پورا حق ادا کریں اور اختری کا کام تھا کہ وہ اس دُور دراز کی عزیز داری کو اور اس جدید رشتہ باپ بیٹوں کا تعلق بنا لے، خورشید مرزا کے دل میں جگہ کرلے اور سچ مچ تیسری لڑکی بلکہ اُن سے

بھی کچھ بڑھ کے ہو جائے، ایسا ہی ہوا۔ خورشید مرزا کو واقعات پر نظر کر کے اس بن ماں باپ کی بچی کی خاطر داری اولاد سے زیادہ (گو کسی قدر ظاہریت کی آمیزش ہو) کرنا ہی چاہیئے تھی۔ اور اختری کو اپنے حسن سلوک سے اس کا معاوضہ کرنا تھا۔ اس وجہ سے پالنے والے اور لے پالک کے تعلقات حقیقی باپ بیٹیوں کے تعلقات سے بڑھ گئے، اور نہ بڑھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اختری کی معصومانہ دلربائی ایک خداداد جوہر جو بہت کم لڑکیوں کو نصیب ہوتا ہے، یعنی پاکیزہ خیالات اور دل کی نیکی اور اس سبب کے ساتھ حسن ظن وہ اپنی ماں کو اپنا سچا خیر خواہ جانتی تھی اور یہ سمجھ گئی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے میری بہتری کے لئے ہے۔

واقعی خورشید مرزا نے بڑی ذمہ داری کا کام، بڑا بھاری بوجھ اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ ظاہر میں تو بیٹھے بٹھائے کچھ کم ایک کروڑ کی جائداد ہاتھ آگئی تھی۔ اگر کوئی بے ایمان جبلیہ مکار ہوتا تو اس کو باپ کا سا مال سمجھ کے ہضم کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن خورشید مرزا ایک متقی خدا ترس پاک بے باک اگلے بانکپن کی صفت پر نازاں یتیم کے مال سے ڈرنے والے قدیم رئیس زادے تھے جو اگلی جاہ و ثروت نہ تھی مگر نیت اور ہمت ویسی ہی تھی۔ رسّی جل گئی تھی مگر بل نہیں جلا تھا۔ اُن کا جی چاہتا تھا کہ یتیم کا ایک حبہ بھی ضائع نہ ہو۔ ہاں وہ تنگی سے زندگی بسر نہ کرے مگر میں اس مال سے ایک پیسہ کا مستحق نہیں ہوں۔ اختری کی مشکلیں پیش پا افتادہ تھیں۔ جس گھر میں اسکو رہنا ہوگا وہ بالکل نیا گھر ہے۔ وہاں کسی کو اختری کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے لڑکیاں اِن تعلقات سے بے خبر ہیں۔ اختری سے بے التفاتی گو سب ظاہر کیوں نہ ہو۔ اس کو ایذا دینا ہے۔ جو خورشید مرزا کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا التفات سے سینکڑوں وہم اور رشک پیدا ہوں گے۔ لڑکیاں کیا کہیں گی، نوکریں چاکریں کیا کہیں گی۔ اگر اختری کی مقدرت کا راز کھول دیا جاتا تو کچھ مشکل نہ تھا۔ کسی امیر

کی لڑکی ہے جو خورشید مرزا کے سپرد کی گئی ہے۔ ہر شخص خاطر کرتا ہر شخص آنکھوں پر بٹھاتا، مگر خورشید بیگم کی وصیت تھی کہ اس کا اظہار نہ ہو، ناظرین کو یاد رہے کہ یہ ذمہ داری خورشید مرزا نے بڑی مشکل سے اپنے سر لی تھی، وہ اس کی دشواریوں کو سمجھتے تھے اور دشواریاں پیش آئیں۔

اختری کی صورت بھی اچھی تھی، دل بھی نیک تھا۔ اُس کو آئندہ خورشید مرزا کے گھر پر اور اُن کے قانونی ولی ہونے کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اُس نے بیجا شرم و جھینپ کو جو اکثر جہالت اور گناہ گاری کی آمیزش سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ پہلے ہی سے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ گو اختری خورشید مرزا کو ہمیشہ ماموں جان کہتی رہی لیکن اُس نے پہلے ہی دن سے خورشید مرزا کو اپنا باپ سمجھ لیا تھا۔ وہ اپنی چاہنے والی ماں اور خورشید مرزا کے پاک تعلقات سے بے خبر نہ تھی۔ اماں جان خورشید مرزا جن کو اب ماموں جان کہتی ہوں۔ اماں جان کے عزیز اور بچپنے کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں اور انہیں سے اماں جان کی شادی ٹھہری تھی۔

خورشید بیگم نے بھی اُسے پہلے ہی سے اس نازک رشتہ کی باریکیاں سمجھا رکھی تھیں۔ اختری دل میں کہتی تھی اگر اماں جان کی شادی اِن سے ہوتی تو میں انہیں کی بیٹی ہوتی۔ اچھا شادی نہیں ہوتی۔ میں علی جان کی بیٹی ہوں میرے باپ نے میری ماں کی کبھی پروا نہیں کی وہ دولت کو چاہتے تھے جب وہ اُن کو مل گئی تو وہ گلچھرے اُڑانے لگے۔ مجھ پر بھی کچھ ایسی توجہ نہیں کی۔ میں فقط اتنا جانتی ہوں کہ علی جان میرے باپ تھے مجھے میری ماں نے پالا پرورش کیا، پڑھایا، لکھایا غرض میں ہمیشہ سے بن باپ کی ہوں۔ باپ کی زندگی میں لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر یتیمی برستی ہے جس کا باپ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ گھر میں نہ آئے اور آئے بھی تو مجھے آنکھ اُٹھا کے نہ دیکھے نہ پاس بلائے نہ گلے لگائے بات تک نہ پوچھے، ارمان رہ گیا کہ عید بقرعید تو بلا کے گلے لگاتے کبھی تو

پیار کرتے۔ دُنیا کے باپوں کو دیکھا کیسا بیٹیوں کو چاہتے ہیں۔ یہ ہماری تقدیر میں نہ تھا۔ ہم نے تو اپنے باپ کو جب گھر میں دیکھا مُنہ تھوتھائے تیوری چڑھائے اماں جان سے لڑتے ہی دیکھا۔ یا یہ سُنا آج ہیرے کے جڑاؤ بازو بند دیدو کل موتیوں کا مالا دیدو۔ باہر سُنا ناچ ہو رہا ہے، رنڈیاں آئی ہیں، جھولے پڑے ہیں، پکوان تلے جا رہے ہیں۔ اماں جان یہ سب دیکھتی سہتی ہیں۔ منہ سے اُف نہیں کرتیں، دل ہی دل میں پھُکی جاتی ہیں۔ آپ ہی آپ سُلگ رہی ہیں جبھی تو تپ دِق ہو گئی، آخر جان کے لالے پڑ گئے۔ اماں جان کی ساری دولت اور روپیہ اِس طرح اُڑ رہی ہو اور اُن کی یہ گت ہو افسوس اماں جان کی بھی کیا بُری تقدیر تھی۔

اختری کے یہ خیالات تھے جب وہ خورشید مرزا سے پہلے پہل ملنے کو آئی تھی اگرچہ وہ خورشید مرزا کو نہ جانتی تھی مگر اتنا جانتی تھی کہ انھیں سے ملنے کے لئے اماں جان لکھنؤ میں آئی ہیں اور ان پر ایسا بھروسہ ہے کہ مجھے سُپرد کرتی ہیں۔

اختری اور خورشید مرزا کی پہلی گفتگو:۔ ماموں جان میرا آپ کے دیکھنے کو بہت جی چاہتا تھا۔

خورشید مرزا۔ (مُسکرا کے) بٹیا تم کیا جانو۔

اختری۔ واہ! اماں جان آپ کا اکثر ذکر کیا کرتی تھیں (پھر بات کا پہلو بدل کے) اماں جان بیماری کی حالت میں اکثر آپ ہی کو یاد کرتی رہتی تھیں بہت بیمار ہو گئی تھیں اَب تو جب سے لکھنؤ میں آئی ہیں بہت مزاج سنبھل گیا ہے۔ سُنتی ہوں یہاں بڑے بڑے نامی حکیم رہتے ہیں، اماں جان کو دکھا دیجئے۔ مجھے تو یقین ہے (یقین کیا وہم ہے) شاید یہاں کے علاج سے شفا ہو جائے۔ خدا کرے اماں جان اچھی ہو جائیں، مگر لہجہ سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ کیونکہ ایسی بچّہ نہ تھی جو اِس مہلک مرض کے انجام کو نہ سمجھ سکتی ہو۔

خورشید مرزا۔ حکیم صاحب کو تو میں دکھا دوں گا۔ کل صبح انشاء اللہ تعالیٰ ساتھ لے کے آؤں گا، مگر مجھ کو ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق ہے۔ پہاڑ پر لے جانا بہت ضروری ہے۔ سنتا ہوں کوئی درخت ہوتا ہے۔ شاید برچ کہتے ہیں۔ اُس کی ہوا بہت مفید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محض اُس کی ہوا کو مؤثر علاج بتاتے ہیں۔

اختری۔ یہاں کے —— بڑے ڈاکٹر کی بھی رائے لیجئے، اچھا تو بڑے ڈاکٹر اور وہ حکیم صاحب جو کلکتہ بھی اکثر جاتے ہیں مجھے نام یاد نہیں، اماں جان کے معالج تھے دونوں کو بُلا لائیے۔

خورشید مرزا۔ وہ میرے عزیز ہیں اور بیگم (اس حالت میں خورشید مرزا نے خورشید بیگم کو بیگم کہا ہائے کس دل سے اور کس مایوسی کے ساتھ) سے بھی عزیزداری ہے حکیم جعفر علی صاحب کو بھی شریک کراؤں گا۔ جن حکیم صاحب کو تم نے کہا ہے اُن کا نام تو اس وقت مجھ کو یاد نہیں مگر حکیم جعفر علی اُن کے شاگرد ہیں۔ خدا نے چاہا تو یہ سب کل آجائیں گے۔

اختری بیگم، یہ توجہ اپنی ماں کے علاج کی طرف دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ ایک دھندلی سی شکل امید کی سفید لکۂ ابر کی طرح گویا آنکھوں کے سامنے آئی مگر یہ لکۂ ابر مایوسی کی تیز ہواؤں نے بہت ہی جلد اُڑا کے نظروں سے غائب کر دیا، پھر وہی اگلا خیال قائم ہو گیا۔ کیسا ہی علاج ہو اماں جان کا بچنا مشکل ہے۔ کہیں ایسے بیمار بھی اچھے ہوتے ہیں۔

خورشید بیگم۔ (بیٹی سے مخاطب ہو کے) بیٹا تمہیں یاد نہیں جعفر علی میرا بھانجہ جو دو برس ہوئے کلکتہ گیا تھا اور میں نے تم کو سامنے کیا تھا وہ میرا سگا بھانجہ ہے۔

# باب ۳

## طبّی مُعائنہ

اے طبیبو مرے جینے کے کچھ آثار نہیں، نہ کرو فکرِ دوا

خورشید مرزا فیضو کی حویلی سے نکل کے امین آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ ذمہ داری جو خورشید بیگم کے سر کی قسم کھا کے اُنھوں نے اپنے سر لی تھی اوس کی ہر تفصیل پر نظر تھی۔ بار بار یہ خیال کہ وہ جس نے ۲۵ برس کے بعد اَب یاد کیا کاش یہ صحیح و سالم ہوتی یا ایسی علالت ہوتی جس سے کسی طرح جانبری کی اُمید ہو سکتی تھی تو یہ آخری حصّہ حیات کا کس اطمینان کے ساتھ بسر ہوتا۔ بچپن کے ساتھ کی کھیلی ہوئی وہ جو مجھ پر دل و جان سے فدا تھی اور اب بھی فدا ہے، وہ جس کے عشق کی آگ ابھی تک میرے سینہ میں دبی ہوئی ہے، میری زوجہ ہوتیں میں شوہر ہوتا۔ کس مزے سے دن کٹتا، افسوس اُسے دیکھا بھی تو کب دیکھا اور کس طرح سے دیکھا، ایک مرتبہ تو ظالم رقیب گود میں اُٹھا کے لے گیا۔ اور میں دم بخود رہ گیا۔ اب موت کے پنجہ میں گرفتار ہے، اَجل دبوچے ہوئے ہے۔ رقیب سے مخلصی ہوگئی مگر موت کے پنجہ سے رہائی غیر ممکن ہے، ہم بہر صورت ناکام ہی رہے۔ اب اس بھولی بھالی لڑکی کی پرورش اور اس پردہ داری کے ساتھ لڑکیاں کیا کہیں گی۔ بنے نہ بنے، نادری تو خیر ہر دل عزیز ہے کسی سے لڑنا جانتی ہی نہیں مگر جعفری لڑاکا تنک مزاج جس میں

رشک وحسد کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مجھ کو بہت چاہتی ہے مگر ایسی چاہت کس کام کی، دوسرے کا سایہ نہیں دیکھ سکتی۔ گھر کے انتظام میں کوئی دخل دے سکے کیا مجال، یہ لڑکی جس کی پرورش کا بار روپیہ پیسہ کے اعتبار سے مجھ پر نہیں ہے مگر یہ خیال کہ مجھپر اس کا بوجھ ہے جعفری کو بےچین کرتا رہے گا۔ وہ اس کو بری نگاہ سے، حقارت کی نگاہ سے، ذلت کی نظر سے دیکھے گی۔ مجھے ناگوار گذرے گا پھر منہ سے کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ اگر میں زیادہ دخل دونگا عجب عجب طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔ خدا جانتا ہے کہ میں اُس کو اپنی ہی اولاد کی جگہ سمجھوں گا۔ مگر جعفری کیا سمجھے گی۔ پھر اس کے بعد خیال آتا ہے شاید کچھن کو شفا ہو جائے۔ وہ اپنی لڑکی کے سر پر سلامت رہے، دل بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اچھی ہو جائے مگر عقل کہتی ہے دشوار محال خبط ہے۔ ع

این خیال است ومحال است وجنوں

اچھا طبی معائنہ تک کوئی رائے مستقل قایم نہیں ہو سکتی۔ سُنتا ہوں کہ یورپ کے طبیبوں نے اس مرض کا علاج پیدا کرلیا ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ سول سرجن بہت لائق معالج ہے روپیہ کے خرچ میں کمی نہ ہوگی۔ شاید اُمید کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اسی خیال میں امین آباد تک پہنچ گئے، حُسنِ اتفاق حکیم جعفر علی نے راستہ میں ٹوک کے تسلیم کی، ابھی مزاج پُرسی ختم نہ ہوئی تھی کہ خورشید مرزا جیسے کوئی، دفعتہً سوتے سوتے چونکتا ہے۔

خورشید مرزا۔ (جیسے ابھی تک یہ خیال ہی نہ تھا کہ کس سے ملاقات ہوئی ہے) اہاہ! جعفر علی، لے لو میں تو تمہارے پاس جارہا تھا۔ اسوقت کوئی اور دُعا مانگتا پوری ہو جاتی۔

جعفر علی میری خدانخواستہ آپ کو کیا ضرورت ہے جلدی کہئے۔ یہ حکیموں

اور ڈاکٹروں کا نقرہ ہے اپنی ضرورت خدانخواستہ کہہ کے کہتے ہیں، یعنی جب تک کوئی بیمار نہ ہو ہماری کیا حاجت ہو سکتی ہے۔ اگرچہ عزیزداری تھی مگر فن کے اعتبار سے یہ نقرہ بے محل نہ تھا۔"

خورشید مرزا۔ جی ہاں ایک دوست (ایک مسماۃ) کا طبی معائنہ چاہتا ہوں۔

جعفر علی۔ معائنہ کیسا، میں حاضر ہوں، آپ خوب جانتے ہیں، جہاں تک میری استعداد ہے اُس سے حاضر ہوں، کیا میری ضرورت سے زیادہ ہے۔

خورشید مرزا۔ یہ تو مجھ کو تم سے ہر وقت امید ہے۔ مگر نہیں مرض سخت ہے۔ حکیم صاحب بلکہ سول سرجن دونوں کو بلا کے دکھانا منظور ہے۔ اور کس کا معائنہ ہے تمہاری تو خالہ آئی ہوئی ہیں خورشید بیگم مگر کسی سے اس کا اظہار نہ ہو انھوں نے قسم دیدی ہے۔

حکیم جعفر علی۔ بہت خوب، حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کا آنا بھی ممکن ہے بلکہ سہل ہے۔ سول سرجن صاحب سے بھی مجھ سے ملاقات ہو چکی ہے وہ بھی آسکتے ہیں اور۔ حکیم صاحب سے تو صرف اطلاع کافی ہے، کب کا وعدہ لیا جائے؟۔

خورشید مرزا۔ کل جس وقت مناسب ہو۔

حکیم صاحب۔ دونوں کل صبح دس بجے آسکتے ہیں کہاں؟ آپ کے گھر پر۔

خورشید مرزا۔ نہیں یہاں سے قریب نئے گاؤں میں فیضو کا مکان مشہور ہے۔ تہ را ہے کے نکڑ پر وہاں تلاش کر لینا میں آدمی بھیجدوں گا۔

حکیم جعفر علی۔ شاید زیادہ یہ مناسب ہو کہ پہلے مجھ کو دکھلا دیجئے یعنی تو بجے وعدے آج ہی لے لئے جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہوں گا اس میں مصلحت یہ ہے کہ سول سرجن صاحب اور حکیم صاحب سے حال کے بیان کرنے میں

سہولت ہو گی ۔ میں اگر پہلے سے دیکھ لونگا تو اچھی طرح سمجھا دوں گا ۔

خورشید مرزا ۔ واقعی یہ زیادہ مناسب ہوگا ۔ اچھا تو میں کل ۹ بجے سواری بھیجوں گا، بلکہ ہم تم ساتھ ہی ساتھ چلے آئیں گے مگر تم کو اسی وقت دونوں جگہ جانا ہوگا ۔ گاڑی کر لو ۔ پہلے سول سرجن صاحب سے مل لینا پھر حکیم صاحب سے ۔

دوسرے دن ساڑھے ۹ بجے حکیم جعفر علی خورشید مرزا کے ساتھ نیّفو کے مکان پر پہنچ گئے ۔ حکیم جعفر علی مریضہ کی مسہری کے پاس ایک کرسی پر بیٹھے، دو کرسیاں خالی ہیں ۔ خورشید مرزا پردے کے اندر ہیں ۔ حکیم جعفر علی کے لئے تو ضرورت نہ تھی مگر اور دو طبیبوں کے خیال سے پردا پڑ گیا تھا ۔ اختری ماں کے سرہانے خورشید مرزا پائنتی کی طرف ۔ حکیم جعفر علی صاحب نے نبض اور قارورہ دیکھا ۔ ابتدا سے انتہا تک حال سُنا، دل میں کوئی رائے بھی قائم کر لی ہو گی ۔ مگر اظہارِ دل تو مناسب ہی نہ تھا اور اس لئے اور بھی کہ ابھی دو کامل ہم پیشہ معزّزوں کا انتظار تھا ۔ ساڑھے نو بجے کے قریب بڑے حکیم صاحب کی فِنس آگئی ۔ اب صرف سول سرجن صاحب کا انتظار ہے ، بڑے حکیم صاحب نے بھی نبض اور قارورہ دیکھا ۔ چھوٹے حکیم صاحب نے طبّی مذاق اور اصطلاحات کے موافق حال بیان کیا ۔ جس کو خورشید مرزا سنتے جاتے تھے ۔ سب سے اختری کی توجہ دونوں حکیموں کے لفظ بہ لفظ بلکہ لب و لہجہ ادائے مطلب کے طرز پر بھی کان لگے ہوئے تھے ۔ اوّل تو خواندہ تھی دوسرے مدّت سے علاج ہو رہا تھا ۔ اس مرض کے معلق کوئی بات ایسی نہ تھی جس کو وہ نہ جانتی ہو، دونوں طبیبوں کی تشخیص کا خلاصہ دِل نشین ہو چکا تھا ۔ ٹھیک دس بجے سول سرجن صاحب تشریف لائے ۔ مختصر حال سُننے کے بعد آلہ لگا کے بڑی دیر تک معائنہ کیا ۔ اس کے بعد تینوں معالج ایک اور کمرہ میں جو پہلے سے باہمی مشورہ کے بعد درست رکھا گیا تھا جا کے بیٹھے، ہر ہر پہلو پر مباحثہ ہوا ۔ دونوں حکیم اگرچہ قدیم یونانی طریقہ کے طبیب تھے مگر جدید اصطلاحات

بلکہ طرزِ علاج سے ناواقف نہ تھے۔ جب مباحثہ ختم ہوا، خورشید مرزا صاحب بلائے گئے۔ بحث کے نتیجہ سے نہایت احتیاط اور کسی قدر ابہام کے ساتھ نواب صاحب کو اطلاع دی گئی۔ یہ رائے قرار پائی کہ مرض کے مہلک ہونے میں کسی کو شبہ ہو مگر فی الحال کچھ زیادہ تردد کا محال نہیں ہے۔ تروائی ہوا جو خلاف موسم چل رہی ہے، سخت مضر ہے۔ پہلے رائے ہوئی کہ کشمیر لے جانا چاہئے۔ مگر دور دراز کے سفر اور مریض کی نازک حالت اور انتہائی ضعف کی وجہ سے منصوری پر اتفاق رائے ہوگیا۔ نینی تال کا ذکر آیا تھا مگر بڑے حکیم صاحب نے اس مقام کو زیادہ مرطوب قرار دیا۔ یہ بھی تجویز ہوا کہ بالفعل یہاں سے جا کے ہفتہ دو ہفتہ ڈیرہ دون میں ٹھہرنا چاہئے پھر چند روز راج پورہ میں قیام رہے۔ پھر نصف چڑھائی پر قیام کیا جائے۔ پھر منصوری پر۔ یہ احتیاطیں دونوں حکیموں نے تجویز کی تھیں۔ یوروپین ڈاکٹر نے اس پر زیادہ توجہ نہیں کی۔

بڑے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو دوہری فیس دے کے رخصت کیا، حکیم جعفر علی کو خالہ نے ایک اشرفی دی یہ نہ لیتے تھے مگر رشتہ میں چھوٹے تھے آخر لینا پڑی۔ دفعتہ گرمی زیادہ پڑنے لگی تھی۔ ان احتیاطوں پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں خیال کی گئی۔ ہوا یہ کہ خورشید مرزا پہلے کلکتہ گئے اور ایک اٹرنی کے ذریعہ سے سند ولایت کی درخواست دے کے تین دن میں واپس آگئے۔ اس کے بعد دو مامائیں، دو سپاہی، دو خدمتگار، ایک باورچی، حکیم جعفر علی، خورشید مرزا ڈیرہ دون روانہ ہوئے۔ ایک دن یہاں یوسف خاں کے ہوٹل میں قیام رہا پھر راج پورہ میں ایک مختصر مکان مل گیا۔

پہاڑ پر ابھی سردی زیادہ تھی اور ہر روز بارش ہو رہی تھی۔ یہ موسم مریضہ کے لئے قابلِ برداشت نہ تھا۔ اس لئے چند روز یہیں ٹھہرنا مناسب معلوم

ہوا۔ خورشید مرزا خود ایک خدمت گار کو ساتھ لے کے منصوری پر گئے یہاں متصل لنڈھور بازار ایک اسلامی ہوٹل میں ڈوڈ وسیع کمرے دونوں ماں بیٹیوں کے لئے، خدمت گاروں کے رہنے کو مکان باورچی خانہ یہ سب پورے موسم کے لئے کرایہ پر لے کے راج پورہ میں آئے پھر ضرورت خورشید مرزا کے ٹھہرنے کی نہ تھی، مریضہ سے (آخری) رخصت لے کے لکھنؤ چلے آئے۔ جعفر علی ایک ہفتہ ٹھہر کے چلے آئے پھر دو تین روز بعد گئے۔ اسی طرح وقت انتقال تک برابر آتے جاتے رہے۔ دس بارہ دن راجپورہ میں قیام کر کے یہ لوگ منصوری پر چلے گئے۔ راستہ میں جھپان کی سواری تھی مگر پہاڑ کے چڑھاؤ اوتار سے سب کو خصوصاً مریضہ کو سخت تکلیف ہوئی، لیکن پہاڑ کے مناظر سے بہت دل بہلاتا رہا، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے اونچے صنوبر شمشاد، سفیدار کے درختوں کی سرسبزی سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا طرح طرح کے خودرو گل بوٹے چشمے آبشار یہ سب ایسے منظر نہ تھے جس سے دل کو فرحت اور طبیعت کو شگفتگی نہ ہو۔ مگر خورشید بیگم کو ہولناک مرض نے اور اختری کو چاہنے والی ماں کی علالت نے اِن مناظر قدرت سے دل بہلانے کی فرصت نہ دی۔ پھر بھی بہ نسبت شہر کے مزاج کسی قدر بحال رہا۔ دس بارہ دن کے بعد طبیعت کسی قدر رو بصحت معلوم ہوئی یہ حالت چند روز ہی رہی پھر جس حالت پر مرض تھا اوسی حالت پر ٹھہر گیا، بارش موقوف ہو گئی تھی، پہاڑ کی سردی اعتدال پر تھی، ایک مہینہ کچھ دن اوپر سکون کی حالت قائم رہی، یہاں بھی نامی ڈاکٹروں کا علاج، بڑے حکیم صاحب کے بنوائے ہوئے جوارش اور عرق بھی ڈاکٹر کی اجازت سے وقتاً فوقتاً دئے جاتے تھے۔ عرق بید مشک بید سادہ اختلاج کے لئے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ علاج جو امکان بشری میں ہے اور جو رو بیہ

کے صرف سے میسر ہو سکتا ہے، سب ہوا۔ ایک ہفتہ کے لئے دہلی سے ایک نامی حکیم صاحب تشریف لائے، بڑودہ سے ایک مشہور بید کو بھی بلا کے دکھایا۔ بالآخر جو میسر تھی علاج بھی ہوا، مگر۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

# باب ۴

ہائے کیا چین سے سوتے ہیں مرنے والے + کھیتے ہیں گورِ غریباں پہ گذرنے والے

آخر بتاریخ ــــ صبح صادق کے بعد انتقال ہو گیا۔ پہاڑ کی ایک گھاٹی میں چشمہ و سبزہ زار تھا۔ یہیں ایک چھوٹی سی قدیم مسجد بھی تھی۔ مالک زمین سے یہ قطعہ پہلے ہی خرید لیا گیا تھا یہیں دفن ہوئیں۔ ایک سید صاحب جو یہاں مدت سے فقیرانہ فرد کش تھے ان کو پانچ روپیہ ماہوار پر قبر کی مجاوری اور قرآن خوانی کا انتظام سپرد کر کے خورشید مرزا اختری کو مع ملازمین لکھنؤ میں لے آئے، ملازمین سے افشائے راز کا اندیشہ تھا اور کوئی قدیم ملازم بھی نہ تھا اس لیئے سب کا حساب کر دیا گیا۔ ایک ایک مہینہ کی تنخواہ بطور انعام خوشنودی مزاج دے کے رخصت کر دیا۔

## خورشید مرزا کے گھر میں اختری کا داخلہ

صرف ایک دن پہلے دونوں لڑکیوں کو اس نئے مہمان کے آنے اور اسی گھر میں قیام کرنے کی اطلاع دی گئی، ایک مختصر کمرہ جو زنانہ مکان میں دیوان خانے سے متصل تھا خالی کرا لیا گیا تھا۔ اس کا فرش درست کیا گیا، سفیدی پتوا دی گئی چھت میں پردے لگا کے ایک چھوٹی سی مسہری لگا دی گئی، مختصر مگر خوبصورت اسباب ضروری مسند تکیہ فرش خاصدان اگالدان، لمپ شمعدان، سنگار میز مع سامان یہ سب قرینے سے لگا دیا گیا۔ کمرہ سادہ سادہ سامان سج دیا گیا۔

دونوں لڑکیاں ماما ئیں اصیلیں یہ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں یا الٰہی کون آنے والا ہے۔ اتنی خاطرداری ابا جان نے کسی کے لیے نہیں کی خدا خیر کرے کوئی گل کھلا چاہتا ہے۔ وہ مہری جہاں سے آئی تھی وہی سلسلہ اب تک چلا جاتا ہے۔ ابا جان کبھی باہر نہیں جاتے تھے، جب سے کئی مرتبہ سفر کو سدھائے خدا جانے کیا اسرار ہے ہمیں کیا معلوم مگر آثار اچھے نہیں ہے۔ سب سے زیادہ جعفری کو تلملی ہے۔

جعفری۔ دیکھئے کیا ہوگا۔ دیکھئے یہ بی اختری بیگم کیا گل کھلاتی ہیں (نام بتادیا گیا تھا عزیزداری بھی کہدی گئی تھی)۔

نادری۔ (جعفری کی یہ تلملی دیکھ کے) باجی مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ تم اسقدر کیوں گھبرائی ہوئی ہو۔ آخر ہوگا کیا۔ ابا جان کی کوئی عزیز تھیں ان کی اکلوتی لڑکی ہے، بن ماں باپ کی، ماں ابا جان کے ہاتھ میں اس لڑکی کا ہاتھ دے گئی ہیں ابا جان پرورش کریں گے۔ اختری کون ہے ہماری عزیز ہے۔ اختری کی ماں ابا جان کی رشتہ کی بہن تھیں۔ اختری ہماری بہن ہوئی۔ چلو ہم تم دو بہنیں تھیں ایک اور بہن آتی ہے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔

جعفری۔ (جھڑک کے) بچی (گویا دو سال کا بڑا پا آپ بڑی بوڑھی ہیں اور چھوٹی بہن بچہ ہے) تو جانے جتنے عزیز ہیں کیا میں اُن کو نہیں جانتی، یہ کون سی نئی عزیز پیدا ہوئی ہیں۔ اچھا آئی تھیں تو آتیں یہ ابا جان کی بوکھلاہٹ سے طرح طرح کے شبے ہوتے ہیں، ایک ذراسی لڑکی کے لیے یہ انتظام یہ سامان آج تک خالائیں بھی آئیں پھوپھیاں بھی، اے لو چاروں کا ذکر ہے خدا بخشے نانی اماں سال میں دو ایک دفعہ آتیں کسی کے لئے یہ اہتمام یہ سامان نہیں ہوئے۔ کمرہ خالی کردو اس میں جھاڑو دلوادو، سفیدی پھروادی گئی، دریاں چاندنیاں نکلوائی گئیں،

خاصدان اوگالدان، تسلہ لوٹے پر نئی قلعی ہوئی یا اللہ! اختری ایسی کہاں سے رنگا کے آئیں گی اور ساری حکومت مجھ جیسے میں اختری کی لونڈی ہوں، نا صاحب مجھ سے کسی کی ماماگری نہیں ہوگی۔ میں باز آئی۔

نادری۔ باجی خدا سے ڈرو، آبا جان نے تم کو گھر کا مالک سمجھ کے سب کاموں کو کہا اور کسی سے نہ کہتے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے سے گئیں۔ اُلٹے ابا جان کو الزام دینے لگیں — واہ!

جعفری — بڑی ابا جان کی طرفداری، میں نے سو دفعہ کہا تم میرے بیچ میں نہ بولا کرو۔ کچھ تو سمجھتی ہوں جو اتنی پریشان ہوں۔ میں ایسی گھر کی مالک بننے سے باز آئی۔ بیوی تم کو اختری کی ماما بن کے رہنا نصیب ہو۔ مجھ سے یہ دھندا نہ ہوگا۔

نادری — اختری بن ماں باپ کی لڑکی ہے ہمارے گھر میں مہمان آتی ہے ہمکو خاطرداری کرنا لازم ہے اس میں ماماگیری کونسی ہو گئی۔

جعفری۔ بڑی نیک خداترس لے بی بیٹھو وہ باتیں کرو جو تمھارے سن پر زیب دیتی ہوں، بس سو بات کی ایک بات کہدوں مجھ سے آبا جان کی تابعداری ہو سکے گی، اب چاہو کہ ایرے غیرے آئے گئے کی بھی جوتیاں سیدھی کروں یہ نہ ہوگا۔ یہ تم کرنا۔ خیر ابھی تو دیکھنا ہے کہ بی اختری ہیں کس منش کی۔

نادری — ہاں تم نے یہ ایک بات کہی۔ پھر ابھی سے کیوں تلملائی جاتی ہو۔ دیکھ تو لو اور جو وہ تم سے بھی بڑھ کے سگھڑ ہو اور تم کو خود بیوی بنا کے طاق پر بٹھا دے اور خود گھر کا کام اپنے سر پر اُٹھا لے۔

جعفری — اہا! یہی تو میں سوچتی ہوں۔ گھر بھر سے مجھے کام نہیں، اگر آبا جان کے کام کو کسی نے ہاتھ لگایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ بھلا یہ کب مجھ سے دیکھا جائے گا کہ وہ آبا جان کو پان بنا بنا کے دیں یا خاصدان میں گلوریاں رکھ کے

باہر بھجوائیں، اُسی وقت تو میں ہتّے سے اُکھڑ جاؤں گی۔

نادری۔ نہیں صاحب ابا جان کے کام کو وہ کیوں ہاتھ لگانے لگی، بیچاری غیر تمہارے ہوتے کیوں دخل دینے لگی۔

جعفری۔ اچھا دیکھنا۔ ابا جان کی بوکھلاہٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بی اختری ہیں کوئی چیز۔

## اختری کی سواری آتی ہے

گلابی جاڑے کے دن، اب ساڑھے چار بجے ہیں، دھوپ انگنائی سے بالکل چلی گئی، اب کوٹھوں پر ہے، برسات جا چکی ہے۔ اب کوئی نکہت پانی برسنے کا باقی نہیں ہے۔ رضائیاں بھرنے کا سامان ہے روئی دھنکی جاتی ہے تیسرے پہر کا کوٹھوں پر بیٹھنا گیا کیونکہ سر شام سے سردی شروع ہو جاتی ہے۔ مسہریاں پلنگ انگنائیوں اور کوٹھوں سے اندر کے دالانوں اور کمروں میں جا چکی ہیں۔ حلوا سوہن والوں کی آواز کانوں میں آنے لگی، نمش بکنے لگی، آم بازار میں کہیں کہیں ہیں مگر بہت گراں اور کھانے میں بے مزہ، ہاں شریفہ کثرت سے نکل پڑے ہیں۔ ابھی مٹر کی پھلیاں نہیں نکلیں، سنگھاڑے آ گئے۔

اختری کی سواری زنانی ڈیوڑھی میں لگائی گئی، کہاروں کی آواز سن کے خود خورشید مرزا دیوان خانہ سے جلد جلد قدم اٹھا کے زنانی ڈیوڑھی پر گئے۔ لڑکیوں کو آواز دی، لڑکیوں چلو! نادری خوش ہے۔ جعفری کی تیوری پر بل آ گیا ہے۔ اختری اُتری، پہلے ہی خورشید مرزا سے چار آنکھیں ہوئیں پھر نادری دوڑ کے گلے سے چمٹ گئی۔ نادری مل چکی تو جعفری نے بھی ہاتھ بڑھا کے گلے ملنے کی رسم شرما شرمی ادا کر دی۔

خورشید مرزا دونوں بیٹیوں سے اچھی طرح واقف تھے، نادری کی ملنساری سے بہت خوش ہوئے۔ پیار کی نظروں سے دیکھا، جعفری کے اکل کھرے پن سے ناخوش ہو کے ذرا گھور کے ملال ظاہر کیا۔ جعفری کے اور بھی مرچیں سی لگ گئیں سب سے زیادہ یہ خیال تھا کہ نئی آنے والی نے میری بے رُخی اور باپ کی آزردگی کو نہ دیکھ لیا ہو۔ بلکہ یقین تھا کہ اختری نے آتے ہی آتے باپ کی پھری ہوئی نظریں میری طرف سے دیکھ لیں، لے لو! میں اس وقت اختری کی نظر میں حقیر ہو گئی۔ اختری کے روبرو ابّا جان کا مجھ سے نگاہ بدلنا بُرا ہوا۔ مجھے تو اس پر غصہ آرہا تھا کہ ابّا جان اس ٹاٹ برابر کی لونڈیا کو سواری سے اُتارنے دوڑے گئے اور پھر ہم پر یہ حکومت، لڑکیوں چلو! جیسے بیگم صاحب کی سواری آئی ہے، لونڈیاں اُتارنے جائیں۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ مجھ سے اور ان بیگم صاحب سے نہ بنے گی، میری بات سچ ہوئی نہ۔ ان کے آتے ہی آتے ابّا جان نے اُن کو دکھا کے مجھ پر کڑے تیور ڈالے گویا یہ دکھایا کہ یہ تمھاری محکوم بن کے رہیں گی۔ ابّا جان کی تو میں لونڈی ہوں مگر چاہے کہ دوسرے کے آگے اُس کی خاطر سے مجھ پر خفا ہوں گھرکیاں دیں یہ نہ ہوگا۔

جعفری تو دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔ اُدھر نادری اور اختری میں خوب مل جل کے باتیں ہو رہی تھیں گویا مدتوں کی جان پہچان ہے۔ اختری کی ماں کو مرے ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے اور ماں بھی کون بیٹی کی عاشق زار۔ اختری کے منہ پر ہنسی کیسی مسکراہٹ کا نام بھی نہ تھا غم کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس سکوت کو جاہل ماما اصیلوں نے اور جعفری نے بھی حماقت سے تمکنت سمجھ لیا۔ افسوس جس کے دل میں درد نہیں وہ کسی غم کی صورت کب پہچان سکتا ہے، مگر پھر بھی اختری نے اپنے کو بہت سنبھالا، نادری تھی تو بچہ مگر

نیکی اُس میں سرتاپا بھری ہوئی تھی۔ اُس نے کسی اشارہ کنایہ سے یہ تازہ سوگواری یاد نہیں دلائی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی جس میں ماں کا ذکر نہ آنے پائے پڑھنے لکھنے کا ذکر چھیڑ دیا، اختری اچھی خاصی پڑھی لکھی دست و قلم تھی، فارسی میں گلستان بوستان اور ایسی ہی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ کلکتہ میں لڑکیاں انگریزی بھی پڑھتی ہیں۔ اختری بھی کسی قدر انگریزی پڑھے ہوئے تھی یہ دونوں بہنیں حسب ضرورت اُردو پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ نادری کو پڑھنے کا شوق تھا جب اُس کو اختری کی قابلیت کا حال معلوم ہوا فوراً اُس سے پڑھنے کا قصد ظاہر کیا، اچھی بہن مجھکو پڑھا دو گی، اختری نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا۔ سوزن کاری کے کاموں میں بھی اختری کو اچھی مہارت تھی۔ اس کا بھی شوق نادری نے ظاہر کیا۔ غرضکہ پہلے ہی دن کی دو گھڑی کی بات چیت میں نادری اختری نے آئندہ مل جُل کے رہنے کا پورا منصوبہ درست کرلیا۔ نادری ایسی بدتمیز نہ تھی جو اپنی بڑی بہن کی بدمزاجی کو اختری سے بیان کرتی، مگر جعفری کے الگ تھلگ رہنے سے اختری کو اس کے مزاج کا حال معلوم ہوگیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ گھر کا کاروبار جعفری کے ہی حوالے ہے۔ اختری سمجھ گئی کہ روزمرہ کی ضرورتوں میں خواہ مخواہ رکاوٹیں پیدا ہونگی مگر وہ ماں کے مرنے کے بعد ہر دشواری کے مقابلہ کو آمادہ ہوگئی تھی۔ اُس کو معلوم تھا کہ وہ اس گھر میں جوان دو لڑکیوں کے باپ کا گھر ہے۔ مہمان ناخواندہ کی طرح آکے اُتری ہے۔ اُس کی معذرت کا راز ماں کی وصیت کے لحاظ سے ضرور پوشیدہ رکھا جائے گا۔ یہ دونوں بہنیں مجھکو یہی سمجھیں گی کہ ہمارے باپ کے ٹکڑوں پر آکے پڑی ہے، اس ذلت کو جو اُس کی واقعی حیثیت اور مقدرت کے خلاف تھی اُسے ہر طرح برداشت کرنا ہوگا۔ پھر یہ گھر اُس کے لیے بالکل نیا تھا وہ اپنے گھر میں دس بارہ ملازموں (عورت مرد ملاکے)، پر حکومت کرتی تھی، یہاں آکے

اُس نے دیکھا کہ نوکروں نے اُس کے آنے کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اُس کی نوکریں اس کو جُھک کے تین تسلیمیں کیا کرتی تھیں۔ اُٹھتے بیٹھتے بسم اللہ کہتی تھیں تعظیم دیتی تھیں، یہاں دعا تعظیم سب ندارد بلکہ یہاں نوکروں نے اُسے دیکھا بھی تو منہ پھیر کے اپنی راہ چلی گئیں۔ تسلیم کیسی معمولی پرسش تک نہ کی۔ جعفری کا اکل کُھرا پن اُس نے آتے ہی آتے دیکھ لیا۔ خورشید مرزا کے تیور بھی دیکھے اگر کوئی بُرے دل کی ہوتی تو اُس کو اس انتقام سے لُطف آتا اُس کے نیک دل نے یہ کہا کہ صرف میری وجہ سے بے گناہ جعفری پر باپ کی خفگی ہوئی، اس خفگی کا سبب میں کمبخت ناشدنی ہوں، وہ جعفری کی بے اعتنائی اپنے ساتھ ناواجب نہیں خیال کرتی تھی۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ خورشید مرزا ایک اوسط درجہ کی مقدرت کے رئیس ہیں، خاندانی حیثیت اور قدامت کے اعتبار سے نہ مقدرت کے اعتبار سے جعفری گھر کی منتظم ہے وہ میری وجہ سے جو اخراجات بڑھیں گے اُن کو مد زائد خیال کر کے گھر کا بلکہ اپنا نقصان سمجھتی ہوگی، یہ کوئی بیجا خیال نہیں ہے اُس کا بھروسہ فقط خورشید مرزا پر تھا۔ مگر یہ بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ لڑکیوں کے سامنے باپ سے زیادہ اخلاص بڑھانے کی کوشش کرنا سخت بدنما ہوگا دُور دراز کا رشتہ سہی مگر پھر میں غیر ہوں، میں اگر خورشید مرزا (ماموں جان) کے پاس زیادہ گھسی ہوں گی تو لڑکیاں ضرور بُرا مانیں گی۔ وہ عشق و اُلفت کی گناہگاریوں سے بالکل ناواقف تھی۔ اس لئے اُسے یہ گمان نہ تھا کہ ناجائز بدگمانیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور خوب ہوا کہ اُس کا خیال اس حد تک نہیں پہنچا جب سے ماں نے خورشید مرزا کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا وہ اُن کو اپنا باپ ہی سمجھنے لگی تھی، مگر بدبخت مامائیں اصیلیں اور اُن کے بدصحبت کے اثر سے جعفری بھی اس بیہودہ اور سخت خلاف اخلاق سوء ظن سے باز نہ رہ سکیں اگر جعفری اس مہمل خیال کو زبان پر نہ لا سکی لیکن دل میں

یہ خیال زہر کا کام کرتا رہا جس نے اُس کو اختری کی طرف سے صاف نہ ہونے دیا اور آخر ایسے بد نتیجے پیدا ہوئے جو ناظرین کو رفتہ رفتہ معلوم ہوں گے۔

خاصہ کے وقت، آج دسترخوان ذرا تکلف سے سجایا گیا تھا۔ اس نئی مہمانی کے لئے تھوڑا سا پلاؤ اور میٹھے چاول بھی پکوائے گئے تھے اور ستم یہ ہے کہ جعفری کو اس کے لئے خرچ اور اہتمام کرنے کی تکلیف ہوئی تھی، دہی، ملائی، مربہ، اچار غرضکہ اچھی طرح سے مہمان کی خاطرداری کا خیال کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب خورشید مرزا کے حکم سے ہوا تھا، جعفری کو ہر جدید انتظام سے تازہ ملال ہوتا تھا۔ خصوصاً دسترخوان پر خورشید مرزا خود بھی موجود تھے۔ اور ہر طرح سے اختری کی دلجوئی اور خاطرداری کا خیال کیا جاتا تھا، ہر چیز اختری کے سامنے خود خورشید مرزا اپنے ہاتھ سے اُٹھا کے رکھتے جاتے تھے۔ کھانے پر اصرار ہو جاتا تھا، یہ خاطرداری جعفری کے لئے نشتر کا کام دے رہی تھی، باداجان کی خاص توجہ کا اسکو دلی رنج تھا۔ نادری بہر حال خوش تھی خورشید مرزا جعفری کی حرکتیں دیکھتے تھے۔ کبھی ٹال جاتے تھے کبھی سب کی نظر بچا کے چشم نمائی کر دیتے تھے۔ جعفری اور جلتی تھی اور سلگتی تھی اور ضد سے کام بگاڑتی تھی

دوسرے دن نوکروں چاکروں میں یہ لفظیں سُنی گئیں "سچ مچ باداجان کو کیا ہو گیا ہے، آثار اچھے نہیں ہیں۔ جدہر جدہر اختری جاتی ہے باواجان کی نگاہیں جاتی ہیں۔ جعفری تو دسترخوان سے فراغت پاتے ہی اپنی صحنچی میں پلنگ پر جا بیٹھیں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ ٹھٹے لگانے لگیں مگر نادری اختری کے ساتھ ہی ساتھ رہی اور جہاں تک اُس کی قابلیت تھی تازہ مہمان کے دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اختری کا یہ حال تھا کہ لاکھ ضبط کرتی تھی اپنے کو سنبھالتی تھی مگر آنکھ سے آنسو ٹپکے ہی پڑتے تھے۔ نیا شہر، نیا مکان ماں کا مرنا آنکھوں کے سامنے چار دن کا واقعہ تھا۔ جعفری جسکو درحقیقت اس گھر کا مالک سمجھنا چاہئے اُسکی پہلے

ہی دن سے بے اعتنائی، آخر پتھر کا کلیجہ نہ تھا آدمی تھی اور آدمی بھی ایسی جو اول ہی سے نازک مزاج تھی۔ ماں کے مرنے سے اور بھی طبیعت نازک ہو گئی تھی۔ آخر نادری نے کہا بہن تم بہت تھکی ہوئی ہو سویرے سے آرام کرو۔ اختری خود رونے کے لیے تنہائی ڈھونڈھ رہی تھی، اس اشارہ کو پاتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نادری ضرور کمرے تک پہنچانے جاتی مگر خورشید مرزا کو اندر آتے دیکھ کر ٹھٹک گئی، نادری کے کمرے کے پاس اختری اور خورشید مرزا کا آمنا سامنا ہوا۔

خورشید مرزا کہو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اب تو بیٹا تمہیں یہاں رہنا ہے شرم نہ کرنا جو چیز چاہیے ہو فوراً کہدینا۔

اختری۔ اس دلجوئی سے متاثر ہو کے کچھ جواب دیا چاہتی تھی مگر آنسو گلوگیر ہو گئے بے ساختہ رونے لگی بلکہ ایک یا دو مرتبہ چیخ مار کے رو دی، جس کو نادری حقیقت اور جعفری بناوٹ سمجھی، ماما سے کہتی ہیں دیکھنا کیا نیل دکھاتی ہے۔

خورشید مرزا۔ اختری، اختری، ہائیں بیٹا صبر کرو، کیا رو رو کے جان دو گی، کیا کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، ہاں سچ ہے کہ تم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے مگر مشیت الٰہی سے کیا چارہ ہے یہ کہہ کے گلے سے لگا لیا بہت دیر سمجھایا۔ تشفی دلاسے کے بعد کہا، اچھا جاؤ سویرے آرام کرو۔ ہاں اور تمہارے کمرے میں کون سوئے گا۔ نادری کو پکار کے جاؤ آج رات کو بہن کے ساتھ سو رہو کل سے کچھ اور بندوبست کیا جائے گا۔

# باب ۵

ہم صفیران چمن سے کوئی اتنا کہدے + شب اوّل ہی یہ ہم تازہ گرفتاروں کی

اختری ۔ جی نہیں ماموں جان، میں چھوٹے سے سن سے اکیلے کمرے میں سونے کی عادی ہوں مجھے ڈر نہیں لگتا بلکہ کسی کے ساتھ مجھکو نیند نہیں آتی میری اَنّا خدا بخشے بہت چھوٹے سے سن میں میرے ساتھ سوتی تھی آخر جب میں بیچین ہونے لگی، پلنگ کے نیچے پٹی کے پاس سونے لگی مگر یہ اُسوقت کا ذکر ہے جب میرا سن کوئی چار برس کا تھا۔ جبسے اَنّا نے انتقال کیا میں اکیلی ہی سوتی ہوں۔

کم سن لڑکی کا اکیلے کمرے میں تنہا سونا اس شہر کے قاعدہ کے خلاف تھا اس پر خورشید مرزا نے بہت اصرار کیا۔ اختری بالکل تنہائی چاہتی تھی۔ آخر اسی کی رائے پر چھوڑ دیا۔

اختری اپنے کمرے میں جہاں اُسے ایک مدت عمر کی بسر کرنا تھی اپنی مسہری پر پاؤں لٹکا کے بیٹھی بائیں گال کے نیچے ہاتھ رکھ کے اپنی گذشتہ اور موجودہ بلکہ آئندہ حیات کے سلسلہ ملانے لگی۔

اُسکو آج ہی سے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح جعفری کو ملانا چاہئے۔ جہاں رہنا ہے مل جل کے رہنا چاہئے۔ اگر جعفری کی بے رُخی ایسی ہی رہی یا اور بڑھ گئی تو زندگی دو بھر ہو جائیگی۔ اچھا میں حتی المقدور کوشش کروں گی۔

---

حکیم جعفر علی صاحب جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ نہایت ہی وجیہہ تھے بلکہ خوش رو سمجھے جاتے تھے گندمی رنگ میانہ قد مائل بدرازی چو گوشیہ ٹوپی اُن کے سر پر لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھی۔ صورت سے شوقین مزاج معلوم ہوتے تھے مگر واقعہ صورت کے خلاف تھا۔ محض طالب العلم تھے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد طب کا اجازہ بھی حاصل کر چکے تھے۔ کئی سال تک کلکتہ میں رہ کے ڈاکٹری کے اصول سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ عمل بالید (جراحی) کی بھی کسی حد تک مشق کی تھی مگر اس کی جرأت نہیں کرتے تھے، انتہا کے محتاط اور خدا ترس تھے، اب ایمن آباد میں مستقل مطب شروع کیا تھا۔ کسی ہندوستانی رئیس تعلقدار کی سرکار سے ملازمت کا سلسلہ بھی ہو گیا تھا۔ خورشید مرزا صاحب علاوہ دوستی کے کچھ دُور کی قرابت بھی تھی جسکا ذکر ہو چکا ہے، حُسنِ اتفاق سے اختری کی ناہنال سے قریبی رشتہ تھا۔ جب خورشید بیگم پہاڑ پر گئی ہیں یہ ہمراہ گئے تھے، اُن کی علالت کے زمانہ میں اکثر آٹھ آٹھ دن جا کے رہے معالجہ خصوصاً تیمارداری میں اُن سے بہت مدد ملتی تھی۔ اختری سامنے ہوتی تھی۔ خورشید مرزا کے گھر میں لڑکیاں چھپتی تھیں مگر کچھ ایسا گہرا پردہ نہ تھا ہاں نادری بہت چھپنے لگی تھی۔ اس لئے کہ اُس کے ساتھ نسبت کا خیال ہوا تھا۔ عزیزداری کی وجہ سے آمدورفت میں کمی نہ ہوئی۔ ان کی صفات پسندیدہ کے ساتھ جوان صالح متقی پرہیزگار اس سن میں انتہا کی احتیاط، خورشید مرزا کو اُن سے دلی محبت تھی۔ وہ نادری کو بڑا خوش نصیب سمجھنے لگے تھے۔ کیونکہ یہ تقرر اُن کے حسب دل خواہ ہوا تھا۔ اور اس سے بہتر نہ ہو سکتا تھا۔ اختری اُن کو بھائی صاحب کہتی تھی اور بے تکلفی سے ہمکلام ہوتی تھی۔ تکلف اور شرم بیجا جس کو جھیپ کہتے ہیں وہاں ہوتی ہے جہاں پانی مرتا ہے جب دل صاف ہوں تو ان ڈھکوسلوں کی ضرورت نہیں رہتی، ہاں کمینہ ناپاک طبیعت کے لوگ تو عیب جوئی سے باز نہیں رہتے بلکہ تہمت

اور بہتان لگادینے کو اپنے ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے دُور دُور رہنا چاہیئے مگر ان کی بیہودہ گوئی کی پروانہ کرنا چاہیئے، یہ لوگ حُسنِ معاشرت کی ترقی کے دشمن ہیں اور ان کا بس جہاں تک چلے گا جہالت کے تیرہ و تاریک غاروں سے باہر نہ نکلنے دیں گے۔

حکیم سید جعفر علی صاحب جعفری بیگم کے چھوٹے بہنوئی بننے والے تھے اب جو وہ اس گھر میں آئے اور اُن کی توجہ بھی اختری ہی کی طرف زیادہ پائی تو یہ اُن کو اور بھی ناگوار ہوا۔ باپ کی وجہ سے رشک تو تھا اب دوسرے رشک کا سبب پیدا ہوا۔ غرضکہ بیچاری جعفری کے مقدر میں بے آگ سلگنا لکھا ہوا تھا۔

اختری کی انگلیٹ بہت نازک تھی، اس کی طبیعت نازک تھی۔ جثہ نازک تھا، مگر ماں کا طولانی مرض جس کی تیمارداری کا بار چھوٹے سے سن میں اُسی کے سر پر پڑا تھا امید و بیم کی حالت، مرض الموت کا متواتر عجیب عجیب صورتیں بدلنا اور ہر صورت میں اوّل سے زیادہ خوفناک کلکتے سے لکھنؤ پھر لکھنؤ سے منصوری اور وہاں امیدوں کا خاتمہ، مایوسی کا سامنا، رونا پیٹنا، ماتم داری سوگواری یہ سب ایسے صدمے نہ تھے کہ اُس کی صحت پر بُرا اثر نہ ڈالتے۔ اُس کو بخار آنے لگا تھا۔ اور تپ لازمی ہوا چاہتی تھی۔ مگر خورشید مرزا خصوصاً حکیم جعفر علی کی ہمدردانہ کوششوں نے خوفناک نتیجوں سے بالآخر محفوظ رکھا گر لکھنؤ میں آنے کے بعد مہینہ دو مہینہ تک وہ علیل رہی اس درمیان میں حکیم صاحب کی آمد و رفت زیادہ بڑھ گئی تھی، وہ اختری کے راز سے بھی واقف تھے لیکن اُن سے افشاء راز کا بالکل خوف نہ تھا۔

## حکیم صاحب اور اختری کی دو دو باتیں

حکیم صاحب کے آنے کی خبر سن کے پردہ ہو گیا تھا، جعفری حسب معمول اپنی صحنچی

میں نوکروں پر گھر کے روزانہ انتظام کے بارے میں احکام جاری کر رہی تھیں، نادری کوٹھے پر چلی گئی تھی، اختری اور حکیم صاحب قریب قریب تنہا ہیں۔ مامائیں اپنے قرینے سے دُور دُور رہیں۔

حکیم صاحب۔ معمولی مزاج پرسی کی نبض و قارورہ، ملاحظہ کیا نسخہ میں خفیف سی تبدیلی، پرہیزی کھانے کے متعلق گفتگو ختم کر کے) کہیئے چھوٹی بیگم صاحب جعفری بیگم صاحبہ سے کیسی بنی۔

اختری۔ (شکوہ شکایت سے لب آشنا نہ تھے اوس کو شکر گذاری ہی آتی تھی۔ وہ دوسرے کا الزام اپنے سر لینے کو موجود رہتی تھی وہ ہمیشہ دوسرے کی غلطیاں معاف کرنے کے لیئے آمادہ تھی) اچھی بنی وہ مزاج کی بھاری بھر کم ہیں بہت جلد کسی سے میل کر لینا، بے تکلف ہو جانا اُن کی طبیعت میں نہیں ہے۔ ابھی تو بہت کُھل کے نہیں ملیں لیکن جب ملیں گی تو اچھی طرح ملیں گی۔

حکیم صاحب۔ (اس عورت کی بد طینتی سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، مجھے تو اس کی بہت کم اُمید ہے۔ بہر صورت کوشش کرنا چاہیئے۔

اختری۔ میں کوشش کروں گی اور اپنی قابلیت سے بڑھ کے کوشش کروں گی میں اُن کے خوش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گی آئندہ میری تقدیر۔

حکیم صاحب۔ تمہاری تقدیر کو اس سے کیا سروکار وہ اپنا سر کھائیں گی۔ پھر آپ ہی آپ بیحد افسوس ایسی فرشتہ خصلت لڑکی سے بھی اگر جعفری خوش نہ ہوں تو یہ اُن کی بدقسمتی ہے۔ سخت مشکل یہ ہے کہ اصلی واقعات نہ جعفری کو معلوم ہیں اور نہ ابھی اُن پر ظاہر کرنا مصلحت ہے، اگرچہ میں ہمیشہ سے اس مصلحت کے خلاف ہوں، انسان کو اُس رتبہ پر دکھانا چاہیئے جو اُس کا مرتبہ ہے، نہ کم نہ زیادہ، جس طرح کسی کے رتبہ سے اُوس کو بالاتر ثابت کرنا بُرا ہے اوسی طرح اصلی حیثیت سے

کم دکھانا بھی، دونوں طرح دھوکے ہوتے ہیں اور اکثر خلاف مزاج امور واقع ہوا کرتے ہیں جن سے سخت تکلیفیں ہوتی ہیں اور رنج پہونچتے ہیں۔ جعفری کی بدباطنی سے مجھ کو بڑا اندیشہ ہے، خورشید مرزا صاحب کی رازداری مجھے پسند نہیں ہے۔

اختری۔ وہ کیا کریں یہ تو خدا بخشے اماں جان کی وصیت ہے۔ ماموں جان خود حیران ہیں، جعفری بیگم پر وہ میری وجہ سے خفا ہوتے ہیں، مجھکو دلی صدمہ پہنچتا ہے مگر میں مجبور ہوں۔ پھر میں کہتی ہوں کہ میں اُن کے خوش رکھنے کی کوشش کرونگی۔

حکیم صاحب۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

اختری۔ تو پھر آپ ہی فرمائیے کیا کیا جائے۔

حکیم صاحب۔ سوائے کوشش کرنے کے کیا کہا جائے وہ تم خود کہہ رہی ہو۔

اختری۔ دیکھئے پھر وہی بات آئی نہ۔

حکیم صاحب۔ ہاں سچ ہے اور ہو ہی کیا سکتا ہے، اچھا خدا حافظ۔ مجھے ایک مریضہ کو دیکھنے جانا ہے۔

اختری۔ دیئے اُٹھ کے تسلیم کی، خُدا حافظ!

جعفری جب تک وہ بیٹھے رہے تو چُپکی کونے میں دُبکی بیٹھی رہی جب چلے گئے اور یہ معلوم بھی ہو گیا کہ گئے، کیا حکیم صاحب گئے۔ ماماؤں نے کہا کب کے گئے، آپ کو اب خبر ہوئی ہے، جی ہاں گلوریاں اسی طرح رکھی ہیں، ہاں صاحب اب ہم سے کیا کام، نئے نئے لوگوں سے میل ملاپ بڑھے گا۔ اب ہمیں کون پوچھتا ہے۔ ہائیں کمبخت تونے بھی نہ کہا کہ حکیم صاحب جاتے ہیں، اے لوکل سے مجھکو حرارت معلوم ہوتی ہے، سر میں درد بھی ہے۔ میں نبض دکھانے کو تھی مجھے کسی نے خبر تک نہ کی اب اس گھر میں میرا رہنا فضول ہے۔

یہ سب باتیں اسی طرح بلند آواز سے کہیں کہ اختری سب سُنیں، سخت صدمہ

ہوا جواب دینے کا موقع نہ تھا۔ دل میں گھٹ گھٹ کے رہ گئی۔ علالت کا حال سُن کے خیال ہوا کہ سچ ہے وہاں فقط بہانہ نہ تھا، صرف الزام رکھنا منظور تھا۔ اگر یہ کہتی ہوں کہ حکیم صاحب کو پھر بُلا بھیجوں خصوصیت ظاہر ہو گی اس سے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ہاں جب خورشید مرزا گھر میں آئے تو اُن سے بیان کیا۔

اختری۔ باجی کی طبیعت ناساز ہے۔ حکیم صاحب آئے مگر مطب کو دیر ہوتی تھی چلے گئے۔ کل اُن کو بُلوا بھیجئے کیونکہ اُن کے آنے کا ٹھیک نہیں ہے۔ روزانہ تو آتے نہیں شاید دو تین دن نہ آئیں خدانخواستہ باجی کی علالت کو طول ہو جائے۔

خورشید مرزا اپنی صاحبزادی کو خوب جانتے تھے، کچھ جواب نہ دیا۔ تیوری چڑھا کے منہ پھیر لیا۔ جعفری خود اس موقعہ پر نہ تھیں۔ مگر گوئندے لگے ہوئے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پہنچاتے تھے۔ کل واقعہ اُن کو معلوم ہو گیا۔ جب خورشید مرزا باہر چلے گئے۔ جعفری پھر بکارنے لگی۔ صاحب میرے علاج معالجہ کی کوئی سفارش باوا جان سے نہ کیا کرے۔ مجھے یہ چونچلے نہیں اچھے لگتے اور نہ مجھے یہ ڈھکوسلے پسند ہیں روز نسخے بندھ رہے ہیں فضول پیسہ اُٹھ رہا ہے۔ قدح کے قدح چڑھائے جا رہے ہیں۔ ہم بیمار بھی ہوتے ہیں تو لے لو موئی دھیلے کی خطمی دھیلے کا بنفشہ منگا کے جوش کر کے ذرا سی مصری ڈال کے پی لیا چلو بھلے چنگے ہو گئے۔ ہم یہ نخرے کیا جانیں کہ روز قارورہ رکھا جاتا ہے۔ نبضیں دکھائی جاتی ہیں۔ ٹھنڈائیاں بھگوئی جا رہی ہیں، آنولے کے ہڑ کے مربے آ رہے ہیں سونے چاندی کے ورق کی گڈیاں کی گڈیاں صرف ہو رہی ہیں۔ موتی یاقوت زمرد جواہرات سماق کے کھرل میں حل ہو رہے ہیں۔ رہیں جھونپڑیوں میں خواب دیکھیں محلوں کے۔

دلخراش طعنوں کا حرف بحرف نشتر بن بن کے اختری کے کلیجہ میں چبھا مگر بیچاری لہو کے سے گھونٹ پی کے چُپ ہو رہی۔ مشکل یہ تھی کہ خورشید مرزا اختری کی

مقدرت کی حیثیت سے اس کی پرورش کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن کا تو ایک حبّہ اس میں صرف نہیں ہوتا تھا اور حتی المقدور خود بھی صرف کرنے کو موجود تھے اور جعفری اس کو اپنے باپ کے مال کا ضایع ہونا خیال کرتی تھی اور دل کی بھی تنگ تھی اس لئے اس کی ناگواری بھی کچھ بیجا نہ تھی۔

---

جلے کے جاڑے ہیں، جیبوں سے ہاتھ مشکل سے باہر آتے ہیں، دوپہر دن چڑھے تک لحاف سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ انگیٹھیاں گلے میں پڑ جائیں تو چین آئے، بوند بھر کا دن ہوتا ہے ابھی صبح ہوئی، ابھی نو بج گئے، کھانا کھاتے کھاتے دوپہر ہو گئی۔ دوپہر ڈھلی کسی قدر سردی کم ہوئی تھی کہ تین بجے بعد سے پھر وہی جاڑا۔ اختری اور جعفری کا وہی عالم ہے مگر ایک طرف تو جعفری سناتے سناتے تھک گئی اُدھر اختری کو طعنے سننے کی عادت سی ہو گئی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں نبھ جائے گی مگر توبہ کیجئے، دوستی ہو یا دشمنی جب تک اصلی اسباب معدوم نہیں ہوتے ان کا باقی رہنا ضروری ہے، اختری پر خورشید مرزا کی توجہ خرچ کی زیادتی یہ اسباب تھے، خورشید مرزا نے جو عہد اختری کی ماں سے کئے تھے اُن کو ہیٹی کی خاطر سے کیوں کر بھول جاتے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ اختری کے حال پر التفات نہ کیا جاتا بلکہ کچھ ایسے سانحے در پیش ہوئے جس سے التفات نے زیادہ ترقی کی اختری کو اُس کی مقدرت کی نسبت سے کم سہی مگر اس کی خوشی کے لئے خرچ کا دینا ضروری تھا مگر خیریت تھی کہ اختری کو جو کچھ دیا جاتا تھا وہ جعفری سے بلکہ سب سے چھپا کے دیا جاتا تھا۔ اختری کی زبان چٹوری نہ تھی، کپڑے کا بھی اُس کو شوق نہ تھا نہ شان و شوکت دکھانے کا حوصلہ تھا۔ اُس کو چھپا کے نیکی کرنے کا دلی شوق تھا۔ کسی کو ننگا بھوکا نہیں دیکھ سکتی تھی مگر کھلم کھلا دینے کی اگر اُس کو

اجازت ہوتی یا اُس کی والدہ کی مصلحت کے خلاف نہ ہوتا تو گھر کے نوکروں کو وہ اتنا دیتی کہ سب اسی کا کلمہ بھرتے۔ جعفری کا کام چھوڑ کے اُس کا کام کرتے مگر یہ اس کو منظور نہ تھا۔

جعفری کو ملانے کی اُس نے از حد کوشش کی وہ کہتی تھی کہ جعفری سے میل کئے بغیر وہ اس گھر میں خوش نہیں رہ سکتی، دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر جعفری کے دل میں خناس گھسا ہوا تھا نہ نکلا پر نہ نکلا۔ اسی کوشش کے سلسلہ میں ایک مرتبہ جعفری اپنی ایک رشتہ کی پھوپی کے گھر مہمان جانے والی تھی۔ اختری نے منت سے کہا باجی اچھی باجی مجھ کو بھی لیتی چلو بارے جعفری بھی کچھ نیکی کے دم میں راضی ہو گئی۔

دونوں لڑکیوں نے نہا کے کپڑے بدلے، جعفری کا لباس پھولام اطلس کا پاجامہ کریب کا دوپٹہ بھاری کرن، جامہ وار کا شلوکہ بیلدار، اختری کا لباس سادہ تھا سفید ریشمی نین سکھ کا پاجامہ بہت ہلکا رنگا ہوا، جنگلی باڑی کا دوپٹہ سادی کرن، جعفری گہنا بھی بھاری پہنے تھی جڑاؤ پتے بالیاں، کانوں میں ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے پاؤں میں پازیب چھاگل، گلے میں سونے کی ہیکل گلے تمسون کا طوق۔ اختری کے ہاتھ گلے میں کچھ نہ تھا۔ صرف کانوں میں زمرد کے آویزے پڑے تھے۔ نادری نے یہ خیال کر کے اختری کے پاس گہنا نہیں ہے اپنا گہنا پہنا کے بھیجنا چاہا۔ پیچھے پڑ گئیں مگر اختری نے کسی طرح منظور نہ کیا اختری ضدن نہ تھی نہ بے سمجھے بوجھے بات بات پر اڑ جانے کی خو تھی لیکن قول کی پوری تھی جو ایک مرتبہ سوچ سمجھ کے کہدیا گویا پتھر کی لکیر تھی، اس کو مزاج کا استقلال کہتے ہیں۔ اس کی اس خصلت سے چند روز رہنے کے بعد سب کو اطلاع ہو گئی تھی، اس لئے سب اُس کو اُس کی خوشی پر چھوڑ دیتے تھے۔

دونوں بہنوں کو خیال تھا کہ اختری کے پاس گہنا نہیں ہے، اگر کہیں اُس کے زیور کا صندوقچہ جو مقفل پڑا تھا اور برسوں اُس کے قفل کھولنے کی ضرورت نہیں ہوئی، یہ لوگ دیکھ لیتے تو پھر گہنے کا نام نہ لیتے، وہ کون سا زیور تھا جو دوہرا دوہرا تہرا تہرا اُس کے پاس نہ تھا۔ ہر عدد قیمتی جڑاؤ، اُس کے زیور کا تخمینہ پچاس ہزار سے کم نہ تھا۔ اِسوقت جعفری اُس کو غریب سمجھے ہوئے تھی اُسکو یہ بھی خبر نہ تھی کہ اُس کے صرف بُندے جعفری اور نادری دونوں کے پورے زیوروں سے زیادہ قیمتی تھے۔ خیر اسوقت تو جعفری کو اپنے گہنے اور لباس پر فخر تھا۔ لیکن ایک تو وہ قدرتی حسین تھی، دوسرے نیکی نے ایسا نور اُس کے چہرے کو بخشا تھا کہ جعفری اپنے مقابلہ میں اپنے آپ کو حقیر سمجھ رہی تھی۔ اُس کے اس سادہ پن میں وہ شان تھی کہ جو اُس کو ایک نظر دیکھتا سمجھ لیتا کہ کوئی امیرزادی ہے۔ اُس کی رفتار گفتار میں کہیں چھچھورے پن کا شائبہ نہ تھا تکلف یہ تھا کہ تمکنت اور غرور بھی اصلاً نہیں پایا جاتا تھا۔ غضب کا بھولاپن تھا۔ مگر وہ بھولاپن نہیں جسکو حماقت کہتے ہیں بلکہ دنیا کے مکر فریب سے بے خبر ہونا ہوشیاری چالاکی اُس سے دُور تھی لیکن نیکی کے ساتھ جو ذہانت متانت اور اقبال مندی کے آثار ہوتے ہیں وہ اُس کے ہر انداز سے پیدا تھے۔ وہ حکومت کرنے کو پیدا ہوئی ہے کسی کی محکوم نہ رہیگی اُس کے آگے لوگ ہاتھ پھیلاتے رہیں گے اُس کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

قریب شام دونوں لڑکیاں سعادت گنج میں مرزائی بیگم جعفری کی پھوپھی کے مکان میں پہنچیں، اختری کو مرزائی بیگم نے دیکھا نہ تھا لیکن اُس کے خورشید مرزا کی بے باک ہونے کا حال اُن کو معلوم ہوگیا تھا۔ مرزائی بیگم نے دونوں لڑکیوں کو گلے لگایا مختصر حالات دریافت کئے۔

مرزائی بیگم کے دو بچے ایک لڑکا کوئی سات برس کا دوسری لڑکی ۵ برس کی، یہ دونوں بچے بہت پیارے تھے جب یہ دونوں سواریاں آئیں وہ دونوں بھی قریب آ گئے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی اور کے بھی آنے کی اُن کو توقع تھی۔ بات یہ تھی کہ جعفری تو ہمیشہ کی اکل کھری تھی اور سب سے اُکھڑا کا ہی انداز تھا لیکن نادری کے مزاج کا حال ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بڑی ملنسار عموماً ہر بچہ سے خصوصاً ان دونوں بچوں سے اس کو خاص محبت تھی کبھی خاص ان کی خاطر سے پھوپھی کے مکان پر آتی اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتی، کئی کئی دن تک ساتھ رکھتی، ہر چند جعفری بیگم کے خلاف ہوتا مگر وہ ٹال جاتی، اب بہت دن سے نادری کا آنا نہیں ہوا تھا۔ جب سے اختری آئی تھی اور جعفری کی بے رُخی اختری کی طرف سے دیکھی تھی اور کچھ اختری کے ملال کا بہت خیال تھا۔ ہر وقت اُسی کے ساتھ رہتی تھی اور اس کا دل بہلاتی رہتی تھی۔ جعفری بیگم کبھی پھوپی کے پاس نہ جاتی تھیں مگر مرزائی بیگم نے جعفری سے کچھ روپیہ قرض لیا تھا خاص اُس کے تقاضے کے لئے گئی تھی۔ اختری کو اس کا حال معلوم نہ تھا۔ جعفری نے رات کو تو کچھ نہ کہا دوسرے دن صبح کو روپیوں تقاضہ کیا اور اس طرح کہ اختری پر بھی یہ حال کھل گیا۔ مرزائی بیگم بیچاری کے پاس روپیہ نہ تھا حیلہ حوالہ کرنے لگیں۔ دونوں بچوں کو اس جھگڑے کی تو خبر نہ تھی، نادری کو بار بار پوچھتے تھے۔

لڑکا۔ چھوٹی باجی نہیں آئیں۔

لڑکی۔ اب وہ کہاں آتی ہیں۔ برسوں ہو گئے (اس چھوٹی لڑکی کا برسوں چھ مہینے سے زیادہ نہ تھا)۔

اختری نے اپنی ہر دلعزیزی یہاں بھی ظاہر کر دی۔ مرزائی بیگم کو کہیں اتفاق سے اکیلا پا کے، اے بیجئے پھوپھی اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو یہ دس دس روپے کے دو

نوٹ میرے پاس ہیں جعفری باجی کو دیدیجئے، مگر اُن سے نہ کہیے گا، کہ میں نے دیئے ہیں، مرزائی بیگم اختری کی یہ مروت یہ فیاضی دیکھ کے دنگ ہوگئیں۔

مرزائی بیگم پھر بیٹا خدا جانے تم کو کب ضرورت ہو اُس وقت میرے پاس روپیہ نہ ہو تو تم کو تکلیف ہوگی، مرزائی بیگم کو کیا معلوم تھا کہ اختری کو ایسے ایسے بیس روپیہ کے واپس لینے کی ہرگز ضرورت نہ ہوگی۔ اگر اختری کو مرزائی بیگم کے ملال خیال نہ ہوتا تو شاید وہ اسی وقت کہدیتی کہ واپس دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کو خیال تھا کہ مرزائی بیگم کی غیرت شاید اس بار احسان کو قبول نہ کرے، اختری نے دبی زبان سے کہا نہیں مجھ کو اس کی ابھی ضرورت نہیں ہے جب آپ کے پاس ہونگے دیدیجئے گا۔ جب آپ جعفری نادری کی پھوپھی ہیں تو آخر میری بھی کوئی ہوئیں۔ مرزائی بیگم نے اس قرض حسنہ کو بخوشی منظور کیا، دل سے دُعا نکلی۔

مرزائی بیگم کے میاں نواب مرزا مصوری کا کام کرتے تھے، اگلے مصوروں میں تھے مگر اب عکس کشی پر بسر اوقات تھی، بیوی سے اختری کی نیک دلی اور فیاضی کا حال سُن کے اُن کو بھی اِس نے بالک لڑکی کا خیال پیدا ہوا۔ اختری کی رغبت تصویروں کی طرف دیکھ کے اُنھوں نے بہت سی قلمی اور عکسی تصویریں اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی اختری کو دکھائیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کے اختری کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی عکسی تصویر ماں کی موجود تھی۔ ہاں جعفری سے شاید اس نے سُن لیا تھا کہ پھوپھا تصویر بناتے ہیں اسی لئے ساتھ لیتی آئی تھی۔ بہرصورت اختری کو یہ خیال ضرور آیا تھا کہ غیر مرد کو ماں کی تصویر دکھاؤں یا نہ دکھاؤں۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تمام پردہ ستر جیسے جی کا ہے وہ تو اب ایسے پردہ میں ہیں کہ تاقیامت اُن کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ تصویر کا پردہ

ایک مہمل خیال ہے۔ ظاہر ہے کہ اختری کوئی مجتہد نہ تھی جو صحیح رائے قائم کر سکتی ماں کی محبت نے اس کو یہی فتویٰ دیا کہ اس سے بہتر موقعہ نہ ملے گا۔ اماں جان کی بڑی سی تصویر قلمی رنگین لباس اور زیور کے ساتھ زندگی بھر اُن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے رکھے گی۔ آخر اس نے نواب مرزا سے چپکے چپکے بات چیت طے کی، تصویر نکال کے دی؛ ڈھائی سو روپیہ پر فیصلہ کیا۔ نواب مرزا صاحب نے دو مہینہ کی مہلت چاہی۔ اب روپیہ کے پہنچانے کی دقت تھی، اختری نے وعدہ کیا کہ گھر جا کے میں سوا سو روپیہ آپ کو دوں گی۔ اس کے سوا اور بھی میرا ایک کام ہے مگر ابھی اُس کا موقعہ نہیں ہے جاڑے کے بعد میں آپ کو پتہ دے کے پہاڑ پہ بھیجوں گی اور اماں جان جہاں دفن ہیں اُس جگہ کی ایک تصویر آپ سے بنواؤں گی

ظاہر ہے کہ ان معاملات سے نواب مرزا کو اختری کی خفیہ مقدرت کا کچھ حال معلوم ہو گیا ہو گا۔ اس کے بعد میاں بیوی میں جو باتیں ہوئی ہیں یہ ہیں :-

نواب مرزا۔ (بیوی سے) یہ لڑکی اختری جسکو بھائی خورشید مرزا نے اپنے گھر میں رکھا ہے کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں معلوم ہوتی۔ اول تو اُس کی شکل صورت پر امیرانہ پن ہے دوسرے بھائی خورشید مرزا کے پاس ایسی کہاں دولت پھٹ پڑی ہے کہ وہ لے پالک لڑکی کو سینکڑوں ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کو دے سکیں۔

مرزائی بیگم۔ میں نے تو صورت دیکھتے ہی کہدیا تھا کہ کوئی بڑے گھرانے کی صاحبزادی ہے۔ خدا جانے بیچاری پر کیا مصیبت پڑی جو پرائے گھر میں آکے پڑی ہے اور سُنا تم نے بی جعفری اس کو اپنے باپ کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا سمجھ کے ہر وقت کوستی رہتی ہیں۔ سچ کہوں مجھکو تو بُرا معلوم ہوا بلکہ میں نے دو ایک دفعہ ٹوکا بھی میرے تو جی میں آیا تھا کہدوں کہ ایک تم بھتیجی ہو کہ بیس روپے کے لئے ڈولی پر چڑھ کے تقاضے کے لئے دوڑی آئیں۔ تم سے تو یہ غیر لڑکی اچھی کہ کبھی کی جان نہ پہچان بیس روپیہ کھٹ سے

نکال کے پھینک دیئے مگر کیا کہوں اُس نے قسمیں ایسی دیدی تھیں کہ کسی سے نہ کہیئے گا۔

نواب مرزا۔ تو کیا تم کو اُس نے بیس روپے دیدیئے۔

مرزائی بیگم۔ یوں سمجھو کہ دے ہی دئے۔ یہ بھی اس کی انسانیت ہے کہ قرض کے نام سے دئے پھر قیامت کا وعدہ جب چاہے گا دیدیجئے گا۔ یہ روپیہ آپ اپنا ہی سمجھئے گویا اشارہ کنایہ سے یہ کہا کہ ان کے پھیرنے کی ضرورت نہ ہوگی، اب کیا میں ایسی بچہ ہوں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتی۔

نواب مرزا۔ اور بی جعفری اپنے گہنے پاتے پر کیسی اتراتی ہیں۔ اختری کے کانوں میں جو دو آویزے پڑے تھے وہ بھی تم نے دیکھے۔

مرزائی بیگم۔ ہاں قیمتی ہوں گے۔ اتنا تو میں بھی سمجھ گئی۔

نواب مرزا۔ جی ڈھائی ہزار سے کم کا جوڑ نہیں ہے۔ ابھی ان دونوں میں جب میں راجہ صاحب کے تعلقہ پر گیا تھا۔ دو بندے زمرد کے بکنے کو آئے تھے اُس کے زمرد اُس سے ذرا چھوٹے تھے۔ جوہری تین ہزار مانگتا تھا۔ میں نے تو اسی خیال سے اختری کے کان سے اُتروا کے دیکھے۔ جوہری کے بندوں سے بڑے اور زمرد اس کے بہت رنگین ہیں، اُن کا رنگ ایسا نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ڈھائی ہزار کہے ہیں۔ میرے خیال میں تو کوئی آنکھ بند کر کے بیچے تو ڈھائی ہزار چھوٹتے ہی جوہری دیدیگا۔ اور وہ پانچ ہزار کو کسی سرکار میں لگادے گا۔ بی جعفری کا سارا گہنا پانچسو چھ سو سے بڑھ کے نہ ہوگا اُس پر پنجوں کے بل چلتی ہیں۔ گھر پر تو میں نے کبھی پہنے نہیں دیکھا۔ یہاں ہم کو شان و شوکت دکھانے آئی تھیں۔ اسی طرح بیس روپیہ مانگے کہ مجھکو سخت ناگوار ہوا لڑکی بڑی ابتری ہے اس سے چھوٹی بہن لاکھ درجے اچھی ہے۔ اُس کی صورت پر بھولا پن ہے۔ آنکھ میں سیل ہے۔

مرزائی بیگم۔ یہ تو کہو اختری سے تم بھی تو کچھ چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں کیا

کہتی تھی۔

نواب مرزا ۔ ماں کی عکسی تصویر دی ہے۔ رنگین بڑی تصویر بنوائی ہے اور جاڑے کے بعد پہاڑ پر بھیجنے کو کہہ گئی ہے۔ تصویر کا معاملہ ڈھائی سو روپیہ ٹھہرا ہے آدھے روپئے پہلے دینے کہے ہیں۔

مرزائی بیگم ۔ یہ روپیہ کس طرح ملیں گے۔

نواب مرزا ۔ کہا ہے جس دن آپ وہاں آئیے گا۔ چک دوں گی یا نوٹ۔

مرزائی بیگم ۔ یہ لڑکی ضرور مالدار ہے۔ یہ بھی بھائی صاحب کی خوش قسمتی ہے معلوم ہوتا ہے مال ہاتھ میں ہاتھ دے گئی ہے۔ آہاہ ائے لو بات میں بات نکل آئی۔ بھیا کی بچپنے میں کہیں شادی ٹھہری تھی ہو نہ ہو وہی سلسلہ ہو ۔ یہ خورشید بیگم کی لڑکی نہ ہو تصویر کی پشت پر بھی یہ نام تھا۔

نواب مرزا ۔ اچھا تو اس سے ہم کو کیا۔ میں تو سچ کہتی ہوں مجھے تو یہ لڑکی بہت ہی اچھی معلوم ہوتی اور مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا اس کے کسی کام میں کوتاہی نہ کروں گا۔

مرزائی بیگم ۔ نہیں صاحب، تم کبھی کبھی جا کے دیکھ آیا کرو۔

نواب مرزا ۔ یہ میں نے پہلے ہی سمجھ لیا ہے، خورشید مرزا صاف دل کے آدمی ہیں یہ جعفری خدا جانے کس پر پڑی ہے۔ اکل کھری جگ سے بُری۔ خورشید مرزا کو میری نسبت کوئی شک نہیں ہو سکتا، وہ مجھ کو خوب جانتے ہیں کہ میں غریب ہوں مگر کبھی میں نے کسی کے مال پر دانہیں کی نہ کسی کا آجتک روپیہ کا شرمندہ ہوں ہاں اس امیرزادی کی غربت ملنساری بھولے پن اور دل کی فیاضی نے میرا دل کھینچ لیا، یہ بھی اس کی نیکی تھی کہ ماں کی تصویر مجھ سے بنوائی، ایسی کیا ضرورت تھی، یہ ایک طور سے احسان کرنا تھا اور اس طرح احسان کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ ڈھائی سو جس کام کے

لئے دئے ہیں زیادہ سے زیادہ سو روپے کا کام ہے۔ میں نے یوں ہی دل دیکھنے کو ڈھائی سو کہے تھے اُس نے میرے منہ سے نکلتے ہی منظور کر لئے، پھر میں نے خود گھٹانا چاہا مگر اُس نے اس بہانے سے کہ میں اوّل درجہ کا کام چاہتی ہوں۔ جیسا روپیہ دیا جائے گا ویسا ہی کام ہوگا۔ اتنے سے سن میں یہ رئیسانہ خیال بے شک کوئی خاندانی رئیس زادی ہے۔ اس لڑکی نے اگلے رئیسوں کا سا دل پایا ہے۔

مرزائی بیگم ۔ چلتے چلتے پانچ روپیہ بچوں کو مٹھائی کے نام سے دے گئی۔ ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے یہ لڑکی محبت کی بھوکی ہے۔ یہاں کچھ اکیلی سی پڑ گئی ہے ۔ اُس کا جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو اپنا بنالوں یہ بھی تم نے دیکھا آنکھ میں موہنی ہے۔ یہ جسکو ایک نظر دیکھ لے گی اپنا گرویدہ بنالے گی۔

اچھا تو اب اُس کی خوشی ہے اُس کی ماں کی تصویر دل لگا کے بنا دو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کیسی تصویر ہے۔ کس کی تصویر ہے۔ تصویر (دیکھ کے) کچھ خواب سا یاد آتا ہے بے شک خورشید کی تصویر ہے۔ ذرا پھر دیکھوں۔ پھر غور سے دیکھ کے۔ ہاں میاں کو تصویر کا ایک نشان دکھا کے۔ یہ کیا ہے اس طرف گال پر۔

نواب مرزا۔ مسّا ہے یا بڑا سا تِل ہے۔

مرزائی بیگم ۔ ہاں، ہاں خورشید بیگم، ضرور خورشید بیگم ۔ میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ جب اماں جان زندہ تھیں ۔ اچھا تو اب مجھ پر سارا حال کھل گیا۔

نواب مرزا۔ خدا کے لئے کسی کے آگے نہ لے بیٹھنا، خدا جانے کس مصلحت سے یہ بھید چھپایا گیا ہے ۔ ہم کیوں ظاہر کریں۔

مرزائی بیگم۔ کیا مجھے تم نے دیوانہ بنایا ہے، میں ایسی پیٹ کی ہلکی نہیں ہوں۔ شاید چھپانا ہی بہتر ہو کوئی اور دعویدار نہ ہو، شاید ظاہر ہونے میں اس بن ماں باوا کی بچی پر کوئی آفت آجائے، بھلا میں کہوں گی۔ میری زبان سے آدھی بات نکلے تو زبان

کاٹ ڈالا۔ سب ایک طرف اُس نے مجھکو قسمیں دی ہیں کہ ذرا سی بات کسی سے نہ کہنے کا
اس میں مجھکو نقصان پہنچے گا۔ اگر کہتی بھی تو اب کبھی نہ کہوں گی ہیں کیا۔ آم کھانے سے
غرض ہے یا پیڑ گننے سے، خدا کرے جیتی رہے اور نصیب اچھا ہو۔

نواب مرزا۔ ہا، یہ نہ کہو، آم کھانے سے بھی غرض نہ ہو تو بھی پیڑ نہ گننا چاہئے
کسی کے راز انکشاف گناہِ عظیم ہے۔

مرزائی بیگم۔ تم مجھ سے خاطر جمع رکھو۔ تو پھر آج آجاؤ۔ مرزائی بیگم کو
سوا سو روپیہ ملنے کی جلدی تھی،

نواب مرزا۔ ذرا صبر کرو، آج کل نہیں۔ اس طرح کہ ابھی کل دونوں لڑکیاں
گئی ہیں، میں جاؤں گا تو لوگ چرچا کریں گے۔

مرزائی بیگم۔ ہاں، سچ ہے خصوصاً یہ جعفری آفت کی بنی ہوئی ہے، خدا
جانے کیا خیال کرے۔

نواب مرزا۔ کوئی کچھ خیال کرے۔ میں آج کے چوتھے دن جمعہ کی نماز سے
ہو کے جاؤں گا۔

# باب ٦

## ہُرمزی

خورشید مرزا کے مکان کے پچھواڑے، میر کاظم حسین زردوز کا مکان تھا، کچا یک منزلہ صرف ایک دالان اُس کے آگے چھپّر سامنے ڈیوڑھی باورچی خانہ۔ انگنائی بھی بہت بڑی نہ تھی، کچی چھت پُرانا چھپّر جو تھوڑی سی بارش سے ٹپکنے لگتا ہے میر صاحب ایک بیوہ زینب بیگم اور ایک لڑکی ہرمزی چھوڑ کے انتقال کر گئے تھے۔ زینب بیگم نے سلائی کر کے لڑکی کو پرورش کیا۔ خلاف دستور لڑکی کو اسکول میں پڑھنے کو بھیجا اِس پہ محلہ والوں نے بڑا چرچہ کیا مگر زینب بیگم نے کسی کی نہ سُنی، بن باپ کی لڑکی تھی بسر اوقات کوئی سبیل نہ تھی خیال کیا کہ اگر لڑکی پڑھ جائے گی تو کہیں اسکول میں پڑھانے پر نوکر ہو جائے گی۔ اس کی جوانی اور میرا رنڈاپا کسی نہ کسی طرح کٹ جائے گا۔ عزیز کنبہ میں لڑکیوں کی شادی ہوتے دیکھ کے شادی سے اُس کا دِل بھر گیا تھا۔ یہاں تو کچھ دینے کو نہ تھا۔ جو لڑکیاں بھاری جہیز لے کے بیاہی گئیں اُن میں سے کئی ایک کا انجام یہ ہوا کہ شوہر صاحب بد وضع نکلے۔ سارا جہیز چار دِن میں بیچ کے رنڈیوں کو کھلا دیا جب کچھ نہ رہا بیوی کو بھی میکے کا راستہ بتایا خود شہر سے فرار ہو گئے۔ اگر شہر ہی میں رہے شہدوں کے ساتھ ہاتھ میں لٹھ لئے خاص کٹنے ماروں کی شکل اِدھر اُدھر پُلس کی آنکھ بچا کے اینڈتے پھرتے ہیں کسی غریب کو ردیہ بھُناتے دیکھا جا کھڑے ہوئے۔

حضت وہ کل والے پیسے تو دلوائیے۔ روپیہ بھنانے والا حیران کہ پیسے کیسے جی آپ بھول گئے۔ کل یوسف بیگ کے جوئے پر قرض لئے تھے۔ چار راہ گیر جمع ہو گئے، کسی نے سچ جانا کسی نے جھوٹ، آخر انھیں کے ساتھ والے گرگوں میں سے ایک نے سمجھایا حضت یہ بڑا شہدا ہے، کچھ دے کے جان چھڑائیے۔ غرض دس آنے پر فیصلہ ہوا کوئی راہ گلی میں اکیلا مل گیا چادر اتروا لیا۔ کپڑے چھین لیے۔ کہیں گرفتار ہو گئے تو جیل خانہ آباد کیا، غرضکہ شریف بھلے آدمیوں کی اولاد نے یہ شیوے اختیار کئے ہیں ہُشت ہشت جوتی پیزار کے قابل، اور کوئی ہنر آتا نہیں محنت ہو نہیں سکتی، پھر جوانی کی بے اعتدالیوں سے مہلک امراض میں مبتلا، گٹھیا کا عارضہ لنجے اپاہج بھیک مانگنے لگے۔ اور بھی بہت سے طریقے پیٹ پالنے کے ایسے ہیں جس میں محنت نہ ہو اور صبح سے شام بلکہ آدھی رات تک بارہ آنے روپیہ مل جائے مگر ایسے پیشوں کے ذکر سے ہم پرہیز کرتے ہیں، انھیں باتوں سے لکھنؤ بدنام ہو گیا۔ اب کچھ دنوں سے اچھی آمدنی کا پیشہ اِکّے ہنکانا خواہ اپنا ذاتی ہو خواہ کسی کی نوکری، اس میں اچھی آمدنی ہے، چڑھے چڑھے پھرتے ہیں اکثر اِکّہ والوں کو گانے کا شوق ہے تو وہ دن رات گا رہے ہیں اُن میں سے بعض خوش آواز بھی ہیں، اس کے سوا درزی کا کام، بوٹ سازی، بہت چلتے ہوئے کام ہیں، چکن کامدانی زردوزی کا رواج اب نہیں رہا۔ پھر بھی بڑی مشقت سے صبح سے شام تک چار آنہ ملے، اگر چنڈو کا شوق ہے تین آنہ کا چنڈو پیا، ایک آنہ کی روٹی نان بائی کی دوکان پر اکڑو بیٹھ کے کھالی، غرضکہ شریف گردی کا زمانہ ہے اور یہ سب اپنے ہاتھوں کسی قسم کی تعلیم نہیں اچھی صحبت نہیں پھر بنے تو کیوں کر بنے انھیں بھیک مانگنے والوں میں وہ لوگ ہیں جن کے بزرگ برسرِ حکومت تھے۔

انھیں خیالات سے زینب بیگم نے لڑکی کی شادی نہیں کی، اب وہ کسی اسکول

ہیں دس روپیہ ماہوار پاتی تھے ٹیچرجی کہلاتی تھے، ماں مدت ہوئی آنکھوں نے جواب دیدیا، سوئی کا ناکہ نہیں سوجھتا۔ ٹانکے نہیں دکھائی دیتے، دوسرے فالج کے گرنے دونوں پاؤں رہ گئے۔ چارپائی پر اکیلی پڑی رہتی ہیں۔ پانچ بجے کے قریب۔ بیٹی کی ڈولی اسکول سے آئی، دال پکائی چپاتیاں توے پر ڈالی گئیں۔ ماں کو کھلاتی گئی پھر جب پکا چکی خود بھی کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کرکے سو رہی پھر صبح سے اٹھی نماز پڑھی سویرے سے دال خشکا چپاتیاں تیار کردیں۔ ماں کو کھلائیں خود کھائیں۔ اتنے میں اسکول سے ڈولی آئی، ٹیچرجی چلو، ٹیچرجی روانہ ہوئیں پھر وہی پانچ بجے آئیں زینب بیگم اکیلی پڑے پڑے پلنگ کے بان توڑا کرتی تھے۔ کیا بُری زندگی ہے مگر شریف خاندان سادات عالی نسب شکایت سے لب آشنا نہیں ہر وقت تقویٰ عبادت کی فکر نماز روزہ کا ذکر جو حال ہے بہت خوب ہے نہ اس سے ترقی کی اُمید ہے نہ خدا کی رحمت سے تنزل کا خوف لڑکی کے دم کا سہارا، خدا اس کو جیتا رکھے بلکہ میری زندگی بھی اُسی کو جائے، ہرمزی نہ ہوتی تو اب تک خیرات خانہ میں ہوتی یا کسی سڑک پر اکسے کچل کے مری پڑی ہوتی۔ اب آرزو ہے کہ ہرمزی کے ہاتھوں میری مٹی سوارت ہوجائے۔

ایک دن سرِشام اختری نادری کے ساتھ کوٹھے پر چڑھی۔ ایک طرف مونکھا تھا اس میں سے سر نکال کے نادری نے کسی کو سلام کیا، کسی نے دُعا دی جیتی رہو۔ نادری نے پوچھا ہرمزی تو اچھی ہیں جواب ملا ہاں اچھی ہے۔

نادری۔ کہاں ہیں؟ جواب۔ اسکول گئی ہیں۔ کب آئیں گی؟ جواب۔ وہی چار بجے کے بعد۔ اب اختری کو اشتیاق ہوا۔ نادری سے کہا، بہن میں بھی دیکھوں کس سے باتیں کرتی ہو۔ نادری نے زینب بیگم سے بطور خود تعارف کیا۔ اس طرح ایک ایک ہماری بہن ہیں وہ بھی آپ کو تسلیم کرتی ہیں۔

زینب بیگم۔ کیا جعفری کے سوا کوئی اور بہن ہیں۔ یہ کون سی بہن ہیں۔
نادری۔ یہ ابا جان کے رشتہ کی کوئی بہن تھیں اُن کی بیٹی ہیں۔ اب ہمارے ہی ساتھ رہتی ہیں۔

آخر اختری بیگم نے مونکھے سے منہ ڈال کے زینب بیگم سے خود بات چیت کی۔ اتنے میں ہرمزی بھی آگئیں۔ اختری سے فوری جان پہچان ہوگئی۔

اختری۔ (ہرمزی سے) بہن ہمارے گھر میں آؤ گی۔

اس بلانے میں فی الجملہ تفوق پایا جاتا تھا غریب آدمی جن میں غیرت کا مادہ ہوتا ہے ذرا نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ہرمزی نے جواب دیا جو ہمارے گھر میں آتا ہے ہم بھی اس کے گھر میں جاتے ہیں۔ یوں آپ ہی آپ کسی کے گھر پر دوڑ کے جانا اپنی ذلت اور دوسرے کو تکلیف دینا ہے۔

اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس ٹکرا سا توڑ کے ہاتھ پر رکھ دینے سے برا مان جاتا اور پھر کبھی ان لڑکیوں میں میل جول نہ ہوتا۔ اختری بات کا پہلو سمجھ گئی۔ نہایت عاجزانہ لہجہ میں جواب دیا۔

اختری۔ تو کیا بہن ہم کو تمہارے گھر پر آنے میں کوئی عذر ہے۔ میں سر آنکھوں سے آؤں گی اچھا تو جب میں پہلے آؤں گی پھر تو آؤ گی۔

اختری محبت کی بھوکی تھی وہ سمجھ گئی کہ ان غریبوں سے میری اچھی نبھے گی۔

ہرمزی۔ کیوں نہیں، ہرمزی کو ایسے جواب کی توقع نہ تھی، وہ اپنے غریبی کسی کو دکھانا پسند نہیں کرتی تھی۔ اسی لئے اس نے ایسا جواب دیدیا تھا جس میں یہ آمد و رفت کا سلسلہ کبھی نہ جاری ہو۔ اور اب بھی اس کو اس کی بہت کم توقع تھی۔ وہ جعفری کو جانتی تھی کہ اُس کو اپنے باپ کی دولت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ اگرچہ وہ اُس کے ساتھ کی کھیلی ہوئی اور شاید کچھ دنوں ایک ہی اُستانی سے پڑھا بھی تھا۔ یہ جب کا

ذکر ہے جب وہ اسکول میں نہیں داخل ہوئی تھی، ہرمزی کے اسکول میں داخل ہونے کے بعد آمد ورفت کا سلسلہ بند ہوگیا تھا۔ اس لئے کہ خورشید مرزا اور لوگوں کی طرح ہرمزی کے اسکول میں بھیجنے کے خلاف نہ تھے بلکہ کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی مگر ہرمزی کے چال چلن سے بہت خوش تھے۔ اس کے امتحانوں میں کامیاب ہونے انعام پانے، مڈل پاس کرنے، نوکر ہوجانے کا حال معلوم تھا، مڈل اس زمانہ میں چھوٹی فضیلت کا درجہ مانا گیا تھا۔ لڑکیوں کا کیا ذکر، محلہ کے مسلمان لڑکوں میں سے ڈو ہی ایک اس درجہ تک بھی پہنچتے تھے باقی سب ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول چھوڑ کے آوارہ پھرنے لگے تھے۔ اس لڑکی کا مڈل پاس کرنا ایک تعجب کی بات تھی۔ خورشید مرزا ہرمزی کو کوئی چیز سمجھتے تھے مگر صرف ڈیڑھ روپیہ کی نوکری سے جو کہ اُن کے نزدیک ایسی پڑھی لکھی لڑکی کے لئے بہت ہی کم تھے۔ اُن کی نظر میں نسوانی تعلیم کی وقعت کم ہوگئی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے خصوصاً اپنی لڑکیوں کو سنا کے۔

خورشید مرزا۔ ہرمزی بڑی لائق ہے۔ اُس نے اپنی ماں کو خوب سنبھال لیا۔ اگر یہ لڑکی نہ ہوتی تو زینب بیگم بیچاری کی کون خبر گیری کرتا۔ مشکل یہ ہے کہ وہ کسی کا احسان بھی تو نہیں اٹھانا چاہتی۔ یہ شرافت ہے، تیسرا فاقہ ہو تو بھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ کیا کہنا سیدانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

خورشید مرزا کی دونوں لڑکیوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا خصوصاً جعفری تو صرف روپیہ کی لالچی تھی، چمڑی جائے دمڑی نہ جائے، اگرچہ جزرسی بلکہ خست عورت کی صفت ہے تو اس صفت میں جعفری بے مثل تھی۔

خورشید مرزا ہرمزی سے میل جول پسند کرتے تھے بلکہ جعفری نے جو محلہ کے کم ظرف کمینوں چھوٹے درجہ کی لڑکیوں سے ملنا شروع کیا تھا، وہ خورشید مرزا کو ازحد ناگوار تھا۔ جعفری نے اس نے ان لڑکیوں سے میل کیا تھا کہ سودا سلف ان کے ذریعہ

سے ہوتا تھا، نظیرن، الہ بخش کنجڑے کی لڑکی سے ترکاری بہت سستی ملتی ہے۔ نفیسن قلعی گر کی لڑکی دو پیسہ پہ چھوٹی پتیلی اپنے باپ سے قلعی کرالائی، کریمن منہار کی بڑی کی عید کے دن وہ جوڑا پہنا گئی جواو۔ چوڑی والیاں چار آنے سے کم کو نہ دیتیں۔ غرضکہ اسی قسم کے ذلیل خیالات، سے ان چھوکریوں کو لگا رکھا تھا، ایک فائدہ اُن سے یہ تھا کہ ماما اصیلوں کی چوریاں یہ لڑکی خوب کھولتی تھیں۔ کیتھ ڈلی میں تو اسمت نے ایک آنہ کتر لیا۔ کریمن سے معلوم ہوا وہ پنساری سے جا کے پوچھ آئی۔ اختری کی طبیعت ایسے کمینی صحبت میں کیا لگتی۔ وہ ایسی لڑکیوں کو دو چار آنہ انعام کے طریقے سے دیدینے کو بُرا نہیں سمجھتی تھی مگر یہ کہ وہ خاص کمرے میں اس کی مسہری کے پاس جا کے بیٹھیں اور گھُل مل کے باتیں ہوں۔ ہنسی مذاق ہو۔ ڈھول بجے گانا ہو یہ سب اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ المختصر ہر مرزی کو اپنی طبیعت کے موافق پا کے فوراً میل ہو گیا، زیادہ تر اُنکو زینب بیگم کی تنہائی پر ترس آتا تھا، خورشید مرزا کی اجازت عام ہو چکی تھی۔ یہ اکثر کھانا کھا کے وہیں چلی جاتی اور دن دن بھر رہتی، زینب بیگم کے دل سے دعا نکلتی تھی۔ اختری اکثر سلوک بھی کرتی رہی مگر اس خوبصورتی سے کہ غیرت دار آدمی کو ناگوار نہ ہو۔ اختری کے حمائتی رفتہ رفتہ ترقی کرتے جاتے تھے۔ جعفری کو یہ بھی شاق تھا۔

---

# باب ۶

اختری کا رانہ خورشید مرزا، حکیم جعفر علی، نواب مرزا مصور اور اُن کی بیوی، ان لوگوں پر کھلا ہوا تھا کم و بیش ان میں سے ہر شخص کو اختری کی مقدرت کا حال معلوم تھا، اگرچہ صحیح اندازہ کسی کو نہ تھا۔ ان کے سوا دو اور شخص تھے جن کو صرف اتنا معلوم تھا کہ خورشید مرزا کسی نہ کسی طرح سے زرِ کثیر پر تصرف رکھنے میں ان میں سے کسی کو یہ بھید نہیں بتایا گیا تھا۔ ایک شیخ احمد علی مختار عام خورشید مرزا صاحب کے یہ بڑے دیانت دار کار گذار شخص تھے، لیکن اب مدت سے صاحب فراش تھے اور جانبری کی کوئی امید نہ تھی۔ اُن کا بھتیجا مراد علی، اب چچا کا قائم مقام تھا، یہ بڑا چالاک تھا مگر کام میں بہت ہوشیار تھا۔ قانون رائج الوقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ مقدمہ تصنیف کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ یہ ہر وقت اُسی اُدھیڑ بن میں رہا کرتا تھا کوئی مقدمہ ایسا ملے جس میں جعل کی ضرورت ہو جھوٹی دستاویز بنا رکھی ہیں، خلاف واقعی شہادت بہم پہنچائی جائے جھوٹے گواہ بنائے، ان ناجائز کارروائیوں کو یہ بڑی دانشوری اور قابلیت خیال کرتا تھا۔ جب سے یہ اس سرکار میں دخیل ہوا تھا اُس نے بعض مقدمات میں ایسی کامیابی حاصل کی تھی کہ خورشید مرزا کو اس کی ذات پر پورا بھروسہ ہو گیا تھا اور شیخ احمد علی کی قدامت کے خیال نے بھی اُن کو اس کا بہت خیال تھا گویا کہ اب یہی مختار عام تھا۔ یہ دن رات اسی فکر میں رہتا تھا کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ نواب صاحب کی کل جائداد مکانات دو کانیں، ایک

موضع میں چھ گاؤں کا حصہ باغ پر امیسری نوٹ اِن سب سے واقف تھا، اگرچہ جائداد پر قرضہ کا بار عظیم بھاری سود پر نہ ہوتا تو ساڑھے تین سو روپے کی آمدنی تھی مگر سُود کے مَد میں نصف سے زیادہ منافع جاتا تھا، اس لیے خرچ کی تنگی تھی، مگر دستاویزوں کے بار بار اُلٹنے سے جو روپیہ ملتا رہتا تھا اُسی بدنظمی کے ٹھاٹھ تھے اس میں مراد علی کا نفع تھا اُسکو ہر دستاویز کے پلٹنے پر خاطر خواہ کمیشن ملتا رہتا تھا۔ مالک کو نقصان پہنچا کے اور مہاجنوں کا نفع کرا دینے سے بھی خفیہ رقمیں بطور رشوت مل جایا کرتی تھیں۔ تحمّر لطف یہ ہے کہ اُس نے اپنی ظاہری چال سے نواب صاحب کے دل پر اپنی ایمانداری کا نقش بٹھا رکھا تھا۔ نواب صاحب کا پورا مزاجدان تھا، ہر معاملہ میں دخیل تھا۔ یہاں تک گھر کا انتظام بھی اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خرید و فروخت اسی کی معرفت ہوتی تھی، بزاز سے لے کے کنجڑے قصاب تک سے اسی کے ہاتھوں سودا سلف ہوتا تھا اس میں انتہا کی خیرخواہی اور کفایت شعاری دکھاتا تھا۔ پیسہ پیسہ کا حساب نہایت سختی سے لیتا تھا۔ کمیشن تک جو ملتا تھا سرکار میں داخل کر دیتا تھا، پھر چاہے نواب صاحب اُس سے دو چند سہ چند سلوک کر دیں اور ایسا ہی ہوتا تھا غرضکہ اپنی چالاکی سے اُس نے نواب صاحب کو شیشہ میں اُتار لیا تھا۔ حکیم جعفر علی کی نسبت نادری سے قرار پا چکی تھی۔ وہ نواب صاحب کے داماد ہونے والے تھے وہ اس کی چالاکیوں سے کچھ کچھ واقف تھے۔ نواب صاحب کے گھر میں نہیں معلوم کس وجہ سے نادری کو اُس کے نام سے نفرت تھی۔ اُس نے اختری کو بھی کسی حد تک اُس سے بدگمان کر دیا تھا مگر یہ بدگمانی کسی وجہ معقول سے نہ تھی مثلاً نادری کہتی تھی اختری سے میں کیا کہوں مجھے تو اس موئے کی آواز سے ڈر لگتا ہے۔ اختری، آخر کیوں؟ نادری خدا جانے دیکھو تو چال کس طرح چلتا ہے۔ دبے دبے جیسے بر قنداز۔ نادری، اس مردے کی شکل پر خرانٹ پن برستا ہے۔

ناظرین ہم نہیں کہہ سکتے کہ نادری کی نفرت کا کیا سبب تھا سوا اس کے کہ نیک طبیعتیں دلوں کا آئینہ ہوتی ہیں، نیک باطن بد باطنوں سے اور ایماندار بے ایمانوں سے اور ایماندار بے ایمانوں سے قدرتاً کھٹکتے ہیں۔ مگر ان گھر کی بیٹھنے والی لڑکیوں کو اس مختار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ دل کی نیک تھیں، جعفری اُس کی لیاقت کی قابل تھی وہ جُزرسی اُس کی ایسی صفت تھی جس سے جعفری اُس سے خوش تھیں۔

شیخ احمد علی مختار کے ایک اور بھائی تھے، شیخ محمد علی، وہ خورشید مرزا کے گاؤں پر تحصیلدار تھے۔ یہ لڑکا اُنھیں کا تھا، سات آٹھ برس کا تھا جب باپ نے انتقال کیا، ماں پہلے مر چکی تھی اُسی سن سے چچا اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے تھے اُسی زمانہ سے یہ نواب صاحب کے محل میں آتا جاتا تھا گویا اسی گھر کے ٹکڑوں پر پرورش ہوئی تھی اس لیے اس سے کچھ ایسا گہرا پردہ بھی نہ تھا۔ ؎

دیتے ہیں ٹکڑے کی طرح صاف جواب
اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

یہ تو اس کی کیا مجال تھی کہ ٹکڑے کی طرح توڑ کے جواب دیتا مگر نمک حرامی میں کوئی شک نہیں جس کا حال ناظرین پر کھلتا جائے گا، نادری تو اسکی صورت سے جلتی تھی بلکہ ڈرتی تھی۔ البتہ جعفری بیگم صاحب کا بڑا رفیق تھا۔

# باب ۸

نادری کی سال گرہ ماہ رجب کی سترہویں کو ہونے والی تھی آج رجب کی نویں تھی، نادری اور اختری میں صلاح ہوئی کہ چلو بہن پھوپھی کے گھر چلیں، بہت دن ہوئے بڈھن منن کو بھی نہیں دیکھا ہے گرہ بھی وہی لگاتی ہیں چلو اُن کو کہتے آئیں گے، دو دن پہلے سے چلے آئیں گے، جعفری کو یہ مہمانداریاں ناگوار تھیں۔ جب سے اختری گھر میں آئی اور جعفری نے اُس سے بے رُخی کی تھی برخلاف اس کے نادری نے اُس کی بڑی خاطرداری کی۔ یہاں تک کہ دونوں میں سگی بہنوں سے زیادہ محبت ہوگئی تھی۔ خورشید مرزا کو اختری کا بڑا خیال تھا۔ نادری اُس سے محبت کرتی تھی اس لئے وہ نادری سے بہت خوش تھے اور جتنا نادری سے خوش تھے اتنا ہی جعفری سے ناخوش تھے، اس ناراضی کی کسر بے گناہ اختری سے لی جاتی تھی مگر اختری کو اس کی زیادہ پرواہ نہ تھی، ہاں اس کو رنج ضرور تھا۔ وہ جعفری کی چھچھوری باتوں کا بے پروائی سے کچھ جواب نہ دیتی تھی۔ اگر اختری سے بنائے رکھتی تو جعفری بہت خوش رہتی مگر اُس کی تقدیر میں ہمیشہ جھینکنا پیٹنا اور خواہ مخواہ جلنا لکھا تھا وہ اختری کے پیچھے پڑ گئی۔ اور طرح طرح سے رنج پہنچاتی تھی۔ مگر یہ اختری کا ظرف تھا کہ اُس نے کبھی خورشید مرزا سے اس کی شکایت نہیں کی، ہر ایذا کو برداشت کرلیا مُنہ سے اُف نہیں کی۔

سال گرہ کے دن نادری چاہتی تھی کہ نیا جوڑا پہنوں اُس نے پہلے اپنی دلی خواہش

جعفری سے ظاہر کی۔ ان لڑکیوں کو باپ جو کچھ وقتاً فوقتاً دیتے تھے وہ جمع رہتا تھا۔ کپڑے تو خورشید مرزا خود ہی بنا دیتے تھے مگر کبھی کبھی اپنے پاس سے بھی اپنی خوشی کا کپڑا خرید کے خود بھی اپنے کپڑے بنائی رہتی تھی۔

نادری۔ اللہ! بہن زیادہ نہیں پچیس روپیہ دیدو کچھ ملا جُلا کے ایک جوڑا بن جائے گا۔

جعفری۔ صندوق میں کپڑے بھرے پڑے ہیں نئے جوڑے کی کیا ضرورت، تمہیں تو ہر بات کا ہوکا ہے میں تمہاری طرح دیوانی نہیں ہوں نہ میرے پاس روپیہ ہے تم نے اپنا روپیہ کیا کیا۔ ہاں وہ بڈھن منن کی گڑیا کی شادی میں دیا گیا ہوگا بڑی روپیہ والی۔ رکھنا نہیں جانتیں، نیا جوڑا نہ پہنوگی تو کیا ہوگا۔ میں روپیہ نہ دوں گی۔

ایسا روکھا جواب اور اس سختی اور بے رحمی سے نادری کو بہت ملال ہوا بڈھن منن کی گڑیا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور نادری نے سارا خرچ اٹھایا تھا، دس روپیہ کے قریب خرچ کئے تھے اسکو سال بھر سے زیادہ زمانہ ہو چکا تھا مگر جعفری جب سے ہزار مرتبہ تو بہن کو گود چکی ہوگی۔

اختری چاہتی تو نادری کو روپیہ دے دیتی مگر اُس کو اپنی مقدرت اِن بہنوں پر ظاہر کرنا مقصود نہ تھی، دونوں بہنوں میں جو باتیں ہوئیں وہ اختری نے سُنیں اُسے فکر تھی کہ نادری کی خوشی ہو جائے۔ جعفری نے ایسی بری طرح باتیں سُنائیں کہ نادری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اختری کو اس کا بڑا ملال ہوا مگر کیا کر سکتی تھی، آخر اُس نے ایک تدبیر نکالی۔

خورشید مرزا گاؤں پر جانے والے تھے سخت گرمی پڑ رہی تھی لو چلتی تھی۔

اختری۔ ماموں جان اِن دنوں بڑی گرمی پڑتی ہے لو چلنے لگی ہے —— ذرا دِن چڑھا اور لوگ تہ خانوں میں چلے گئے پانچ چھ بجے تک تہ خانوں سے

نہیں نکلتے اور آپ باہر جنگلوں میں جائیں گے اور ابھی چار دن ہوئے دشمنوں کا مزاج ناساز تھا۔ میں تو جانتی ہوں آپ اپنا جانا ملتوی کیجئے۔

نادری۔ جی ہاں (موئے، یہ بہت چپکے سے کہا تھا مگر پھر بھی خورشید مرزا نے سن لیا) مراد علی کو بھیج دیجئے، آخر یہ کس کام کے لئے ہے۔

خورشید مرزا۔ (نادری کی نفرت مراد علی سے جانتے تھے اس لئے مسکرا کے) ہا! بیٹا اُس کی جان نہیں ہے، باپ کو تو تہ خانے میں آرام کرنے کو اور مراد علی کو جنگل میں بھیجتی ہو، وہ بھی تو آدمی ہے۔

نادری۔ وہ موا ہٹا کٹا مسٹنڈا اُس کو کیا لُو لگے گی۔

اختری۔ جی نہیں اس خیال سے نہیں مگر وہ ایک تو نوجوان ہے اس کو اس موسم کی برداشت ہے دوسرے آپ کے سن میں اور اُس کے سن میں بڑا فرق ہے۔ آپ کے آرام کرنے کے دن ہیں اُس کے محنت کرنے کے سن ہیں۔

خورشید مرزا۔ (اس معقول وجہ کو سُن کے اور اپنے ساتھ لڑکیوں کی ہمدردی دیکھ کے خوش ہو گئے) میں اُس کو ضرور بھیج دیتا اور خود نہ جاتا۔ مگر اسکے نام مختار نامہ نہیں ہے اور نہ شیخ احمد علی کے جیتے جی کسی کے نام کا مختار نامہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی دلی خواہش ہے کہ بھتیجے کے نام مختار نامہ ہو جائے مگر میں اس خیال سے کہ شاید وہ اچھے ہو جائیں ابھی ٹالتا ہوں۔ اگر زیادہ بیمار ہو گئے تو مختار نامہ کرنا پڑے گا۔

اختری۔ ایک وجہ آپ کے روکنے کی اور بھی ہے۔ اس میں آپ کی شرکت ضرور ہے۔ شاید آپ کو یاد نہیں بہن نادری کی سالگرہ قریب ہے۔

خورشید مرزا۔ اہاہ! کہئے بی نادری اب آپ کتنی بوڑھی ہوئیں۔

نادری۔ جی یہ پندرھویں گرہ ہے۔

ناظرین کو شاید یہ خیال ہو کہ یہ لڑکیاں اتنے سن کی ہو گئیں رواج ملک کے موافق ابھی تک ان کی شادی کیوں نہ ہوئی، بات یہ ہے کہ ہندوؤں میں تو عموماً دس بارہ برس کے سن سے پہلے شادی ہو جاتی ہے اور مسلمانوں میں خصوصاً امیر گھرانوں میں لڑکیوں کے سن بڑھ جایا کرتے ہیں اور شادی نہیں ہوتی۔ راقم الحروف کو خوب معلوم ہے کہ اونچے گھرانوں میں کبھی پچیس تیس برس کے سن تک لڑکیاں بیٹھی رہی ہیں اس کے بہت سے وجوہ ہیں، بعض عام اور بعض خاص، عام وجہ تو یہ ہے کہ اچھا بر نہیں ملتا، معاشرت کی خرابی سے اکثر امیرزادے پورے جوان بھی نہیں ہونے پاتے طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بیٹی والے کو ایک تو یہ مشکل کہ لڑکا لائق نہیں ملتا۔ دوسرے عام وجہ شادی کے واسطے روپیہ کا نہ ہونا، چاہتے ہیں کہ اپنے نام نمود کے موافق لڑکی کو جہیز دیکے رخصت کریں، لکھنؤ میں خاص بیٹے والے کھانے جوڑے کے لئے تکرار کرتے ہیں، رقم کثیر طلب کرتے ہیں، یہ روپیہ مانجھے کے رسم کے ساتھ دیا جاتا ہے، مانجھا بھی دھوم دھام سے ہو دولہا کا جوڑا قیمتی ہو، اگرچہ یہ جوڑا کسی طرح قابل پہننے کے نہیں ہوتا، اکثر لڑکے گھڑی دو گھڑی ماں بہنوں کی خوشی کر دیتے ہیں۔ اور بعض ضدی دولہا تو جوڑا پہننا کیسا کنگنا باندھنے میں بھی مضائقہ کرتے ہیں ادھر لڑکی والے چاہتے ہیں کہ لڑکا جوڑا پہن کے باہر نکلے شہر میں پھرے، عزیز کنبہ میں جائے ہمارا نام ہو، نہیں تو لوگوں کو کس طرح معلوم ہوگا ہم نے کیسا جوڑا دیا۔

خاص وجہ شادی نہ ہونے کی لڑکی کی ماں کا نہ ہونا باپ کا بے پرواہ ہونا مگر سب سے بڑی وجہ ناداری ہے جس ہزاروں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، قدیم رسم و رواج کی پابندیاں اکثر واجب شرعی امور میں حارج اور مانع ہوتے ہیں۔ مگر اب خدا کے فضل سے اصلاح ہوتی جاتی ہے، اب امیر خاندانوں میں چپ چپاتے شادیاں ہونے لگی ہیں۔ جو کچھ ممکن ہوا عقد کے بعد دولہا کے باپ کو دے دیا ہزار دو ہزار پانچ ہزار

جیسا مقدور ہوا لڑکی کو رخصت کر دیا۔ آگے لڑکی کی تقدیر۔ اگر اچھے کے ساتھ ہوا تو خیر ورنہ زندگی بھر کو دوزخ ہے۔ اُدھر لڑکی جلتی ہے اِدھر غریب ماں باپ کڑھتے ہیں مگر کچھ بنائے نہیں بنتی۔ یہ ساری عورتوں کی تعلیم نہ ہونے سے ہیں۔ خواندہ عورت کو شوہر بے وجہ نہیں دبا سکتا۔ علم میں بڑی قوت ہے اگر ماں باپ واقعی چاہتے ہیں تو اُن کو اچھی طرح پڑھانا لکھانا چاہئے۔

اختری۔ ماموں جان تو پھر نادری کو سال گرہ کے دن کیا دیجئے گا۔

خورشید مرزا۔ انھیں سے پوچھو، میں تو اکثر ایک آدھ عدد زیور کا بنوا دیا کرتا ہوں، اس مرتبہ بھی جس چیز کی کمی ہو بنوا دی جائے یا بنی بنائی مول لے لی جائے۔

اختری۔ مگر اس مرتبہ تو آپ میری خاطر سے نقد دے دیجئے، آپ کی بدولت گہنا موجود ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ (نادری کے پاس پورا جوڑا گہنے کا نہ تھا مگر اختری نے دل میں ٹھان لیا کہ شادی کے موقع پر میں اپنے گہنے سے جن عددوں کی کمی ہوگی پورا کر دوں گی مگر اس کو زبان سے نہیں نکالتی تھی۔ اسی خیال کو دل میں لے کے،) اور آپ کی سلامتی میں بہت سا گہنا ہو جائے گا، اس وقت تو زرِ نقد کی ضرورت ہے، یہ اپنی خوشی سے گہنا نہ سہی کپڑا سہی۔

خورشید مرزا۔ (اپنی چھوٹی لڑکی کو جانتے تھے کہ روپیہ رکھنے کا اس کو ڈھنگ نہیں آتا) روپیہ فضول اٹھانے کے لئے۔

اختری۔ میرا ذمہ فضول ایک پیسہ نہیں خرچ ہوگا۔

خورشید مرزا۔ (کو ہر طرح اختری کی خوشی منظور تھی) اچھا نقد سہی، صندوقچہ منگوایا پچاس روپیہ کا نوٹ چھوٹی بیٹی کو دیا، یہ رقم نادری کی توقع سے سہ چند سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے کہ خورشید مرزا سال گرہ کے دن پندرہ روپیہ کی گنی دیا کرتے تھے۔ اب کی خاطر سے اختری کے اور یہ بھی کچھ اشارہ سمجھ گئے تھے کہ کپڑے بنیں گے تو پھر ایک

گنی میں کیا ہوتا ہے سال گرہ کے موقع پر پہننے کے لائق صرف اطلس کے پائجامہ کے لئے پچاس ساٹھ روپیہ چاہیئے ہوں گے۔

اس رقم کے ساتھ ہی لڑکی کی آنکھ بچا کے سَو روپیہ کے دس نوٹ اختری کو خرچ کے لئے دئے اور چپکے سے کہا بیٹا آجکل ذرا خرچ کم ہے۔ سمجھ کے اوٹھانا۔

یہ بات سُن کے اختری دنگ ہو گئی۔ کیونکہ اس کا روپیہ ایسا کیا اٹھا تھا جو یہ کہا جائے کہ خرچ کم ہے۔ اس وقت اختری کو معلوم ہوا کہ خورشید مرزا نے آجتک جو کچھ مجھ کو دیا ہے اپنے پاس سے دیا ہے اس کو یہ معلوم نہ تھا، جانتی تھی کہ خورشید مرزا کی آمدنی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ اس قلیل آمدنی پر میرا بار اور قیامت ہے۔

اختری۔ ماموں جان تو آخر وہ روپیہ (اپنے روپیہ کی طرف اشارہ تھا) کس کا ہے، اس سے زیادہ میری خوشی نہیں ہو سکتی کہ آپ اس کو صرف کریں، اور اُلٹے میرا بوجھ بھی آپ نے اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ میں آپ سے ایک پیسہ آج سے نہ مانگونگی نہ لوں گی، چاہے کیسی ہی ضرورت ہو۔

خورشید مرزا۔ یہ میں نہیں چاہتا کہ تم کو تکلیف ہو۔ تمہیں اِس سے کیا تم کو تو ملا جاتا ہے۔

اختری۔ نہیں ماموں جان میں ایسے لینے سے باز آئی، جب آپ کو تکلیف ہو، نہیں تو میرے سر کی قسم کھائیے کہ میرے روپیہ سے آپ صرف کریں گے، اور مہاجن سے کیا فیصلہ ہوا۔ میں کئی دن سے اس فکر میں تھی کہ آپ سے اُس کے بارے میں کچھ کہوں موقعہ نہیں پاتی تھی۔

مہاجن کا یہ معاملہ تھا کہ دس ہزار اصل قرضہ کے بارے میں جو خورشید مرزا پر واجب الادا تھے، اب پندرہ ہزار اصل و سود کے ہوئے اُس نے مکان اور شہر کے متصل جو باغ تھا اُس کو قرق کرا کے نیلام پر چڑھایا تھا اور خورشید مرزا کو کہیں سے روپیہ قرض

نہیں ملتا تھا۔ اس میں مراد علی کی سازش تھی، اُس نے اس خفیہ رقم کی بھنک پا کے مہاجنوں کو بھڑکا دیا تھا۔ چاہتا تھا کہ اس رقم کا حال کھلے تو مجھکو غبن کا بڑا موقع ملے خورشید مرزا کی آمدنی کے ذریعہ محدود تھے۔ اور اب نئی دستاویزیں بھی کم ہوتی تھیں اس لیئے اسکو کمیشن کی رقمیں بھی نہ ملتی تھیں۔ اب وہ بیچین تھا کہ کس طرح اس خفیہ دولت کا پتہ چلے تو کارروائی کا موقع ملے۔ خورشید مرزا اُس کے کم عمر ہونے کی وجہ سے اس راز کو چھپائے ہوئے تھے، چچا سے کچھ تھوڑا بہت حال معلوم ہوا تھا مگر وہ کافی نہ تھا۔ اس کو غبن کا موقع نہ ملتا تھا، اس امانت کے کاغذات یا کلکتہ اٹرنی کے دفتر میں تھے یا وہاں کے بنکوں میں ضروری اسناد خورشید مرزا کے بکس میں بند تھے اور یہ بکس خود اختری کے کمرے میں تھا۔ کنجی اختری کے پاس تھی۔ خورشید مرزا ہرگز اختری کی دولت کو ہاتھ نہ لگاتے مگر واقعات نے ایسا مجبور کیا کہ آخر آج بقسم اُن کو اقرار کرنا پڑا کہ میں اس روپیہ سے بطور قرض اپنی ضرورتوں کے لیئے لونگا اور اختری کو بھی اگر ضرورت ہوگی تو اس کی رقم سے اُس کو دیا کروں گا۔ ورنہ اختری نے قطعی ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ایک حبہ صرف نہ کروں گی اور یہ بڑا ستم تھا کہ روپیہ ہوتے ساتے اُس کو تکلیف ہو۔ یا جو اُسکی خوشی ہو وہ پوری نہ ہو۔ اُس کی اخراجات کیسے ہی فضول ہوں مگر اُس کی دولت کے حساب سے وہ کچھ بھی نہ تھے۔ چھ سات سو روپیہ ماہوار کا خرچ بہت ہی کم تھا۔ اس گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ آئندہ جو اسکو ضرورت ہو رقعہ لکھ کے لیا کرے۔

نادری پچاس روپیہ کی رقم وصول ہونے سے اس قدر خوش ہوئی کپڑا خریدنے کا انتظام کرنے لگی۔ گرمین سے کہا کہ بھاگ کر تم بزاز کو آج ہی بُلا لاؤ تو بڑی باجی (جعفری) اور اختری باجی کی رائے سے کپڑا خرید کر لیا جائے۔

خورشید مرزا۔ اُٹھ کے باہر گئے، جعفری بیگم صاحبہ خراماں خراماں انگنائی،

میں آئیں اور آگ لگاتی ہوئی آئیں، اُن کو تو ہر طرح اختری کے سُنانے سے کام تھا، اب اُس میں چھوٹی بہن کو صدمہ پہنچے اور وہ آٹھ آٹھ آنسو روئے تو اُن کی بلا سے یہ اور ٹھٹھے لگائیں گی۔

جعفری۔ بی نادری آج آپ کو پچاس روپیہ ملے۔ اختری کے طفیل سے پندرہ کے پچاس تو ہوئے، اپنے باپ سے اور غیروں کی سفارش اٹھوا کے روپیہ لینا، غیرت اُڑ گئی ہے۔ میں تو ایسے روپیہ پر ٹھوکر بھی نہ مارتی، ایسے کپڑے کو آگ لگا دیتی، مگر بی نادری کو شرم کہاں۔

اس زہر کی بُجھی ہوئی باتوں نے دو بیگناہوں کو رُلوا دیا۔ نادری کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ وہ دن بھر منہ لپیٹے پڑی رویا کی۔ اختری کو تاؤ پیچ آیا مگر وہ اور باتوں کی طرح یہ بھی اپنے دل پر لئے رہی۔ تُو تُو مَیں مَیں اُس کے نزدیک ——— باندیوں کا شیوہ ہے شریف زادیاں کسی سے لڑتی نہیں اور اگر لڑ پڑیں تو پھر ملانا نہ ہوگا۔ اسی گھر میں رہنا ہے، جعفری کا انتظام ہے کھانا پینا اس کے ہاتھوں ہے، یہ سچ ہے کہ میرے ذرا سے اشارہ سے میری مَاما میری باورچن میری بھشتن سارا عملہ جُدا ہو سکتا ہے مگر رہنا تو اسی گھر میں ہے یہ تو اُسوقت مناسب تھا جب الگ مکان بھی ہوتا۔ میں تنہا کہاں جا کے رہوں۔ ماموں جان اسے کیونکر گوارا کریںگے۔ کمرے میں اکیلے رہنے کو میری ضد سے اُنھوں نے مان لیا اکیلے مکان میں رہنا کہاں، ابھی میرے چھٹکارے کے زمانہ میں کئی برس باقی ہیں آخر یہ سب اونچ نیچ سوچ کے اُس کو چپ ہی رہنا پڑا۔ جعفری کی ایک بات کا جواب نہیں دیا۔

آخر سر شام نادری کو ساتھ لے کے پھوپھی کے مکان پر چلی گئی۔

مرزائی بیگم۔ نواب مرزا بہت ہی خوش ہوئے، بڑی خاطرداری کی، سب سے زیادہ بڈھن دلہن کا، ہنن (لڑکی) کو خوشی ہوئی۔ ادھر نادری باجی آئی ہیں لے لو

اختری باجی بھی ساتھ ہیں، اب یہاں ہمارے گھر میں مہمان رہیں گی ؎
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نادری کی آنکھ بچا کے اختری نواب مرزا کے کارخانہ میں چلی گئیں، ماں کی تصویر قریب تیاری کے تھی۔ دو ہی ایک دن کا کام اور تھا، پھر سنہری چوکھٹا اور شیشہ لگ کے تصویر اختری کو دی جائے گی۔

پھر قبر پر جا کے وہاں کا نقشہ بنا کے لانا ہے، اس کے لئے اخراجات دے دئے گئے ہیں۔ تصویر کے باقی سو اسو روپے پہلے ہی ادا کر دئے گئے تھے۔ نواب مرزا اسی ہفتہ پہاڑ پر جائیں گے، کام بھی ہے اور سیر مفت ہے۔ عکسی تصویر کشی کے سامان کی جو کچھ کمی تھی وہ بھی اختری کی مدد سے پوری ہوگئی۔ بڑی تصویروں کی فرمائش تھی، بڑے کمرے کی ضرورت تھی، اس کے ماورا ضروری تیزاب کی بوتلیں اور اجزا یہ سب خرید کر لئے گئے تھے؛ نادری کی سال گرہ کے دوسرے دن جب مرزائی بیگم گھر پر آ جائیں گی، نواب مرزا روانہ ہوں گے۔

# باب ۹

## ہم بھی اپنی تدبیر سے غافل نہیں ہیں

یہ لوگ تو یہاں ان سامانوں میں تھے، خورشید مرزا کسی ضرورت سے ایک دن کو گاؤں پر گئے تھے میدان خالی تھا، مرادعلی کو جعفری نے بلوا بھیجا۔ خفیہ باتیں ہوئیں دیوار ہم گوشدارد، نصیبن مہری کی صحنچی قریب تھی وہ منہ لپیٹے پڑی تھی، جعفری نے کچھ خیال نہیں کیا۔ اُس نے سب سُنا اور یاد رکھا۔ اختری کو سب معلوم ہو گیا۔ مگر وہ کیا کرسکتی تھی، خاموش ہو گئی۔

معمولی پرسش کے بعد۔

مرادعلی۔ آخر یہ نئی بیگم صاحبہ کون ہیں؟

جعفری۔ کیا معلوم۔ اتنا جانتی ہوں جب سے آئی ہیں گھر کو تہ و بالا کر دیا ہے کیا کہوں ابا جان کو کیا ہو گیا ہے، ہماری تو اب کوئی اصل ہی نہیں ہے۔ ہم تو ماما اصیلوں سے بدتر ہیں، کھانا اُن کی فرمائش سے پکتا ہے۔ کپڑا اُن کی خوشی سے آتا ہے۔ ہم پر حکومتیں ہوتی ہیں۔ (یہ سب جھوٹ اُس بیچاری نے دو ایک مرتبہ خورشید مرزا کے اصرار سے کسی چیز کو کہہ دیا ہو ورنہ جو کچھ گھر میں پکا چپکے سے کھا لیا، اور تو اور بی نادری ایسی بو کھلائی ہوئی ہیں، جانتی ہیں کہ ابا جان اُن کے کہنے پہ چلتے ہیں۔ آئے دن اُن کے پاس گھسی رہتی ہیں جیسے ہم کوئی نہیں، اب وہی ہیں جو کچھ ہیں۔ آڑ میں باداجان سے فرمائشیں ہوتی ہیں، مٹھائی چلی آتی ہے، ترکاریوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے اپنے

بیگانوں کے گھر بھرے جاتے ہیں۔ (یہ اشارہ مرزائی بیگم اور زینب بیگم کی طرف تھا) کھانا جارہا ہے۔ ترکاریاں بٹ رہی ہیں لٹائی جارہی ہیں۔ مالِ مفت دلِ بے رحم، باپ کا سامان، میں کہتی ہوں اس گھر کا خدا حافظ ہے۔ مکان تک نیلام پر چڑھ گیا، نواب صاحب (باپ) کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی، اب سنتی ہوں کسی سے بیس ہزار اور قرض لیے جائیں گے۔ سود بڑھتے بڑھتے سب جائداد مہاجنوں کی ہو جائے گی۔ یہ ہونا کیا ہے۔ یہ مکان یہ باغ یہ گاؤں یہ بی اختری سب بکوالیں گی۔

بھلا تم کو بھی یاد ہوگا، میری سال گرہ میں نادری کی سال گرہ میں کبھی مہمنداری ہوئی تھی۔ ڈومنیاں آئی تھیں، اب کی یہ سب ہوگا۔ بی نادری کو اختری کی سفارش سے آبا جان نے پچاس روپیہ دئے ہیں نیا جوڑا تیار ہوگا۔ ہر سال ایک اشرفی ملا کرتی تھی یہ دن کب نصیب تھے۔ بہت خوش ہیں یہ نہیں خیال آتا کہ گھر مٹ رہا ہے۔ نادری اور خود بدولت پھوپھی صاحبہ کو لینے گئی ہیں، پھوپھی کے بچے روز آتے ہیں اُنکی خاطریں ہوتی ہیں۔ اس شاہانہ خرچ کے لئے تو قارون کا خزانہ ہوتا۔ نواب مرزا آتے ہیں اختری سے چپکے چپکے کچھ صلاح مشورے ہوتے ہیں،

مرادعلی ۔ نواب مرزا کون ؟

جعفری ۔ تم نہیں جانتے، ہمارے عزیز ہیں۔ مگر کبھی اتنی آمد و رفت نہ تھی، بی اختری کی ذات سے اب عزیز داریاں خوب چمکی ہیں۔ ہم کوئی نہیں بڑی عزیزداری میں جو ل بی اختری سے ہے۔ پھوپھی جان بھی اُنھیں سے خوش ہیں گویا ہم غیر ہو گئے اَب جو کچھ ہیں اختری ہیں کیوں نہیں اُن سے تو روپیہ ملتا ہے ہم کیوں دیں اور کہاں سے دیں، کوئی آیا ایک دن کھانا کھلایا، کھڑے کھڑے آیا ایک ٹکڑا پان دیدیا رخصت کر دیا۔ یہ سب کی بڑی دوست دار۔

مرادعلی ۔ مگر یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ آخر یہ ہیں کون ؟

مراد علی سمجھ گیا تھا کہ یہ اخراجات خورشید مرزا کے روپیہ سے نہیں ہو سکتے ضرور کوئی خفیہ ذریعہ آمدنی کا ہے اور اس کا تعلق اختری سے ہے، مگر ایسے لوگ اپنے دل کی بات دل میں رکھتے ہیں اُس کو کیا غرض تھی کہ اختری کی دولت کی چھائیں جعفری کو دیتا اوس کا تو مطلب اس میں تھا کہ گھر میں جھگڑے ہوں، جعفری جانتی ہے کہ میرے باپ کا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ یہ غلط خیال ہے مگر میں اس غلطی کو کیوں بیان کروں۔ جعفری کو یہی سمجھنے دو اسی سے پتے چلیں گے۔ لوگوں کو دھوکے میں رکھنے سے بلکہ دھوکا دینے سے اپنا مطلب نکلے تو اس سے بڑھ کے ہوشیاری نہیں۔ جن لوگوں کو فریب دینے کی لیاقت نہیں ہے وہ فریب کو بُرا کہتے ہیں مگر یہ دولت پیدا کرنے والوں کا فن ہے اس کو بُرا نہ کہنا چاہیئے۔

جعفری۔ یہ منصوری پہاڑ کا کیوں نام آتا ہے۔

مراد علی۔ چچا سے سُنا تھا کہ نواب صاحب کی کوئی عزیز تھیں انھوں نے منصوری پہاڑ پر انتقال کیا تھا۔ بس اسی قدر مجھکو معلوم ہے اور کچھ نہیں جانتا۔ چچا کو بھی کچھ خبر نہیں ہے ہاں قبر کے لئے ایک قطعہ آراضی خریدنے کا کچھ ذکر آیا تھا ماہواری قرآن خوان کی تنخواہ بھی چچا کی تحویل سے جاتی ہے۔ غریبوں کی قبر کے لئے آراضی نہیں خریدی جاتی۔ قرآن خوان برسوں نوکر نہیں رہتے یہ سب امیروں کے ڈھکوسلے ہیں (مراد علی مذہب کا زیادہ پابند نہ تھا ایک بندۂ زر کو یہ مقدس رسمیں جسمیں روپیہ کا صرف ہو یقیناً فضول معلوم ہوتی ہونگی اُس نے تو مُردے کو ایک کھٹیا پر ڈال کے تکیہ پر لے جاتے اور کسی طرح دو مٹھی خاک ڈال گاڑ توپ کے چلے آتے دیکھا تھا۔ مر گئے مردود جنکی فاتحہ نہ درود، اُس کا چچا مرے گا تو وہ شاید اتنا بھی نہ کرے گا۔ خدا قدر دان آقا (خورشید مرزا) کو سلامت رکھے اُن کی بدولت گور گڑھا ہو جائے گا ہاں جو کچھ مال متروکہ یا چڑھی ہوئی تنخواہ لینے کو مراد علی

منصوری کا نام آتے ہی یہ سر ہو گیا ہو نہ ہو وہیں سے کچھ سلسلہ ملتا ہے، اچھا تو میں منصوری جاؤں گا۔

جعفری بیگم۔ ہاں بھیا تمہیں کچھ پتہ لگاؤ۔ کہ یہ صاحبزادی کون ہیں، انھوں نے تو گھر مٹا دیا۔

مراد علی۔ کیا آپ پتہ لگانا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ منصوری پہاڑ پر جانے سے کچھ بھید کھلے۔ اچھا تو میں جاؤں گا۔ کرایہ میرے پاس نہیں ہے۔

جعفری۔ بڑی کنجوس تھیں مگر اس وقت اختری کی جلن میں کچھ گرہ سے بھی خرچ ہو جائے تو مضائقہ نہیں، بڑی مشکل سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کے مراد علی کے حوالہ کیا۔

مراد علی۔ دل میں چلو کرایہ تو مل گیا۔ کوئی تعلقہ حال ہی میں کورٹ ہوا تھا وہاں سربراہ کاری کے لئے مراد علی بھی اُمیدوار تھا، منیجر صاحب پہاڑ پر گئے تھے، دراصل مراد علی کو اُن سے ملنا تھا۔ اچھا یک کرشمہ دو کار۔ اس قبر کا پتہ بھی لگاؤنگا، اچھا تو میں جاتا ہوں آپ خاطر جمع رکھئے، میں پورا پتہ لگا کے آپ کو بتا دوں گا۔ دس بجے دن کا وقت تھا جب مراد علی جعفری سے رخصت ہو کے جا رہا تھا، اُسی وقت اتفاق سے نادری کی سواری آئی، دوسری سواری میں اختری تھی، بڈھن نادری کے ساتھ منن اختری کے ساتھ ڈولیوں میں بیٹھ کے آئے۔ مراد علی اندر مکان میں تھا اس لئے اختری کی سواری کے اُترنے میں کسی قدر توقف ہوا۔ جب مراد علی جا چکا تو اختری اُتر کے اندر گئیں، نادری نے اس کو جاتے دیکھا، معلوم ہوا کہ بڑی دیر سے آیا ہوا تھا۔ جعفری سے باتیں ہو رہی تھیں۔

نادری اختری سے مل کے، خدا خیر کرے آج یہ موا مراد علی کیوں آیا تھا سُنا ہے جعفری باجی سے دیر تک خفیہ باتیں ہوا کیں۔

اختری - پھر تمہیں کیا، کچھ کام ہو گا۔

نادری - اے ہے بہن تم کو نہیں معلوم تم بھولی آدمی زمانے کے جعل فریب کو تم کیا جانو یہ مُوا بڑا جعلیہ ہے، اس کا آنا بے سبب نہیں ہے، کوئی فساد برپا کریگا۔

اختری نہیں وہ کیا کر سکتا ہے۔

نادری - اے بڑا چلتا پرزا ہے اسکو کم نہ جانو۔ پھر جعفری باجی کو ایسا کیا کام تھا کہ اس کو گھر میں بٹھا کے پہروں باتیں کیں، میرا تو دل دھڑک گیا۔ جب سے مجھکو پچاس روپیہ ملے ہیں جعفری انگاروں پر لوٹ رہی ہیں۔ میں تو راضی ہوں وہی لے لیں، اُس کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جائے۔

اختری - کیوں بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ وہ بڑی بہن ہو کے چھوٹی کو اپنے پاس سے دینے سے رہیں اُلٹے تمہارے روپے چھین لیں گی۔ اب جعفری ایسی بھی نہیں۔

نادری - تمہیں سے رات دن اوکھڑ بیج کیا کرتی ہیں تم چُپ ہو جاتی ہو میں تو نہیں ہوں تمہارا پتھر کا کلیجہ ہے کوئی لڑنے والا ہو تو دن رات جوتی پیزار ہو۔

اختری - نوج خدا نہ کرے۔ خیر وہ مجھ سے جس طرح پیش آتی ہیں اُسکا سبب تم کو معلوم نہیں۔ شاید میری ہی خطا ہو۔ میری خطا نہیں ہے کچھ یوں ہی بن پڑی ہے۔

نادری - واہ رے دل فرشتوں کا تو نام سنا ہے مگر تم کو دیکھا یہ صبر، یہ بُردباری تمہارا ہی کام ہے۔

اختری - تو پھر کیا کروں تمہاری صلاح ہو تو مورچہ بندی ہو جائے، خدا نہ کرے جعفری سمجھیں گی اور سمجھیں گی، اور جب سمجھیں گی تو وہ ضرور شرمندہ ہوں گی۔

اِن چند لفظوں کے بعد اختری نے بات کو ٹال دیا۔ بزاز ڈیوڑھی پر آگیا تھا، اطلس کے طاسنے کھُلنے لگے۔ اختری نے اپنی پسند سے بہت ہی خوش وضع پھُول دار سچّی سُنہری بوٹیاں ہلکے گلابی رنگ کی اطلس خرید کی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ جعفری کے لئے بھی اسی طرح ایک پاجامہ ہو مگر کیا مجال تھی جس طرح بد بدی سے باز نہیں آتے اسی طرح نیک نیکی کو نہیں چھوڑتے۔

# باب ۱۱

## ہم کوئی ہیں، تم کون ہو

رازداران محبت کے کرشمے دیکھو ٭ دل سے دیکھا انھیں اس بھید کا ہروا کرتے

جیٹھ بیساکھ کے دن پہاڑ پر جنت کا لطف دیتے ہیں، گرم میدانوں سے جا کے جو دفعتہً ٹھنڈی گھاٹیوں میں پہنچ جاتے ہیں سفر کی سختیاں فوراً کافور ہو جاتی ہیں۔ گویا دوزخ سے بہشت میں آ گئے۔ جب آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے غنودگی سی آتی ہے تو آدمی کو خیال ہوتا ہے شاید وہی جنت ہے جس کا ہم سے وعدہ ہوا ہے آسمانی جنت نہ سہی زمین کی جنت ضرور ہے۔ مگر صرف گرمی کے موسم میں۔ ہر طرف سرسبزی شادابی، صاف ستھرے پتھر کی چٹانیں طبقہ بہ طبقہ راستے کیسے خوشنما خم و پیچ کے ساتھ جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے آسمان تک چلے گئے ہیں۔ سرکاری باغوں میں وہ مختصر سرکیوں سے پٹا ہوا احاطہ جہاں چھوٹے چھوٹے مصنوعی پہاڑ۔ پہاڑ نہیں بلکہ پہاڑوں کے کھلونے بنائے گئے ہیں جس کو سمر ہوس اور ہندی میں بھیٹ کہتے ہیں، چاروں طرف صاف پانی کی نالیاں بہ رہی ہیں۔ بیچ میں بڑا حوض پانی کا بھرا ہوا فوارہ قد آدم سے کچھ اونچا اوچھل رہا ہے، پانی پر پانی کے گرنے سے جو خوش آیند صدا نکلتی ہے کوئی راگنی ایسی دلچسپ نہیں، راگنیوں میں سُر ہیں سروں میں تاثیر ہے لیکن اوسکا اثر ایک ہی حاسہ تک ہے اور کانوں تک محدود ہے۔ باقی، جو کچھ ہے واہمہ کی کارستانی ہے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے خوش کرتی،

وہ جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے۔ قوت لمس کو سردی گرمی کے حاسہ متاثر کر کے عجیب لطف دیتے ہیں، یہ مصنوعی پہاڑوں کے نمونے فوارے، ذرا ذرا سی چیزیں ہیں، اس چھوٹے سے منظر کو پھیلاؤ خیال کو وسعت دو، جیسے مصور چار انگل کے فوٹو سے قد آدم تصویر بنا سکتا ہے خیال میں پیمانہ کے وسیع کرنے کی بہت بڑی طاقت ہے بچہ کو دیو بنا کے دکھانا رائی کو پربت بنا دینا اسی کا کام ہے۔ اس کوہستانی منظر کو اس طرح تصور کرو کہ ایک سیکڑوں کوس کے گردے میں ہر طرف چشمہ آبشار قدرتی فوارے طرح طرح کی قدرتی سجاوٹیں، گل بوٹے کیسی خوبصورت سرسبز پتیاں اُن پر پانی کے قطرے زمرد کی تختیوں پر موتیوں کی طرح جھلک رہے ہیں، رنگا رنگ کے پھول جیسے الہ دین، جہاں سے چراغ لینے گیا تھا۔ اسی طرح جواہرات کے ڈھیر، اگر جنگل سے بازاروں میں آئے میوہ فروشوں کی دوکانوں میں میوے اور ترکاریوں کے انبار، جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا، بازار میں گھروں کوٹھیوں پر ہر جگہ کوہستانی مناظر قدرت سامنے ہیں، سب سے بلند مقام پر جاؤ سامنے ہمالیہ پہاڑ کی فلک نما مخروطی چوٹیوں پر بارہ ماسی سفید برف جمی ہوئی ہے، ان سفید مخروطوں کے نیچے آسمان سے زمین تک صدہا کوس تک سرسبز وسیع منظر۔ اللہ اکبر جل جلالہٗ یہ قدرت یہ وسعت یہ عظمت وہ تماشہ جس کے دیکھنے سے نگاہ کبھی نہیں تھکتی پھر پہاڑی دیہات اور اُن کی کھیتیاں جو پہاڑ کی بلندی سے چھوٹی چھوٹی سرسبز کیاریاں سی ڈھالوں پر بنتی چلی گئی ہیں جیسے کسی عالیشان قصر کے زینوں پر سبز مخمل کا فرش ہے اُس کے پاس چھوٹے چھوٹے کھپریلوں سے پٹے ہوئے دیہاتوں کے رہنے کی جھونپڑیاں جن کی آزادانہ زندگی اور ایسے خوشنما مقاموں میں بے شک قابل رشک ہے۔ شہروں کی تیرہ و تار گلیوں کے رہنے والے اس لطف کو کیا جانیں، ایسی ہی کسی گھاٹی کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کے پاس ایک پختہ قبر ہے جس پر اس وقت سبز پوشش پڑی ہوئی ہے۔ اس سبز پوشش پر جالدار پھولوں کی چادر قبر کے سرہانے دو سبز کنول رکھے

ہیں جن میں رات کی آدھی جلی ہوئی سفید مومی شمعیں لگی ہوئی ہیں - ان دونوں کنولوں کے بیچ میں ایک شاداب کھلے ہوئے پہاڑی پھولوں کا گلدستہ بدری گلدان میں نظروں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے - نواب مرزا عکس کشی کے کمرے کی تپائی ایسے موقعہ سے لگا رہے ہیں کہ مسجد اور قبر نمایاں طور سے عکسی تصویر میں دکھائی دے، مسجد کے پاس تختہ مسطح پر شست لگی ہوئی ہے - فیتہ تختہ پر رکھا ہے دو تین فٹ تختہ سے لٹک رہا ہے - زمینی نقشہ پنسلی تیار ہو چکا ہے جس میں یہ مختصر احاطہ مسجد قبر صحیح پیمانہ سے دکھایا گیا ہے - احاطہ کے کنارے پہاڑ کی ڈھال کا نقشہ تھوڑا بنا کے چھوڑ دیا ہے - احاطہ کے پاس سے چھوٹی سی ندی برف کے پانی سے بھری خوش آیند روانی سے بہتی ہوئی - زمینی نقشہ بالکل مکمل ہو چکا ہے -

عکسی تصویر کا فوکس درست کر کے نواب مرزا پلیٹ لگا چکے ہیں کہ ان کو دو آدمی کچھ فاصلہ سے اِدھر آتے نظر آئے جن میں سے ایک تو وہی میر صاحب ہیں جو اس قبر کے مجاور اور قرآن خوان ہیں، دوسرے ایک نوجوان منشیانہ پگڑی باندھے ہوئے پہلے تو نواب مرزا کو منڈی سی ڈاڑھی بڑی بڑی مونچھوں اور پگڑی کی بندش سے شبہ ہوا کوئی ہندو منشی جی ہیں مگر قریب آنے کے بعد معلوم ہوا کوئی مسلمان صاحب ہیں - ناظرین نے سمجھ لیا ہوگا کہ مراد علی آپ ہی ہیں -

مراد علی - آتے ہی نواب مرزا سے بغیر صاحب سلامت کئے کڑے تیور ڈال کے تحکمانہ آواز سے تم یہ تصویر کس کے حکم سے بنا رہے ہو؟ اس تم کے جواب میں نواب مرزا تو تُو کہہ کے خطاب کرتے مگر یہ تجربہ کار مصور تھے اور ذرا مزاج میں تمسخر بھی تھا - غصہ آیا اور انتقام کو بھی جی چاہا مگر ضبط کر کے شرافت نے انکی زبان سے تم نہ نکلنے دیا، نواب مرزا نے پہلے تو پوچھنے والے کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور خاموش ہو رہے جیسے اُن سے کسی نے کچھ پوچھا ہی نہ تھا - اس بے تہذیب

خود ساختہ حکومت کا جواب ہی کیا تھا۔

مراد علی۔ اس سکوت کو نہیں معلوم کیا سمجھا۔ پھر اسی انداز سے آواز ذرا اور بلند کر کے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں یہ تصویر کس کے حکم سے تم بنا رہے ہو؟۔

مکرر بلکہ سہ کرر "تم" سے اُن کو سخت غصہ آیا۔ مگر پھر ضبط کر کے، جناب میں آپکا مطلب نہیں سمجھا، اتنا کہہ کے مراد علی کو سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھکر پھر چپ ہو رہے اور اپنے کیمرے کو سنبھالنے لگے۔

مراد علی۔ میں جانتا ہوں نواب خورشید مرزا کی فرمائش سے یہ بنائی جاتی ہے، مجھے یقین ہے۔

نواب مرزا۔ جب ایک بات کا آپ کو پہلے سے یقین ہے تو پھر پوچھنے کی تکلیف کیوں اُٹھائی۔

"مگر یہ جواب اس قدر آہستگی سے دیا گیا تھا جس سے مراد علی کو معلوم ہو گیا کہ جواب دینے والے نے میری کوئی حقیقت نہیں سمجھی" مگر خورشید مرزا کا نام اپنے اپنے قدر دانوں میں میں نے آج ہی سُنا۔

مراد علی۔ تو پھر اختری بیگم نے بھیجا ہوگا۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔

نواب مرزا۔ اب میں ایک ہی بات کہہ کے اس قصہ کو ختم کئے دیتا ہوں، یہ آپ کس کے حکم سے یہاں تشریف لائے اور کیوں آپ کسی کے کام میں حائج ہوتے ہیں، شاید اپنے وقت عزیز کی آپ کو قدر نہیں مگر دوسرے کا وقت ضائع کرنیکا آپ کو کیا حق ہے؟ آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ خورشید مرزا اور اختری کو تو اس قبر کے بارے میں کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

مراد علی۔ اس سے آپ اب دیکھا کہ میرا تحکمانہ رعب بے کار ثابت ہوا، کہو کیا کام۔

نواب مرزا۔ مسکرا کے تو بس آپ کو بھی میرے کام سے کیا کام؟ مناسب ہے کہ دونوں اپنا اپنا کام کریں اور ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہو۔ لیکن جب آپ میرے کام میں دخل دینا چاہتے ہیں تو وہی حق مجھ کو بھی حاصل ہونا چاہیئے۔

مراد علی۔ کو اپنے پہلے طرز گفتگو سے پشیمان ہونا پڑا۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ یہ مصور بڑی دور ہے میرے دباؤ کو ماننے والا نہیں ہے۔ خیر مجھ سے غلطی ہوئی۔

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن

اب مراد علی نے دوسرا طریقہ فریب دہی کا اختیار کیا۔ جناب کے اسم مبارک دریافت کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیجئے میں پہلے اپنا نام بتائے دیتا ہوں، مراد علی شاید میری پہلی گفتگو سے آپ کو ملال ہوا ہو میں معافی چاہتا ہوں۔

نواب مرزا (اس لاسے میں بھی پھنسنے والے نہ تھے) اس خاکسار کو لوگ مرزا کہتے ہیں، اور تو مجھے اپنا کوئی نام جو قابل آپ کی سماعت کے ہو ذہن میں محفوظ نہیں ہے معافی کی درخواست میری جانب سے بھی قبول ہو۔ پھر مسکرا کے اپنے کیمرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مراد علی۔ (اس حقارت آمیز ترکی بہ ترکی سے مراد علی کو پھر غصہ آیا چاہتا تھا مگر اس کو بکار آمد نہ سمجھ کے ضبط سے کام لیا اور التجا کرنے کا طریقہ اختیار کیا) اچھا تو اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر نوازش فرما کے بتا دیجئے کہ یہ تصویر کس غرض سے بنوائی گئی ہے۔

نواب مرزا۔ (اسی طرح مسکرا کے اور اسی آہستگی اور بے پروائی کے انداز سے جس سے تحقیر ٹپک رہی تھی) میں سمجھتا ہوں کہ میں سیدھی سادی روش کا آدمی ہوں نہ خود کسی کے کام میں دخل دیتا ہوں نہ چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی تکلیف دے۔ جس کی برداشت کی مجھ میں طاقت نہیں اور نہ ہر کس و ناکس پر بیجا نوازش کرنے کا مقدور

رکھتا ہوں۔

مراد علی۔ غصہ کو ضبط نہ کر سکا۔ بہت برہم ہو کے، ذرا آدمی دیکھ کے بات کیا کیجئے "ہر کس و ناکس" سخت الفاظ ہیں، ان الفاظ کے اثر سے کہنے والے کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

نواب مرزا۔ مجھے آپ کے اس طرح جلد جلد رنگ بدلنے سے صرف حیرت ہوتی ہے، خیر۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

مراد علی۔ برہمی کے لہجہ میں تو آپ کو میرے سوال کا جواب دینے سے انکار ہے (ذرا دھمکا کے بلند آواز سے کیا آپ جواب نہ دیں گے۔

نواب مرزا۔ اب آپ مجبور کرتے ہیں تو مجھے کہنا پڑتا ہے کہ بے شک انکار ہے۔ پھر؟ برہمی اور دھمکی کا جواب بھی نواب مرزا نے اسی آہستگی سے اور مسکرا کے دیا جو طریقہ انھوں نے پہلے سے اختیار کر لیا تھا، جس سے مراد علی کو بجائے خود کھسلنے کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔

مراد علی۔ تھوڑی دیر تک گھور کے دیکھتا رہا، جس کی ان کو مطلق پروا نہ ہوئی اور اپنے کام میں بلا توقف مصروف رہے۔ بالآخر مراد علی بڑبڑاتا ہوا۔ اچھا دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا۔

نواب مرزا نے جگہ بدل بدل کے کئی پلیٹ لگائے اور اتارے پھر حسب دلخواہ کام تمام ہو گیا۔ تختہ مسطح کا نقشہ بھی تیار تھا یہ سب سامان اکٹھا کر لیا۔ اتنی دیر میں میر صاحب حقہ بھر کے وہیں پہنچ گئے۔ چند منٹ میر صاحب سے باتیں کیا کیے۔

میر صاحب۔ (سادات بارھہ، بڑے تجربہ کار آدمی تھے) انھوں نے ایسی باتیں

کیں کہ دیر تک ہنسی رہی۔

میر صاحب۔ میں اور طریقہ پر چلا پہلی تو میں نے شیشہ میں اُتارا گویا میں سب بتا دوں گا، اس فقرہ میں آکے دور دیر بھی میں نے اینٹھ لئے، بتایا تو یہ بتایا اور جو کچھ بتایا، صحیح بتایا، اور اتنا ہی مجھکو معلوم بھی تھا تو کچھ فریب بھی نہ ہوا۔

میں نے کہا کہ کوئی ڈیڑھ سال ہوئے ایک بیگم صاحبہ بیمار ہو کے یہاں آئی تھیں، نوکر چاکر، ماما اصیلیں ہمراہ تھیں چند روز کے بعد اُنھوں نے انتقال کیا، اِسی مسجد کے پاس جنازہ کی نماز ہوئی اُنھیں عورتوں نے جو ہمراہ تھیں قبر میں اُتارا۔ قبر پختہ بنوائی گئی۔ چراغ بتی قرآن خوانی میرے سپرد ہوئی، دس پندرہ دن یہ لوگ یہیں رہے اُس کے بعد چلے گئے۔

مراد علی۔ خورشید مرزا کو آپ جانتے ہیں۔

میر صاحب۔ کئی صاحب شریف صورت ہمراہ تھے معلوم نہیں کس کا نام خورشید مرزا تھا نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اِس نام کے کوئی صاحب تھے یا نہیں۔ نواب صاحب میر صاحب، مرزا صاحب، شیخ صاحب اس طرح ایک دوسرے سے کلام کرتے اکثر سُنا، معلوم نہیں کون کون تھا۔

مراد علی۔ تنخواہ کون دیتا ہے۔

میر صاحب۔ یہاں ایک مہاجن ہے وہ پانچ روپیہ ماہوار ماہ بماہ دے دیا کرتا ہے، زیادہ نہ میں نے دریافت کیا نہ ضرورت تھی مجھے کام سے کام ہے۔

مراد علی۔ وہ مہاجن کہاں رہتا ہے۔

میر صاحب۔ آجکل دوکان بند ہے دو مہینہ کی تنخواہ پیشگی دیکے گیا تھا۔

مراد علی۔ کہاں گیا تھا، اَب کہاں ہے۔

میر صاحب۔ شاید تیرتھ کو گیا ہے۔ خدا جانے کہاں ہو مجھکو نہ معلوم کرنے

کی ضرورت۔

غرض اس طرح کے مہمل سوالات وہ کرتے رہے، میں جواب دیتا رہا کوئی بات ٹھکانے کی نہ مجھے خود معلوم تھی نہ اُن کو بتا سکا۔ ہاں خوب یاد آیا، ایک سوال، کوئی جوان لڑکی بھی بیگم صاحبہ کے ساتھ تھی۔ میر صاحب۔ خدا خدا کرو ایک رئیس زادی کے گھر کے اندر کا حال مجھے کیوں کر معلوم ہو سکتا تھا جو عورتیں باہر نکلتی تھیں اُن کو آنکھوں سے دیکھا، اندر نہیں معلوم سب جوانیں تھیں کہ بڑھیاں۔

نواب مرزا جب اختری کی ماں کے مقبرہ کا نقشہ جو فقط پنسلی تھا اور جس قدر پلیٹ پہاڑ سے بنا کے لائے اُن کو گھر پر لا کے درست کیا، زمینی نقشہ کو پکا کر کے رنگ بھرا قبر اور مسجد کی جگہ پہاڑ کی گھاٹ سب مناسب رنگ بھر کے بہت ہی خوبصورت نقشہ بنایا پھر اپنی تجویز سے ایک نہایت خوشنما مقبرہ جس پر ایک شاندار گنبد طلائی کلس کے ساتھ دکھایا تھا مسجد میں کچھ اضافہ تجویز کیا، ایک چھوٹا سا امام باڑہ یہ سب تجویزی نقشہ صرف اختری کا دل خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ پھر عکسی تصویریں تھیں۔ ہر ہر موقعہ کی بہت ہوشیاری سے چھاپ کے رکھ چھوڑی تھیں۔

جب اختری اُن کے گھر پر گئی۔ یہ سب نقشے دکھائے مقبرہ کی تجویز اختری نے بہت پسند کی مگر اُس کی تعمیر اس وقت کے لئے، اُٹھا رکھی گئی جب اختری کو اپنا ذاتی اختیار ہوگا۔ اُس کے بعد نواب مرزا نے مراد علی کا ذکر چھیڑا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ مراد علی نے اپنی صفائی جتلانے کو اپنا نام بتادیا تھا مگر نواب مرزا ایسے فقروں میں کب آنے والے تھے۔

نواب مرزا۔ یہ مراد علی کون شخص ہے؟ اور ہے بھی تو اُس کو تم سے یا تمہاری والدہ سے کیا مطلب ہے؟

اختری۔ پہلے تو ہکا بکا ہو گئی پھر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد۔ جی ہاں میں سمجھ گئی۔ کیوں!

نواب مرزا۔ جب میں تصویر بنا رہا تھا تو وہ وہاں گئے تھے، انھوں نے تو اس حکومت سے تفتیش شروع کی جیسے افسر پولیس خونی مقدمہ کی تحقیق کرتا ہے۔ مگر میں ایسے دباؤ کب سہتا ہوں، میں نے ایسے معقول جواب دئے کہ وہ بھی خوش ہو گئے ہوں گے۔ میر صاحب (قرآن خوان) نے تو اُن کو الّو بنا کے دو روپیہ بھی اینٹھ لئے مگر بتایا کچھ نہیں۔

نواب مرزا نے پورا واقعہ سوال و جواب حرف بحرف اختری سے بیان کیا اس پر دیر تک ہنسی ہوتی رہی، مگر اختری دل میں کچھ اور فکر کر رہی تھی اُسکو صاف معلوم ہو گیا کہ اس میں جعفری کی سازش ہے مگر اُس نے منہ سے نہیں کہا صرف نواب مرزا سے۔

اختری۔ یہ ماموں جان کے مختار کا بھتیجا ہے۔ ماموں جان اُس کی قابلیت کی بڑی تعریف کرتے ہیں مگر بہن نادری کو اُس کی صورت سے نفرت ہے اور مجھکو بھی اُس کی کچھ کچھ باتیں سُن کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی کچھ اپنی حقیقت سمجھتا ہے۔ جعفری باجی کا بڑا خیر خواہ ہے اُن کا جو کچھ کام ہوتا ہے اُسی سے کہلا بھیجتی ہیں۔ کبھی کبھی کچھ صلاح مشورے بھی ہوتے ہیں مگر مجھ کو اس سے کیا۔ اور آپ کو کیا۔

نواب مرزا۔ سنو بیگم صاحب تم میری بیٹی کے برابر ہو مگر تمہاری نیکی اور بھولے پن نے مجھ کو اتنا گرویدہ کر لیا ہے۔ شریف جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ محبت زبانی نہیں ہوتی مجھے ضرور اُس مردود سے اندیشہ ہے وہ مجھکو بڑا جعلیہ معلوم ہوتا ہے بھائی خورشید مرزا اُس کی چالاکیوں سے اُس کے دَم میں آ گئے ہیں، وہ مختار کا بھتیجا ہے یا خود مختار سہی، اُسکو تمہاری ماں کے قبر پر جانے اور تفتیش کرنے سے کیا واسطہ یہ کوئی گہری بات ہے اور ہم کو احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ مگر تم خاطر جمع رکھو میں اس مردود کی پوری خبر لے لوں گا۔ ایک شریف زادی کے حالات کی تفتیش سے کیا مطلب ہو سکتا ہے شاید اس کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ تم صاحب جائداد ہو اب اُس کو اُس جائداد سے ناجائز نفع اٹھانے کی فکر ہے۔ خورشید مرزا کو بہت ہوشیار رہنا چاہئے، مگر اُن سے

کون کہے وہ اُس کے قابو میں ہیں۔

نواب مرزا۔ دُھن کے پکے اور قول کے پورے تھے جس دن سے مراد علی کو اختری کی ماں کی قبر پر دیکھا تھا اُن کو اس کی فکر ہو گئی تھی۔ اکثر اُس کی ٹوہ میں رہتے تھے، اوّل تو وہ حکیم جعفری سے ملے کیونکہ اختری کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ اختری کی والدہ کے معالج تھے اور بیمار پرسی بھی گئے تھے بلکہ اُن سے اختری سے قرابت بھی ہے یہ بھی اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ نادر کی شادی اُن سے ہونے والی ہے۔ جعفر علی کے حُسن اخلاق اور صاحب مروّت اور خلوص اُن کو دل سے پسند تھا۔ اُنھوں نے پہلے ان کو خوب ٹٹولا قابل اطمینان پایا۔ آخر یہ ٹھہری۔

دو دِل یک شود بشکند کوہ را

اس بے گناہ مالدار لڑکی کو جعلیوں کے دام سے بچانا چاہیے، مگر وہ خود مراد علی کے حالات سے نابلد تھے البتہ شیخ احمد علی کا بہت دن تک علاج کیا تھا۔

نواب مرزا۔ تو میں آپ کی طرف سے شیخ احمد علی سے ملوں۔ حکیم صاحب نے کہا مناسب ہے۔ حکیم صاحب نے نواب خورشید مرزا کے مکان پر اُن کو دیکھا تھا۔ مکان یہ بھی نہیں جانتے تھے۔ نواب مرزا نے مراد علی کو اچھی طرح پہچان لیا تھا، جوئندہ یابندہ ایک دن وہ راہ میں کہیں مل گیا، نواب مرزا اس طرح اُس کے پیچھے پیچھے ہوئے کہ اُس نے ان کو نہیں دیکھا، پھر وہ ایک مکان میں گھس گیا یہ دور ٹھہرے رہے کوئی آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرنے کے بعد وہ اُس گھر سے نکلا اور اس درمیان میں ایک کرایہ کی گاڑی خالی دروازہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ مراد علی گھر سے نکل کے اُس گاڑی پر بیٹھا اور کچہری کی جانب گیا، یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جب وہ سوار ہو گیا تو اُنھوں نے ایک دوکاندار سے جس کی دوکان اُس مکان کے دروازہ پر تھی دریافت کیا یہ کس کا گھر ہے؟ معلوم ہوا شیخ احمد علی مختار اس گھر میں مُدّت سے رہتے ہیں یہ اُن کو معلوم تھا کہ مراد علی کچہری گیا ہے غالباً دیر میں

آئے گا۔ میدان خالی تھا، نواب مرزا نے دروازہ پر دستک دی، اندر سے آواز آئی کون ہے؟ آسیئے مردانہ مکان ہے، نواب مرزا بے تکلف مکان میں چلے گئے، دیکھا ایک بوڑھا شخص سیاہ فام سفید برف سے بال، چہرہ پر جھرّیاں پڑی ہوئی ضعیف بیمار پلنگ پر پڑا ہے، یہ سامنے گئے۔

نواب مرزا۔ السلام علیکم۔

ضعیف۔ (اٹھنا چاہا، نواب مرزا نے اصرار کر کے اُٹھنے نہیں دیا)۔ وعلیکم السلام۔

نواب مرزا۔ جناب کا نام شیخ احمد علی صاحب ہے۔

احمد علی۔ اس عاجز کا یہی نام ہے۔ کیا آپ نواب خورشید مرزا کے پاس سے آئے ہیں۔

نواب مرزا۔ کل حکیم جعفر علی صاحب سے کچھ آپ کا ذکر سُن کے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اپنا یہ ارادہ حکیم صاحب پر ظاہر کیا تو حکیم صاحب نے کہا مجھکو بھی ایک مدت سے اُن کے مزاج کا حال نہیں معلوم ہوا اگر آپ کا جانا ہو تو میری طرف سے بھی مزاج کا حال دریافت کیجئے گا۔ عجب ہے کہ شیخ صاحب نے مجھکو بُلا کے اپنا حال نہیں دکھایا اس خیال سے کہ شاید کسی اور کا علاج ہے، میں نے بھی خود جانا مناسب نہ سمجھا مگر مجھے اُن کا خیال ضرور ہے۔ میں ادھر کو جا رہا تھا معلوم ہوا کہ آپ اس مکان میں فروکش ہیں بے تکلف چلا آیا۔ معاف کیجئے شاید آپ کا کچھ حرج تو نہیں ہوا۔

شیخ احمد علی۔ بڑی بندہ نوازی کی اور آپ مجھ سے اُلٹی معافی چاہتے ہیں، بڑی نوازش کی میری حالت ظاہر ہے مدت سے صاحب فراش ہوں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ اکیلا پڑا رہتا ہوں، آپ کے آنے سے میرا دل بہل گیا ہے۔

نواب مرزا۔ نہیں ابھی ایسی حالت تو خدانخواستہ نہیں ہے علاج سے آپ نے بے پروائی کی جیسا کہ حکیم صاحب سے معلوم ہوا ورنہ اب تک کب کی صحت ہو جاتی، برائے

خدارا آپ علاج کیجئے۔ میں حکیم صاحب کو آپ کے مکان کا پتہ دے کے بھیجدوں گا۔ کیا آپ یہاں بہت دن سے رہتے ہیں تو حکیم صاحب کو معلوم ہو گا۔

شیخ احمد علی۔ اس مکان میں مدت سے رہتا ہوں۔ حکیم صاحب جانتے ہیں۔ آپ بھی طبیب ہیں، آپ کی مریض نوازی سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

نواب مرزا۔ جی نہیں (اس طرح کہا جس سے نہ انکار نکلتا تھا نہ اقرار) میں حکیموں کے خادم ہونے کے لائق بھی نہیں ہوں۔

شیخ احمد علی۔ یہ آپ کا انکسار ہے۔ خیر آپ کے حالات میں حکیم جعفر علی صاحب سے دریافت کر لوں گا، اسم مبارک!

نواب۔ مجھ کو نواب کہتے ہیں، بھتیجے کو فقط مرزا بتایا تھا، چچا کو نواب۔

شیخ احمد علی۔ میر نواب صاحب۔

نواب مرزا۔ سیدوں کا خانہ زاد ہوں۔

شیخ احمد علی۔ آپ کا انکسار ماشاء اللہ بہت بڑھا ہوا ہے اچھے لوگوں کا یہی قاعدہ ہے۔ اچھا تو حکیم صاحب کو میری طرف سے بہت سلام و نیاز کہئے گا اور کہئے گا، اب میں بوڑھا ہوا کہاں تک حکیم جعفر صاحب گھسیٹ گھسیٹ کے مجھے زندوں میں ملانے کی کوشش کریں گے، بڈھوں کا مرنا ہی مناسب ہے تاکہ جوانوں کے لئے میدان خالی ہو بس بہت جی چکے۔ اب قیامت کے بورے سمیٹنا ہیں۔

شیخ کی گفتگو میں اگرچہ یاس کا پہلو نکلتا تھا لیکن فی الجملہ مذاق سے خالی نہ تھی۔

نواب مرزا۔ آپ کی باتیں ماشاء اللہ لطف سے خالی نہیں، گھر میں آپ کے بقید حیات میں کوئی اولادیں ہیں۔

شیخ احمد علی۔ گھر کے لوگوں کو مرے ہوئے مدت ہوئی اولاد کی طرف سے بھی میں کم نصیب ہوں، کئی لڑکے لڑکیاں ہوئیں مگر کوئی زندہ نہ رہی۔ اب ایک بھتیجا ہے

مراد علی - ماشاء اللہ بڑا کارگذار ہے اور قابل ہے - نواب خورشید مرزا صاحب نے براہ قدیم نوازی سب کاروبار اُس کے سپرد کر دیا ہے اور اُسنے بھی اپنی کارگذاری سے نواب صاحب کو راضی کر لیا ہے - کُل کاروبار کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے نواب صاحب کو ذرا سی تکلیف نہیں کرنے دیتا -

نواب مرزا - کیوں نہیں اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں مگر یہ آپ کی محبت ہے بھلا آپ کی سی تجربہ کاری اور لیاقت کہاں سے کوئی لائے گا، میں تو نہ مانونگا -

شیخ احمد علی - جی نہیں وہ مجھ سے کہیں زیادہ کارگذار ہے جن تدبیروں سے وہ کام کرتا ہے خصوصاً مقدمات وہ طریقے میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم یہ نہیں کہتے کہ وہ پکا جعلیہ ہے، ہاں سیاق میں مجھکو اچھی دستگاہ تھی لیکن مراد علی کہتا ہے کہ اب میرے حسابات میں اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں، اب میں قابل اطمینان میزان متوفی نہیں لگا سکتا یا دن رات روپیہ آنہ پائی نوک زبان تھا یا اب میرا خود جی گھبراتا ہے

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

یہ مصرعہ پڑھ کے پُرانے کارگذار مختار کارنے ایک ٹھنڈی سانس لی -

نواب مرزا - شیخ صاحب ہمت نہ ہارئے، آپ بیمار ہیں - علالت خدا نے چاہا رفع ہو جائے گی پھر اسی طرح آپ کام کرنے لگیں گے " نواب مرزا نے فقط تشفی کی راہ سے کہا تھا " بڈھا سچ کہتا تھا -

شیخ احمد علی - جی نہیں نواب صاحب، اب میرے کام کرنے کا زمانہ گذر گیا یہ سب ظاہر تشفی ہے " مراد علی سچ کہتا ہے معاملات زر میں میرے کام پر بھروسہ نہیں ہو سکتا -

نواب مرزا - بات کا پہلو بدل کے - خیر تو مراد علی کے کام پر آپ کو پورا بھروسہ ہے -
یہ سوال سرسری طور سے پوچھا گیا تھا مگر بڈھے مختار نے نہایت مضبوطی سے

جواب دیا، مقصود یہ تھا کہ سوال کرنے والے کو شیخ احمد علی کی رائے استحکام کے ساتھ معلوم ہو جائے۔

شیخ احمد علی۔ مجھ کو اس لیاقت پر کامل بھروسہ ہے۔ ہاں جوان آدمی ہی ذرا اُمنگ بڑھی ہوئی ہے اپنی سن و سال سے زیادہ ذمّہ داری لینے کی جرأت کر بیٹھتا ہے۔ کسی قدر جلدی بھی کرتا ہے یہ سن کا تقاضہ ہے۔ خون میں گرمی اور جوش زیادہ (یہ آخری فقرہ زیر لب گویا اپنے سُنانے کے لئے کہا تھا جیسے نواب مرزا اُس کے مخاطب صحیح نہ تھے) مگر نواب خورشید مرزا کی ریاست کا کام روز بروز بگڑتا جاتا ہے۔ روپیہ کی سخت ضرورت ہے اور روپیہ کہیں ہے بھی مگر نواب صاحب اس روپیہ میں ہاتھ لگانے کو نہیں کہتے۔ نواب صاحب نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ زرِ امانت ہے اُس کو چھونا نہ چاہیئے۔

نواب مرزا۔ کیا یہ زرِ امانت بھی آپ کے بھتیجے کے اختیار میں ہے۔

شیخ احمد علی۔ جی نہیں اُس کو زرِ امانت سے کوئی تعلق نہیں ہے (پُرانے مختار نے یہ اس طرح کہا تھا جیسے کوئی چونک پڑتا ہے) میں نے اس امانت کے باب میں مُراد علی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا، میرے نزدیک بھی اس امانت کو ہاتھ سے نہ چھونا چاہیئے، ہر ایماندار شخص کی یہی رائے ہوگی، میں کچھ غلط تو نہیں کہتا؟

نواب مرزا۔ آپ کا خیال بجا اور درست ہے اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

شیخ احمد علی۔ وہ جس کی امانت ہے خُدا جلد تر اس کو اس قابل کرے کہ وہ اپنے مال کی خود حفاظت کر سکے۔ سُنتا ہوں بڑی نیک لڑکی ہے۔

نواب مرزا نے یہ جُملے اس طرح سُنے جیسے اُن کو نہ اس معاملہ سے کوئی دلچسپی ہے نہ کوئی اطلاع۔

شیخ احمد علی۔ بہت بڑی جائداد ہے، نواب صاحب کہتے تھے، اسّی نوّے لاکھ کا

تخمینہ ہے۔ اس رقم سے تو ایک اچھا خاصہ راج مول لیا جاسکتا ہے۔ بہت بھاری منافع ہی۔

نواب مرزا کو شیخ احمد علی کی خرافت کا پورا یقین ہو گیا۔ انھوں نے خیال کیا کہ جب مجھ سے دو باتوں میں انھوں نے سارا راز کہہ دیا تو بھتیجے سے کیا نہ کہا ہو گا۔ اسی سے تو اس کو بے تابی ہے کہ سب نہ سہی تو اس جائداد سے رقم کثیر ہتھے چڑھ جائے۔

شیخ احمد علی۔ مجھے خوف ہے کہ نواب صاحب کہیں مراد علی کو اس راز میں نہ شریک کرلیں۔

نواب مرزا۔ (تعجب سے) کیوں ایک لائق اور ایماندار کارندے کو رازدار بنانے میں کیا ضرر ہو سکتا ہے؟۔

شیخ احمد علی۔ مراد علی میرا بھتیجا ہے اور اس کی دیانتداری پر مجھکو پورا بھروسہ ہے۔ لیکن پھر جوان ناتجربہ کار ہے شاید روپیہ ایسے کاروبار میں جھونک دے جس میں نقصان اٹھانا پڑے۔ آئے دن بنکوں کے دیوالے نکلا کرتے ہیں تو اور کسی تجارت کا کیا ذکر ہے جس کا روپیہ ہے اُس کو بجنسہٖ پہنچا دینا چاہئے خود تصرف اچھا نہیں ہے۔

نواب مرزا۔ (بوڑھے مختار کی دیانت اور دُور اندیشی سے خوش ہو کے) بے شک یہ خیال آپ کا بیجا نہیں ہے۔ میں آپ کی تجربہ کاری اور دیانت کی داد دیتا ہوں، بے شک زرِ امانت کو محفوظ رکھنا چاہئے مگر ایک بات دریافت طلب ہی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بھتیجے سے یہ راز اب تک چھپا ہوا ہو گا۔

شیخ احمد علی۔ (یہ سمجھ کے کہ یہ ٹیڑھا سوال ہے کچھ دیر سکوت کیا) ابھی تک اُس سے مخفی رکھا گیا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ اُس نے کسی نہ کسی طرح کچھ پتہ لگا لیا ہو کیونکہ اُس کی ہوشیاری میں کوئی شک نہیں، جناب یہ اُس زمانے کے لڑکے ہم کو آپ کو بھرے بازار میں بیچ لیں۔ وہ ہمارا بھولا زمانہ تھا۔

نواب مرزا (یہ سمجھ کے کہ احمد علی کو میری طرف سے کوئی شبہ نہ پیدا ہو) بات

کا پہلو بدل اس تذکرہ کو بالکل اُڑا دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دس منٹ کے بعد اجازت چاہی۔

شیخ احمد علی۔ تو کیا تشریف لے جایئے گا، پھر بھی کبھی مجھ پر کرم فرمایئے گا، آپ کے آنے سے بہت دل بہل گیا۔

نواب مرزا۔ فرصت کم ہوتی ہے مگر انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔

# باب ۱۱

## یہ ہمارے حال کا جویاں کون ہے؟

برسات کے دن ہیں۔ ابر محیط آسماں سے برس کے کھل جاتا ہے۔ پھر برسنے لگتا ہے۔ آم اس افراط سے ہے کہ ٹوکرے کے ٹوکرے گاڑیاں کی گاڑیاں جو منڈی میں نہیں بکتیں لوگ اسی طرح زمین پر ڈال کے چلے جاتے ہیں باغوں میں جھولے پڑے ہیں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گا رہی ہیں، ہلکے ہلکے پینگ لے رہی ہیں۔

نیم کی نبکولی پکّی ساون کب آویگا

اور جو چالاک جوانیں ہیں وہ اونچے اونچے پینگ لے رہی ہیں۔ ڈرنے والیاں دوہی دوہی کرکے چیخ رہی ہیں، بھئی ہمیں اتار دو۔

آیا ساون کا مہینہ پہنو دھانی چوڑیاں

خورشید مرزا کے مکان میں بھی خاص چہل پہل ہے نادری نے باغ جانے کی تیاری کی ہے۔ جعفری ایک مہینہ کے لیے اپنی ممانی کے گھر میں جو فیض آباد میں رہتی تھیں مہمان گئی ہیں نادری آجکل گھر کی منتظم ہیں۔ اناج گھی کوٹھریوں سے بھی نکلواتی ہیں، یہی کھانا پکواتی ہیں، کنجیوں کا گچھا ازار بند میں بندھا ہوا چھنچھنا رہا ہے نادری کبھی اندر آتی ہیں کبھی باہر جاتی ہیں۔ جعفری کے اکل کھرے پن سے چھوٹوں سے لے کے بڑوں تک اس کی اس چند روزہ باہر جانے سے خوش تھے یہاں تک کہ خورشید مرزا بھی اگرچہ وہ جعفری کی ذرا سی بے چینی سے خود بے چین ہو جاتے تھے اس لیے کہ ان کو معلوم تھا کہ جعفری جلتی

ہے کسی کو بُرا کام کرتے دیکھ نہیں سکتی مگر مجھ کو بہت چاہتی ہے مگر رات دن کی رنجشوں سے جو اختری کی وجہ سے تھیں جعفری کے جانے سے خوش تھے، یہ ویسی ہی خوشی تھی جو چھوٹے بچوں کو مکتب میں مولوی صاحب کے کہیں چلے جانے سے ہوتی ہے نواب مرزا کا لڑکا لڑکی اسی گھر میں کھیلتے پھرتے ہیں، اختری کا چہرہ بھی بحال اب کسی قدر منہ کی اُداسی کم ہوتی جاتی ہے۔ ہرمزی سے بھی باغ کے چلنے پر اصرار کیا جاتا ہے وہ نوکری کا عذر کرتی ہے۔

اختری۔ اللہ بہن ہرمزی اچھا تو کل اتوار ہے دن بھر کے لیے، تو تم بھی باغ میں چلو۔

ہرمزی۔ اتوار کے دن مجھ کو کہاں فرصت ملتی ہے آٹھ دن کا دھندا اُسی دن تو کرنا پڑتا ہے۔

اختری۔ اچھا تو آج ذرا سویرے سے چلی جاؤ۔ کل کے سب کام آج کرلو کل چلی آنا، میں سواری کے لئے قادر بخش کا اِکّہ بھیج دوں گی۔

ہرمزی۔ اماں جو اکیلی رہیں گی اور گھبرائیں گی۔

اختری۔ میں کریمن سے کہہ دوں گی وہ دن بھر بیٹھی رہے گی۔ ہرمزی نیم راضی ہو گئی۔

باغ میں جانے کی بڑی خوشی تھی۔ سواریاں ڈیوڑھی پر لگی تھیں اتنے میں خورشید مرزا اندر آئے مگر چہرہ پر تشویش کے آثار جس کو اختری دیکھ کے فکر کرنے لگی کہ آخر کیا ہے جو آج ماموں جان ایسے فکرمند معلوم ہوتے ہیں۔

نواب مرزا۔ (اختری کو علیحدہ بُلا کے) کل مراد علی آیا تھا؟

اختری۔ جی ہاں آیا تھا۔ بہن نادری نے ایک تھان جامدانی کا منگوایا تھا وہ دے کے چلا گیا۔ شاید آپ سے بھی ملنے والا تھا، سُنا ہے وہ کہتا تھا کہ اُس کو کوئی

ضروری کام ہے۔

خورشید مرزا۔ یہاں تو ملاقات نہیں ہوئی۔ کل میں شیخ احمد علی کو دیکھنے گیا تھا وہاں وہ بھی ملا تھا شاید یہاں سے ہو کے میری تلاش میں وہاں گیا ہو۔ مجھے خیال تھا اُس نے خود تم سے بُلا کے کچھ کہا ہو۔

اختری۔ مجھ سے تو کبھی اُس سے باتیں نہیں ہوئیں (اور کسی قدر منہ بنا کے) مجھ سے وہ کیوں باتیں کرتا!

خورشید مرزا۔ کیا تم کچھ اُس سے خفا ہو۔ گھر کا رندہ ہے۔ اسی گھر میں پرورش ہوا ہے اگر بات کرتا تو کیا برائی تھی۔ امیرزادیاں اپنے کارندوں سے بات کرتی ہیں حکم احکام دیتی ہیں اس میں کوئی عیب نہیں ہے تم کو معلوم ہے میرے ایسے تنگ اور بیہودہ خیالات نہیں ہیں، میں عورتوں کے کال کوٹھریوں میں بند رکھنے کو بہت بُرا جانتا ہوں۔ عورتوں کو خود اپنی حُرمت کا خیال ہوتا ہے مردوں کو اُن پر اعتبار چاہیے۔

اختری۔ نہیں میں تو اُس سے آزردہ نہیں ہوں۔ بہن نادری کو البتہ اُس سے نفرت ہے بلکہ وہ تو کچھ ڈرتی سی رہتی ہیں۔

خورشید مرزا۔ نادری بالکل بے وقوف ہے بھلا اُس سے ڈرنا کیا کوئی جِن ہے۔ تم نادری کی حماقت پر خیال نہ کرو۔ بڑا لائق کارندہ ہے بہت کارگذار ہوشیار۔ نادری جامدانی کا تھان منگوانے کو ہیں اور پھر ڈرتی بھی ہیں۔

اختری۔ نادری، اسکی تو قائل ہیں کہ سودا سلف اُس سے بہتر کوئی نہیں لاسکتا مگر وہ کبھی اُس سے بات نہیں کرتیں۔

خورشید مرزا۔ نادری کی بے وقوفیوں کا ذکر چھوڑو۔ ہاں تو مرادعلی نے تم سے کچھ نہیں کہا یا کہلوایا۔

اختری۔ ذرا گھبرا کے تو کیا کوئی خاص بات میرے متعلق تھی۔

خورشید مرزا۔ ہاں یہی بات ہے۔ لیکن مجھے تو کوئی خوف نہیں ہے۔ مراد علی کو بڑی تشویش ہے۔

نواب صاحب کو خود تشویش تھی مگر اپنی طبیعت کے ضعف کو مراد علی کی آڑ میں چھپانا چاہتے تھے، خود نواب صاحب کے چہرہ پر تشویش کے آثار تھے، جس کو خود اختری پہچان گئی جو دیکھتا پہچان لیتا۔

اختری۔ اموں جان آپ نے تو جیسے مجھکو ڈرا دیا۔ تو وہ کیا بات ہے کہدیجئے تو مناسب ہے۔

خورشید مرزا۔ اُسی بات کے کہنے کو میں نے تمہیں بلایا ہے۔ اچھا شیخ احمد علی کا نام تم نے تو سُنا ہوگا۔

اختری۔ آپ کے پُرانے مختار مراد علی کے چچا ہاں میں نے اکثر اُن کا ذکر سُنا ہے شاید بہت بیمار ہیں۔

خورشید مرزا۔ سخت علیل ہیں، انتہا کا ضعف ہو گیا ہے۔ ضعف دل ضعف دماغ، نسیان حد کا بڑھ گیا ہے۔ حساب کتاب سے اُلجھتے ہیں دماغ میں بات نہیں سماتی۔ اب وہ کسی کام کے نہیں ہیں خیر خدا زندگی رکھ لے میرے بڑے رفیق اور خیر خواہ ہیں اُنھیں کا بیان ہے کہ چند روز ہوئے کوئی شخص جس کو احمد علی نے اُس دن کے سوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیخ احمد علی کے دروازے پر دستک دی۔ شیخ صاحب سے ملنا چاہا۔ شیخ صاحب مردانے مکان میں تنہا رہتے تھے۔ اُنھوں نے بے تکلف بُلا لیا۔ وہ تمہاری جائداد کے بارے میں ہنڈی کی چندی پوچھتے تھے، کس کس بینک میں، کن مہاجنوں کے پاس ہے کس کس کارخانے میں کن کمپنیوں میں کتنے حصے ہیں، جیسے کوئی پورا بھید لیتا ہو۔

مراد علی کا بیان ہے کہ چچا کے حواس درست نہیں ہیں ممکن ہے کہ چچا نے اُن کو

کچھ بتا دیا ہو، بیان تو اُن کا یہی ہے کہ میں نے آمین بائیں شائیں بتا کے اُن کو ٹال دیا۔ مرادعلی کو اس کا خیال بھی نہ ہوتا اور وہ کہتا ہے کہ اس مہمل بات کا آپ سے (یعنی مجھ سے خورشید مرزا سے) ذکر بھی نہ کرتا۔ مگر چار دن ہوئے شیخ احمد علی کو آپ ہی آپ پھر اُس بات کا خیال آ گیا یا مرادعلی نے چھیڑ کے پوچھا، بہرصورت شیخ صاحب نے مُرادعلی سے بتاکید کہا نواب صاحب سے اس امر کا تذکرہ ضرور ہے اور خود صاحبزادی (یعنی تم اختری سے) دریافت کرنا چاہئے۔ کیا واقعی تمہارے کوئی چچا ہیں؟

اختری۔ مجھے تو کوئی چچا یاد نہیں۔ میرا کون پوچھنے والا ہے۔ شیخ صاحب کے حواس درست نہیں ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیا ہوگا۔

خورشید مرزا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے تم سے کہا نہ کہ شیخ صاحب اس گھر کے بڑے خیر خواہ ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہوگی کچھ کسی سے سُن لیا ہوگا، شیخ صاحب کی احتیاط پیرانہ سالی اور ضعف مرض کے سبب سے بڑھ گئی ہے بلکہ خوف کہنا چاہئے جب دل کمزور ہو جاتا ہے چھوٹی سی کنکری کو آدمی پہاڑ سمجھنے لگتا ہے۔

اختری۔ درست ہے مُنہ سے تو درست بجا کہہ دیا لیکن اختری کو بڑی دیر تک اسی کا خیال رہا، آخر فکر کرنے کرتے وہ سمجھ گئی ہوں نہ ہوں نواب مرزا ہوں مگر اس کا تذکرہ خورشید مرزا سے مناسب نہ تھا۔ سالے بہنوئیوں میں رنجش ہو جانے کا خوف تھا۔ پھر اختری نے چاہا کہ منصوری پہاڑ پر نواب مرزا کو جو واقعہ پیش آیا تھا اُس کا تذکرہ کیا جائے لیکن یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا اس لئے کہ اس میں بھی نواب مرزا کا نام آتا اختری ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ کیا ضرور تھا کہ نواب مرزا کی خیرخواہی خورشید مرزا پر ظاہر ہو، خدا جانے کیا خیالات پیدا ہوں، بالآخر اُس نے فکر کر کے کہا تو یہ کہا۔ "میں نہیں خیال کرتی کہ اس کی چوری کا ہے کی مجھکو جو کچھ ماں باپ کے ترکہ میں ملا ہے وہ میرا مال ہے لوگوں کو خدا جانے کیا فکر پڑی ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے بقول حافظ شیراز۔

نہاں کہ ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

جو خرابیاں اب تک پیدا ہوئیں یا آگے ہوں وہ اس کے چھپانے سے ہوئیں اور ہوں گی، ظاہر ہی کر دینا چاہیئے تھا۔

خورشید مرزا۔ میں پہلے ہی سے اِس کے خلاف تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ تمہاری ماں نے کس اصرار سے مجھکو راضی کیا تھا۔

اختری۔ مجھ کو خوب یاد ہے۔ اور جن باتوں کا آپ کو خیال تھا وہ سب آگے آئیں، ا۔۔ر ابھی دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے۔ پھر میں کہوں گی کہ میرا مال میری جائداد لوگوں کو کاہے کا ملولا ہے۔

خورشید مرزا (اختری کی ناتجربہ کاری پر مسکرا کے) ابھی تم بچّہ ہو، دولت بہت اچھی چیز ہے اور بہت بُری چیز ہے۔ اچھی اس لئے ہے کہ دنیا کا کوئی کام بغیر اس کے نہیں چل سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ خدا بھی دولت سے ملتا ہے۔ بُری اس لئے کہ دولت والے کے ہزاروں دشمن پیدا ہو جاتے ہیں، شیطان کو اس کے ذریعہ سے بہکانے کا اچھا موقع ملتا ہے۔

اختری۔ یہ بجا ہے لیکن دولت والا چاہے تو اُس کے دوست بھی بہت پیدا ہو سکتے ہیں۔ (یہ نواب مرزا اور ہرمزی کو دل میں رکھ کے کہا تھا۔)

خورشید مرزا۔ دولت کی وجہ سے جو دوست پیدا ہوتے ہیں وہ درحقیقت دولت کے دوست ہوتے ہیں، اور دولت والے کے دشمن۔

اختری۔ مگر سب بندگان خدا یکساں نہیں ہوتے، اکثر خدا کے بندے تنکا اتارنے کا احسان مانتے ہیں۔

خورشید مرزا۔ مگر اچھے کم اور بُرے بہت ہیں، اس لئے دوست کم اور دشمن

زیادہ ہیں۔

اختری۔ (ذرا اُلجھ کے) جب سب طرح مشکل ہے تو پھر کیا کیا جائے۔

خورشید مرزا۔ یہی اصل بحث ہے اور دولت والے کو اس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے دولت والے کی بڑی بھاری ذمہ داریاں ہوتی ہیں اُس کو دُنیا میں پھونک پھونک کے قدم رکھنا پڑتا ہے، دولت ہونا بھی مشکل، نہ ہونا بھی دشوار۔ رکھنا بھی مشکل، اُٹھانا بھی دشوار۔ مردوں کو مشکلیں پڑتی ہیں، عورت ذات کے لئے تو سخت مشکلیں ہیں۔

اختری۔ دل میں خدا چاہے تو سب آسان ہو جائیگا۔ اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ خدا عادل ہے ظالم نہیں ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہوگا۔ وہ تو بُروں کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہے، بس آدمی کو چاہیئے نیک نیت رکھے۔

# باب ۱۲

## دوسرا دعویدار ولایت

کوئی گلچیں ہو یا صیاد ہو ——— جو عدوئے باغ ہو برباد ہو

برسات کا سماں، لڑکیاں بالیاں چھوٹے لڑکے نوکر چاکر باغ میں کوئی جھولا جھول رہا ہے۔ کسی نے ٹپکے آم ایک درخت کے تھالے میں جہاں برسات کا پانی بھرا ہے اکٹھا کئے ہیں۔ لیکن آم کھائے جاتے گٹھلیوں سے چوتھی کھیلی جاتی ہے کسی کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہیں کوئی سر سے پاؤں تک امرس بن گیا ہے۔ پانی برس رہا ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں درختوں کی ڈالیاں مستانہ جھوم رہی ہیں، بیلے، چمیلی، جوہی کے پھولوں کی مہک سے تمام باغ معطر ہو رہا ہے۔ پھول چنے جاتے ہیں گلدستے بنائے جاتے ہیں، ہار گوندھے جاتے ہیں، نازک مزاج بیویوں نے کانوں کے لووں میں بیلے کی ایک ایک کلی ڈال لی ہے۔ ماما اصیلوں کی چوٹیاں ہاروں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ جھولے کا رسا کھل گیا جھولنے والے دھما دھم گر رہے۔ چھوٹے لڑکے رو رہے ہیں بڑے پھر سنبھل کے اٹھ کھڑے ہوئے پھر سے جھولا ڈالا جاتا ہے۔ ایک طرف دیہاتی چولھوں پر جو اسی وقت بنائے گئے ہیں پوریاں تلی جاتی ہیں۔ ترکاریوں کی بھجیا بنائی جاتی ہے کوئی گھر سے توشہ بھروسہ لے کے چلا ہے۔ میٹھے آموں سے روغنی روٹیاں کھائی جاتی ہیں۔ نادری اختری کو جھولا جھلانے کے لئے بڑے اصرار سے لائی تھی۔ یہ راضی نہیں ہوتی وہ ضد کر رہی ہے یہاں تو

یہ جشن ہو رہا ہے۔ خورشید مرزا کنوئیں کی جگت کے پاس سر پکڑے بیٹھے ہیں ان کی قسمت میں تردد اور فکرمندی لکھدی گئی ہے، آج بہت ہی اداس ہیں۔ اختری سے تو یہ کہدیا مجھے کچھ خوف نہیں ہے مگر وہ غضب کا اندیشہ ہے کہ عمر بھر نہ ہوا تھا۔ دل ہی دل میں کہتے ہیں میں چین سے اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ لڑکپن کی عاشقی کے خیالات بھول بھال گئے تھے، خورشید بیگم (خدا رحمت کرے) پچیس برس کے بعد بیٹھے بٹھائے ایک نیا غم دے گئیں خود تو بہشت نصیب ہوئیں مجھے عذاب میں گرفتار کردیا ابھی سال بھر ادہر تک مجھکو کوئی خوف نہ تھا۔ زر امانت جہاں کا تہاں تھا۔ ادہر مجھ پر یہ مصیبت پڑ آئی، جائداد نیلام پر چڑھ گئی۔ اُدھر لڑکی نے قسمیں دے کے مجھے اپنا روپیہ صرف کرنے کی ترغیب دی اُدہر اس مراد علی نے جو روپیہ کا حال کہیں سُن پایا پیچھے پڑ گیا۔ آج دس ہزار منگوائے، کل ۲۰ ہزار، مہاجنوں کا در سود لاکھوں دبد یئے گئے، میں نے بھی بے غل وغش صرف کرنا شروع کردیا، لڑکی نے بھی ہزاروں خرچ کئے آج ہزار دے دیجئے، کل دو ہزار دے دیجئے۔ خدا جانے کس کو دیتی ہے کیا کرتی ہے مگر انصاف یہ ہے کہ اگر اُس کے ذمہ دس خرچ ہوئے تو میرے حساب میں ہزار، اچھا خاصہ بار مجھ پر ہو گیا ہے۔ بھلا یہ بار کس طرح ادا ہو گا۔ ابھی تک تو یہ خیال تھا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے یہ قصہ جو مراد علی نے بیان کیا ہے اگر سچ ہے، علی جان کا سگا بھائی زندہ ہے تو وہ لڑکی کا سگا چچا ہے۔ میں دُور کے رشتہ کا ماموں ہوں۔ اس کو ہر طرح ولی ہونے کا حق پہنچتا ہے اگر دعوہ ہوا۔ اور ضرور ہو گا میں نے خود اخبار میں پڑھا ہے اُس نے پتہ دریافت کرنے والے کو اشتہار دیا ہے۔ یہ جو شیخ احمد علی کے پاس کوئی آیا تھا یا وہ خود تھا یا اُس کا کوئی پیروکار تھا بڑا غضب ہوا، وہ کوڑی کوڑی کا حساب لے گا، لاکھوں روپیہ میرے ذمہ ہے۔ اگر میں کہوں گا لڑکی کی رضامندی سے میں نے خرچ کیا ہے تو معقول جواب ہے کہ نابالغ کا کوئی قول فعل قابل اعتبار نہیں، لڑکی

کو ذاتی حساب مجھکو ششماہی دینا پڑتا ہے وہ تو اس خیال سے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے مصنوعی بنا کے بھیجدیا جاتا تھا۔ اب خیانت ثابت ہو گی۔ سوائے جیل خانے کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ اس ضعیفی میں بے آبروئی جیل! ۔ مراد علی کے سوا کوئی رفیق نہیں۔ اُس نے جو مصالحت کی صورتیں پیدا کی ہیں اُسی سے کچھ مفر کی امید ہے بشرطیکہ مدعی بھی رضامند ہو جائے، وہ کاہے کو رضامند ہو گا۔

سخت مشکل یہ ہے کہ اختری کو مثل بیٹیوں کے سمجھتا ہوں، خدا نے اُسکی محبت میرے دل میں ڈال دی ہے۔ ایسی نیک ایسی سیر چشم اپنا روپیہ دیکے عاجزی کرنا اُسی کا ظرف ہے۔ پھر جعفری کے خواہ مخواہ کے طعنے اور اُس کی بُردباری، اگر یہ لڑکی مجھ سے چھن گئی اُدھر تو وہ ہلاک ہو جائے گی اِدھر میں مر جاؤں گا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اس تمام تشویش اور اضطراب کا سبب مراد علی کی وہ تقریر تھی جو اُس نے شیخ احمد علی کے مکان پر خورشید مرزا کے گوش گذار کی تھی وہ تقریر یہ تھی!

مراد علی (خورشید مرزا کو نہایت ادب سے مخاطب کر کے) حضور اُمیدوار ہوں کہ چند ضروری باتیں اِس خادم کی سماعت فرمائی جائیں، بشرطِ اجازت عرض کردوں۔

خورشید مرزا - ہاں ہاں بیان کرو، نواب صاحب کو بالکل گمان نہ تھا کہ یہ تقریر ایسی خوفناک ہو گی۔

مراد علی ۔ اختری بیگم صاحبہ کے واقعات سے حضور نے مجھکو مطلع نہیں کیا، لیکن خادم کو محض براہ خیر خواہی جو کچھ معلوم ہوتا گیا اُس کو یاد رکھتا گیا، یہاں تک کہ جملہ واقعات پر اطلاع ہو گئی، خادم نے خود دخل در معقولات کا قصد نہیں کیا اِس لئے کہ جب سرکار نے مجھ کو قابلِ خطاب نہ سمجھا تو میری کیا مجال اور کیا شامت تھی کہ تم سے دخل دیتا مگر بعض واقعات چچا صاحب کو کسی اور معاملہ کے تذکرہ میں ضمناً کہنا پڑے شاید وہ بھی نہ کہتے مگر محض خیر خواہی اور پاس نمک سے ضعف اور بے حواسی

کے عالم میں زبان سے نکل گئے" بعض واقعات اور ذریعوں سے معلوم ہوئے جس کی تفصیل کو حضور کی سمع خراشی کے لحاظ سے میں فرو گذاشت کرنے پر مجبور رہوں ٹھیک اُسی طرح جیسے دانہ دانہ خرمن اور قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے ایک مدت میں اِس خاکسار کو جملہ حالات معلوم ہو گئے۔ سرکار سے اس امر کے اظہار کی میں معافی چاہتا ہوں یہ فی الجملہ خلاف ادب ضرور ہے کہ جو راز حضور نے مجھ سے پوشیدہ رکھا میں اُس کی تفتیش کروں۔ اور پھر متمردانہ اپنی واقفیت کا اظہار بھی کروں۔ جب یہ راز مجھ پر منکشف ہو گیا تھا، خیر خواہی نے مجبور کیا کہ میں عرض کر دوں، کیونکہ اب نہ کہنا سرکار کو ایک قسم کا فریب دینا تھا۔ کم از کم خادم کو یہی خیال ہوا۔

خورشید مرزا۔ نہیں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے میں خود کسی مناسب وقت پر تم سے ضرور کہہ دیتا، تمہاری کم سنی کے خیال سے نہیں کہا گیا۔ کیونکہ تم کتنے ہی لائق اور ہوشیار کیوں نہ ہو جاؤ میری نظر میں تمہارا تو وہی زمانہ ہے جب تم دو انگل کی لنگوٹی باندھے ننگے بوچے پھرا کرتے تھے۔

مرادؔ علی۔ ذرا جھینپ کے گردن جھکا لی، یہ سرکار کے بزرگانہ الطاف کا پورا ثبوت ہے۔ یہ سرکار کی قدر دانی ہے کہ کسی وقت مجھ کو رازداری کے قابل تصور فرماتے۔

خورشید مرزا۔ معلوم ہوا کہ بہر طور اس اہم معاملہ کا تو تم کو علم ہے بس اس کو دل میں رکھو اور وقت مناسب تک سکوت اختیار کرو، اور وقتاً فوقتاً مناسب احکام کی تعمیل کے لئے آمادہ رہو۔ پھر مرادؔ علی کی طرف دیکھ کر کیا تمہیں کچھ اور اس معاملہ میں کہنا ہے۔

مرادؔ علی۔ ابھی خاص واقعہ قابل توجہ خادم نے عرض ہی نہیں کیا جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی اور سرکار کی سمع خراشی کی۔ مگر قبل اس کے کہ کچھ عرض کر سکوں ایک امر سرکار سے دریافت طلب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا علی جانؔ کا کوئی حقیقی بھائی بھی تھا۔

خورشید مرزا۔ (چونک پڑے وہ نہ جانتے تھے کہ مرادؔ علی اس حد تک اِس معاملہ سے

واقف ہے کہ وہ خورشید بیگم کا علی جان سے نکاح ہونا بھی جانتا ہے) تم علی جان کو بھی جانتے ہو ؟۔

مرادعلی۔ صرف اس قدر کہ وہ اختری بیگم کے باپ تھے، اور کچھ اُن کے بارے میں نہیں جانتا۔

خورشید مرزا۔ (دل میں، اور اس سے زیادہ کیا جاننے کی ضرورت ہے، صرف اسی قدر کہ وہ اختری کے والد تھے۔

مرادعلی۔ (کے چہرے پر وہ بشاشت نظر آتی تھی جیسے کسی جنگ میں حریف کو مغلوب کرنے سے ہوتی ہے، اب مراد علی خورشید مرزا کے اضطراب سے لطف اُٹھا رہا تھا۔ جس طرح ظالم شکاری کسی مرغ نیم بسمل کے پھڑکنے سے خوش ہوتا ہے، کلام کا انداز بالکل مودبانہ اور نہایت سہولت کے ساتھ جس میں شائبہ جوش کا نہ تھا) مجھے چند ہی روز سے بعض اہم واقعات کا علم ہوا ہے، یہ بھی حسن اتفاق ہے ممکن ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح سرکار کی کوئی خدمت کر سکوں۔

خورشید مرزا۔ (بدحواس ہو کے) کونسا اہم واقعہ ؟

مرادعلی۔ (دل میں نواب صاحب نے گویا نہیں سُنا یا میرا مطلب نہیں سمجھے) علی جان کے بھائی میاں جان کا پیدا ہونا۔ مگر اختری بیگم کے حقیقی وارث ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور یہ راز جن دُور اندیشیوں سے اختیار کیا گیا ہے وہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں رہا۔ بہرصورت اختری کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

خورشید مرزا۔ (بہت خوش ہو کے، گویا خوشی محض مصنوعی تھی جس کو مرادعلی خوب سمجھتا تھا، پھر کوئی محل تردد کا نہیں ہے، اصلی مقصد تو یہی ہے کہ اختری محفوظ رہے۔

مرادعلی۔ (شاید نواب صاحب اب تک مجھے سچ مچ بچہ سمجھتے ہیں جیسے ابھی محبت سے اظہار فرمایا تھا) مگر اس میں ایک بات ہے شاید حضور نے اُس طرف توجہ

نہیں فرمائی۔ یعنی اختری بیگم کے ولی ہونے کا حق ۔ اس لئے کہ میاں جان حقیقی چچا ہے اگر وہ ظاہر ہو کے نابالغہ کے ولی ہونے کا دعویٰ کرے تو قانوناً کامیاب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ سرکار سے دُور کی رشتہ داری ہے وہ بھی ماں کی جانب سے۔

خورشید مرزا۔ دل کے اضطراب کی وہ حالت تھی جس کا مراد علی ایسے چلتے پُرزے سے پوشیدہ رکھنا غیر ممکن تھا۔ اگرچہ خورشید مرزا نے کمال خودداری کو قائم رکھا اور لب و لہجہ سے استقلال ظاہر کیا۔ لیکن مجبوری بڑے زور سے دبائے ہوئے تھی جیسے کسی کو شکنجہ میں کس دیا ہو۔ بلکہ قبر کے فشار کا سا عالم تھا، کیونکہ یہ اُن کے سان گمان میں نہ تھا کہ میرے سوا اور کوئی اختری کا ولی ہو سکتا ہے۔ ماں نے ہاتھ میں ہاتھ دیا، کلکتہ ہائی کورٹ نے ولایت کا سارٹیفکٹ عطا کیا۔ اس سے بڑھ کے کیا پختگی ہوگی یہ قانونی ولی کہاں سے نکل آیا وہ اختری کو جس کو میں نے بچوں کی طرح گھر میں رکھا اب وہ مجھ سے زبردستی چھین لی جائے گی۔ خورشید مرزا نے نہایت دلیر ہو کے یہ پیرایہ تقریر کا اختیار کیا، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا تنکے کا سہارا لیتا ہے، مراد علی میرے خیال میں کوئی چچا اختری کا زندہ موجود نہیں ہے۔ جب ہائی کورٹ سے اشتہار جاری ہوا اُس وقت اُس کو سامنے آکے عذر داہ ہونا تھا۔ اب کیا ہوتا ہے۔

مراد علی نے خورشید مرزا کو اپنی تقریر سے بیوقوف بنایا، سرکار قانون کے اونچ نیچ سے واقف نہیں، خادم دن رات یہ کرشمے دیکھا کرتا ہے، لاعلمی کا ثبوت کچھ ایسا مشکل نہیں ہے اولاً تو نام بردہ ایک ہندوستانی ریاست میں مدتوں سے ملازم ہے۔ شاید آجکل اُجین میں ہے جو مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیہ کی عملداری میں ہے، دوسرے شاید وہ ثابت کر سکے کہ جب یہ سارٹیفکٹ حاصل کیا گیا ہے تو مدعی ملک عرب میں مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے گیا ہوا تھا! اور وہاں کئی سال تک رہا۔ اب آیا ہے اور آنے کے

چند روز کے بعد اُس کو علم ہوا ہے - جس تاریخ سے وہ اپنا علم ثابت کرے گا بس وہی تاریخ بنارِ مخاصمت قرار پائے گی -

خورشید مرزا - (اِس جواب کی متانت اور معقولیت کو اچھی طرح سمجھ گئے، مگر اپنی بے پروائی کے اظہار کے لئے کہا) یہ دُور از کار خیالات ہیں دیکھا جائے گا، پیش از مرگ واویلا، کیا مزہ رہے - کہتے تو یہ کہہ رہے تھے مگر دل کا جو عالم تھا وہ دِل ہی جانتا تھا -

مراد علی - ایک تازہ چھپا ہوا اخبار جیب سے نکال کے، نواب صاحب کو ایک اشتہار دکھایا -

اشتہار کا مضمون یہ تھا !

" میری حقیقی بھتیجی اختری بیگم سِن تخمیناً سولہ برس میرے حقیقی بھائی علی جان مرحوم ساکن مٹیا برج کلکتہ کی بیٹی مسماۃ خورشید بیگم کے بطن سے مفقود الخبر ہے جو شخص اُس کے ٹھیک پتہ سے مجھکو اطلاع دے گا - سو روپیہ انعام کا مستحق ہوگا "

المشتہر، میاں جان صوبہ دار پنشن خوار گوالیار ساکن چھاؤنی اُجین

# باب ۱۳

سعدیا مژدہ بہار بیار ؛ خبر بد بوم شوم گذار

خورشید مرزا کے خیالات مراد علی کی طرف سے بُرے نہ تھے، آج پہلا دن تھا کہ خورشید مرزا کا دل اُس کی طرف سے پھر گیا۔ اس کی کوئی وجہ معقول ہو یا نہ ہو، اولاً تو بد خبر دینے والا کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ خصوصاً جبکہ بُری خبر دینے والے کی نیت بھی بُری ہو۔ مراد علی کی نیک نیتی گو اُس کی انداز گفتگو سے ظاہر تھی۔ اعتدال سے زیادہ مصنوعی ادب کا اظہار ضرورت سے زیادہ سرکار اور حضور اور خادم اور کے استعمال نے تقریر کو سامعہ خراش بنا دیا تھا۔ پھر اُس کے بشرہ سے اُس خلوص کے اظہار کے خلاف شہادت ملتی تھی وہ گویا خورشید مرزا کی مایوسی اور مجبوری پہ تمسخر کر رہا تھا۔ جب خورشید مرزا غور کر رہے تھے کہ اختری کا پتہ مشتہر کو کون دے گا تو سب سے پہلے مراد علی کا نام اُن کے ذہن میں آیا نہ صرف اس لئے کہ مراد علی کو سو روپے کے انعام کا لالچ ہے بلکہ اس لئے کہ اگر یہ مقدمہ چھڑا تو مراد علی خود مدعی کا شریک ہو جائے گا یا پوشیدگی سے ساز کر لے گا۔ وہ کھُلم کھُلا شرکت کرنے سے بھی بدتر ہے۔ کبھی کبھی خورشید مرزا کو یہ گمان ہوا کہ شاید یہ پورا قصہ مصنوعی ہو۔ مگر مراد علی کی طرز تقریر سے جو سراسر خورشید مرزا کے خلاف تھی اصلیت پائی جاتی تھی اُن کو یہ خیال تھا کہ اگر یہ قصہ مصنوعی ہوتا تو مراد علی ایسا دلیر بن کے گفتگو نہ کرتا۔ کبھی کبھی یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ مراد علی اگر خیر خواہ نہیں ہے تو بد خواہ بھی نہیں ہے جو نفع

اُس کو مدعی سے بن سکتا ہے میں اُس کے دینے کے لیے موجود ہوں، مراد علی کے چچا نے عمر بھر میرا نمک کھایا ہے، مرادعلی خودخانہ زادوں کی طرح میرے گھر کے ٹکڑے کھا کے پلا ہے۔ اَب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ مرادعلی میرے ہی گلے پر چھری پھیرنے کو آستین چڑھائے گا۔ میں نے نہ اُس کے چچا شیخ احمد علی کے ساتھ کوئی بُرائی کی نہ مرادعلی کے ساتھ پھر مرادعلی میرا دشمن جانی کیوں ہونے لگا۔" خورشید مرزا کو یہ علم نہ تھا کہ خود غرض بندۂ زر مروّت کو گناہِ عظیم جانتے ہیں۔" ازبسکہ یہ خبر مجھ کو قدرتاً ناگوار ہے اور اُس نے محض ازراہِ خیراندیشی مجھ کو آگاہ کیا۔ خبر کی ناگواری نے خبر دینے والے کو میری نظر میں بُرا بنا دیا۔ غرضکہ خورشید مرزا کے دل نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ مرادعلی کی نیک نیتی اور خیرخواہی کا خیال غالب ہے۔

# باب ۱۴

## جعفری کی فرمائش اور صاف جواب

آج ہم پریشانیِ خاطر اُن سے ۔۔۔ کہنے جاتے ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

جعفری بیگم، پھر گھر پر آگئیں نادری کی چند روزہ حکومت کا زمانہ ختم ہوا۔ کنجیوں کا گچھا نادری کے کمربند سے کھل کے جعفری کے قبضہ میں آیا۔ جعفری جو کچھ جنس چھوڑ گئی تھیں اس کا صفایا ہوگیا تھا۔ گھی، تیل، نمک، مصالح سب غائب تھا۔ کچھ تو نادری کی ناتجربہ کاری سے ماماؤں کو خوب اڑانے کا موقع ملا، باغ کی مہمان داریوں میں بھی اچھا خاصہ صرفہ ہوا، جعفری کی قسمت میں دن رات کا جھینکنا لکھا تھا۔ اے لو میرے پیچھے خوب لوٹ ہوئی۔ دو مہینہ کے حساب سے اناج آیا تھا، مجھے گئے ہوئے ایک مہینہ ہوا کیوں بُوا نصیبن حساب تو لگاؤ۔ نصیبن ہاں میں ہاں ملانے والی، ہاں بوی مہینہ تو ہوگیا۔ وہی میری نواسی ٹکو کی دودھ بڑھائی کے دوسرے دن آپ سدھاری تھیں، چڑھتا چاند تھا اے لو پھر وہی چڑھتا چاند ہے وہ بارہ وفات کا مہینہ تھا اب میراجی ہے۔

جعفری۔ انگلیوں پر حساب کر کے، ہاں ایک مہینہ سے دو دن اوپر ہوئے نا صاحب میں ایسی گھر سے باز آئی، باوا جان آئیں تو میں کہوں اب بی نادری گھر داری کریں۔

مگر یہ سب زبانی باتیں تھیں، جعفری کو حکومت کا مزا تھا بھلا وہ کب نادری کو اختیار دے سکتی تھی، جھینک پیٹ کے آخر چپ ہو رہی۔ نادری کو سالگرہ کے دن بچیں

روپیہ دئے، اختری کو چپکے چپکے روپیہ دیا جاتا ہے، اب میری باری ہے آسے دو
باوا جان کو۔ جعفری تو ان خیالوں میں تھیں اُن کو کیا معلوم تھا کہ باوا جان کے
دل پر کیا گذر رہی ہے۔ ع

ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد

خورشید مرزا مکان میں آئے مگر کوئی سمجھ سے کام لیتا اور ان کے بشرہ کی
طرف دیکھتا تو اُس کو معلوم ہوتا کہ وہ سخت پریشانی کے عالم میں ہیں پریشانی کا سبب ناظرین
کو معلوم ہے۔ اپنی جائداد پوری تلف ہو چکی ہوتی اگر اختری کا روپیہ نہ ہوتا نیلام
ہو جاتی۔ اختری کی رضامندی سے سہی مگر وہ کم سن ناسمجھ ہے دولت کی قدر نہیں
جانتی، اُس کی ماں نے میرے حوالہ کیا تھا۔ مجھکو نہایت دیانت سے کام کرنا تھا اُس کے
روپیہ سے ایک حبہ اپنے صرف میں نہ لانا تھا، اگر اُس کی ماں زندہ ہوتی اور مجھ سے کہیں
حساب لیتی تو مجھ کو کیا سمجھتی، اچھا وہ تو مرگئی مگر خدا تو زندہ جاوید ہے۔ قیامت کا دن
دُور نہیں ـــ قیامت بھی دُور سہی، یہ میاں جان کہاں سے نکل آیا اگر کل آکے مجھ سے
حساب فہمی کرے اور ہر زور کرے گا۔ تو پھر؟ کس قدر خوفناک نتیجہ ہوگا۔ جیل خانہ!
اس ضعیفی کے عالم میں قید بامشقت چار دن بھی زندہ نہ رہوں گا۔ مرجانا تو سہل ہے
یہ زندگی بھر کی نیک نامی خاندانی ریاست آج تک عزت سے بسر ہوئی۔ اب آبرو پر
بَن گئی۔ ساری عزت خاک میں مِل جائے گی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہر پھر کے وہی
مراد علی۔ اس وقت کوئی خیر خواہ ہے تو وہ مراد علی ہے۔ شیخ احمد علی کا زندوں میں
شمار نہیں۔ اب آبرو مراد علی کے ہاتھ ہے کہتا تو ہے کہ حتی المقدور کوشش کر کے مصالحت
کرادوں گا۔ جائداد اختری کے نام منتقل ہو جائے گی۔ میں جائداد سے باز آیا، خاندانی
وثیقہ پنشن سوا سو روپے ماہوار اسی بسر اوقات ممکن ہے تنگی سے سہی مگر آبرو تو بچ
جائے گی۔ اور اگر خدانخواستہ میاں جان مصالحت پر راضی نہ ہوا اور قانونی گرفت کی تو

سخت مشکل کا سامنا ہوگا۔ پھر سوائے قید کے کوئی پہلو مفر کا نہیں نظر آتا۔ خورشید مرزا کے یہ خیالات تھے اسی حالت میں جعفری نے اپنی صحنچی میں بُلا کے ایک کمخواب کا پاجامہ بنت ٹکی ہوئی بہت بھاری کوئی پانچسو کی تیاری کا جو کہیں سے بکنے آیا تھا دکھا کے :

جعفری۔ اباجان یہ پاجامہ بکنے آیا ہے پانچسو کی تیاری کا ہے مگر جن کا پاجامہ ہے وہ آجکل مفلس ہیں سب اسباب اپنا فروخت کر رہی ہیں، بیچاری کربلا جانیوالی ہیں سو روپیہ سے کم قیمت کو مل جائے گا۔ میرے اچھے اباجان یہ پاجامہ مجھکو لے دیجئے۔ اللہ آپ نے نادری کو پچاس روپیہ سال گرہ میں دئے، میں تو کبھی آپ سے کچھ مانگتی نہیں یہ پاجامہ مفت جاتا ہے۔

خورشید مرزا۔ سخت برہم ہو کے، تم کو معلوم بھی ہے مجھ پر کیا بنی ہے (جو خیالات اصل تھے وہ کسی سے کہنے کے نہ تھے) خدا جانے کس طرح معمولی خرچ چل رہا ہے۔ آجکل اتنا روپیہ فضول اخراجات کے لیئے ہرگز ممکن نہیں، بس یہ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوبارہ کچھ کہنے کا بھی جعفری کو موقع نہ دیا۔

جعفری، مایوس ہو کے رہ گئی مگر انتہا کا غصہ آیا، لے لو نادری کو ٹیکے سے پچاس حوالے کیئے، اختری کو برابر روپیہ دیا جاتا ہے۔ ہاں وہ بھی اختری کی سفارش سے نہیں تو میری طرح اُس کو بھی صاف جواب مل جاتا، تو جو ہیں بی اختری ہیں، اچھا تو اب اختری اس گھر میں رہیں گی یا میں رہوں گی۔

اگر اختری کو جعفری کی فرمایش کا حال معلوم ہوتا جس طرح بنتا منت سے خوشامد سے اُس کو روپیہ دیتی مگر اُس سے کیوں کہتیں اور کیوں لیتیں وہ تو باداجان کی بیٹی تھیں مری ہوئی ماں کی اصل قائم مقام تھیں۔

اس واقعہ سے جعفری کو اختری سے سخت نفرت پیدا ہو گئی، اب وہ گویا ظلم کُھلّا

اختری کو آزار پہنچانے کے درپے ہو گئی۔ اُس نے دل میں ٹھان لیا کہ میں اختری کو کسی نہ کسی موقع پر گھر سے نکال کے رہوں گی۔

انھیں دنوں میں جعفری کو ایک پرچہ کاغذ انگنائی میں پڑا ہوا مل گیا جو غالباً خورشید مرزا کی جیب سے گر پڑا تھا۔ یہ اختری کا رقعہ تھا۔

ماموں جان جو پچاس گنیاں آپ نے عنایت کی تھیں وہ صرف ہو گئیں۔ اب سو گنیاں مجھ کو اور دیجئے ایک غریب شریف زادی کا عقد ہے کچھ اُس کو دوں گی اماں جان کے روزے نماز کے لئے تو آپ کی شفقت سے جو کچھ دینا تھا دیدیا گیا۔ حج اور زیارت کے لئے سات سو روپیہ دینا ہیں، ایک سید بڑے نمازی پرہیزگار جناب قبلہ و کعبہ کی تجویز اور ہدایت سے نیابتہً حج بجالائیں گے اور بھی اسی قسم کے اخراجات ہیں، زیادہ حد آداب، فقط

عریضۂ ادب "اختری"

اس رقعہ کو پڑھ کے جعفری کو جنون سا ہو گیا اللہ ہم کو اسی نوسے روپیہ نہ دئے گئے اور یہ پندرہ سو کی رقم اختری کو چپکے سے مل گئی۔ اس کے پہلے ہزار لے چکی تھیں۔ یہ اماں کون تھیں؟ اہاہ اب کھلا یہ ہماری اماں کی سوت تھیں! تو کیا اختری ابا جان کی بیٹی ہیں، نہیں نہیں، تو پھر وہ ماموں جان کیوں کہتی خدا جانے کیا ہیر پھیر ہے یہ اختری کی اماں جان ہو نہ ہو ابا جان کی...... ہوں۔ کوئی رنڈی ہو گی۔ جعفری نے جوش انتقام میں ایک مری ہوئی باعصمت شریف زادی کو رنڈی بنا دیا اور اپنے باپ کو بھی عیب لگا دیا۔

اختری کے جلاپے میں جعفری کو باپ کے ادب کا بھی خیال نہ رہا اُس نے باپ کی طرف سے ناپاک خیالات کو دل میں جگہ دے کے خود گناہگار ہو گئی کسی کی طرف سے بدگمانی اچھی نہیں۔ خصوصاً ماں باپ مگر رشک و حسد نے دل میں آگ لگا رکھی تھی۔ انتقام پر اُبھار رہی تھی، اُس کا بس نہ تھا کہ اختری کا قیمہ بنا کے چیل کوؤں کو بانٹ

دے۔ کچھ بس نہ چل سکتا تھا اس لیے دل میں کینہ رکھنے پر مجبور تھی۔

اس درمیان میں خورشید مرزا اور اختری سے اکثر علیحدہ باتیں ہوئیں۔

خورشید مرزا۔ یاد کرو کہ تمہارے باپ کے کوئی بھائی بھی تھے۔ آخر تم نے کسی کو دیکھا تھا۔ تمہاری ماں کے عزیزوں کو تو اچھی طرح جانتا ہوں مگر تمہارے باپ کے قرابت داروں کا حال مجھے نہیں معلوم۔ تم نے اپنی ماں سے کسی کا نام سُنا ہو تو یاد کر کے بتاؤ۔ کس سے پوچھوں سخت حیرانی ہے۔

اختری۔ جی نہیں آبا جان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ سنتی ہوں کہ ایک بھائی تھے مگر میں نے اُن کو نہ دیکھا نہ اُن کا کوئی تذکرہ سُنا، شاید وہ آبا جان کے مرنے سے پہلے مر گئے ہوں گے۔

خورشید مرزا۔ تو تمہیں اچھی طرح یاد نہیں۔ تم کہتی ہو شاید۔ مر گئے ہوں یہ شبہ کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زندہ ہوں بلکہ مراد علی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ہیں۔

اختری۔ اس معاملہ میں مراد علی کا نام سُن کے سمجھ گئی کہ اُسی کا شگوفہ چھوڑا ہوا ہے مگر خورشید مرزا سے مراد علی کی خیر خواہی کی تعریف بار بار سُن چکی تھی اس لیے آنکھوں مراد علی کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ماموں جان مراد علی کو اچھا سمجھتے ہیں یا میرا بدی کرنا خلافِ مزاج ہوگا۔

آخر اختری نے یہ رائے دی کہ بھائی جعفر علی سے تو مشورہ لیجئے دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں، وہ کبھی کلکتہ جایا کرتے تھے اُنھوں نے آبا جان کو بھی دیکھا تھا۔ شاید ملے بھی ہوں۔

خورشید مرزا۔ ہاں ہاں یہ تم نے اچھی صلاح بتائی۔ (خورشید مرزا نے اس مشورہ کو پسند کیا بلکہ اُن کو پہلے بھی یہ خیال آیا تھا مگر حکیم جعفر علی سے وہ اس معاملہ

ہیں مشورہ لینے سے پس و پیش کرتے تھے۔ اس کے اکثر وجوہ تھے ایک تو جعفر علی خورشید مرزا کے بھانجے تھے اس لئے وہ اختری کے طرفداروں میں تھے دوسرے خورشید مرزا سے ہر طرح چھوٹے باعتبار سن کے رشتہ میں بھی اور اب اُن سے دامادی کا رشتہ ہونے والا تھا بلکہ تقرر کے اعتبار سے گویا ہو چکا تھا۔ خورشید مرزا اختری کے مال میں بہت کچھ تصرف کر چکے تھے۔ اس لئے وہ جعفر علی سے کہتے ہوئے ذرا جھیپتے تھے۔ اُن کا خیال تھا اور بجا نہ تھا کہ چھوٹے داماد کی نظروں میں حقیر ہو جاؤں گا آخر یہ خیال قائم رہا کہ جعفر علی کچھ مجھ سے حساب تو پوچھنے کا نہیں۔ شاید اتنی جرأت میرے مقابلہ میں نہ ہوا چھا تو مشورہ کرنا چاہیئے "۔

خورشید مرزا۔ ہاں جعفر علی کو بلا کے کہوں گا وہ بھی لائق ہیں معقول مشورہ دیں گے، یہ کہہ کے خورشید مرزا دیوان خانہ میں چلے گئے اور امام علی خدمتگار کو جعفر علی کے پاس روانہ کیا، اس اثنا میں مراد علی آگیا۔ اُس سے باتیں ہونے لگیں۔ اختری کا کمرہ قریب تھا اس لئے جو باتیں ہوئیں اختری نے سب سُنیں، اختری کو یقین ہو گیا کہ مراد علی جھوٹا ہے۔

مراد علی۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اختری بیگم کی جائداد اپنے نام منتقل کر لیجئے اور اُس روپیہ کو ضرورت بلا ضرورت کام میں لگا دیجئے۔ راجہ کا علاقہ قرضدار ہے دس لاکھ وہاں لگا دیجئے، کاغذ کی کل کے حصے بک رہے ہیں تین چار لاکھ کی وہاں کھپت ہے۔ جواہرات زیور سب اپنے قبضہ میں کر لیجئے۔ مقفل کر کے اپنی مُہر لگا کے چُنا مل کی کوٹھی میں رکھوا دیجئے، کیونکہ خدانخواستہ اگر قرقی آئی تو یہ سب ہاتھ سے نکل جائے گا، یہ اختری بیگم کی عین خیر خواہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ بیس لاکھ کے نوٹ اپنے نام سے خرید کر لیجئے۔ ایسے میں نوٹوں کا بھاؤ اُترا ہوا ہے اس سے آئندہ بہت بڑے منافع کی اُمید ہے۔ غرضکہ دُور اندیشی یہی چاہتی ہے کہ اختری کے نام ایک

حتیٰ نہ رہے ورنہ میاں جان سب لے جائیگا ۔ اور جب اُنکو یہ معلوم ہوگا کہ جائداد کچھ بھی نہیں خالی لڑکی ہے اگر میں لے جاؤنگا تو اپنے پاس سے کھلانا پڑے گا اس معاملہ سے خود ہی دست بردار ہو جائے گا۔

خورشید مرزا ۔ اور ولایت کی سند میں جو تفصیل موجود ہے۔

مرآد علی ۔ اُس کی تدبیر بہت سہل ہے ۔ میں اس مشکل پر غور کر چکا ہوں اور اُس کی تدبیر پر بھی آپ تردد نہ فرمائیں میں سمجھ لوں گا۔

خورشید مرزا ۔ میں تو اسی کو بہت دشوار جانتا ہوں ۔

مرآد علی ۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ کچھ دشوار نہیں ہے ۔ مگر بالفعل قابل عرض کے نہیں ہے ۔ آپ اگلے زمانہ کے ہیں آپ کو قانونی پیچ اور مقدمہ بازی کے فن میں دخل نہیں ہے ۔ اس معاملہ کے لئے اس خانہ زاد پر اعتماد کیجئے جب وہ وقت خدانخواستہ آئیگا کہ آپ کی ذات سے کوئی تعرض ہو اُس وقت میں آپکو صاف بچالاؤں گا ۔ بلکہ آپ کو عدالت میں جانے کی تکلیف نہ ہوگی اس خانہ زاد کے ہوتے حضور کو کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔

خورشید مرزا کو مرآد علی کی قابلیت کا پہلے ہی سے یقین تھا اب اس مشکل کے وقت میں کُل ذمہ داری اپنے سر پر اُٹھا لینے کے وعدہ سے وہ یقین اور بھی پختہ ہوتا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی یہ خیال بھی آہی جاتا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اگرچہ بظاہر میرے فائدہ کے لئے کہتا ہے مگر اس میں اس کی غرض بھی شامل ہے ۔ ایسا نہ ہو کہیں وقت پر دغا دے کے مجھ کو بلا میں جھونک دے اور خود ایک معمولی کارندہ کی حیثیت سے بالکل علیحدہ کھڑا ہو جائے ۔

مرآد علی ۔ ایک امر قابل گذارش ہے ۔ میرے نام مختار نامہ اب تک نہیں ہے چچا صاحب سے کاغذوں پر دستخط لے کے کام چلا لیا کرتا ہوں ۔ اب میرے نام مختار نامہ کا ہو جانا بہت ضروری ہے ۔

خورشید مرزا۔ میرے نزدیک شیخ احمد علی کی حین حیات تک اسی طرح کام کیا جائے۔
مرادعلی۔ خانہ زاد کا کوئی حرج نہیں ہے مگر اکثر مقدمات دُور دُور کے اضلاع میں ہیں اور آئندہ بکثرت ہوں گے۔ چچا صاحب دستخط بھی بمشکل کر سکتے ہیں اُن کو دوسرے اضلاع میں دستخط کے لئے کہاں لے جا سکتا ہوں۔ کیا خانہ زاد کے نام مختار نامہ کرنے میں کوئی تردد ہے۔ اچھا اختری بیگم صاحبہ کا مختار نامہ میرے نام ہو جائے آپ بحیثیت ولی اُن کی طرف سے دستخط کر سکتے ہیں۔

خورشید مرزا۔ کسی وکیل سے اس میں مشورہ کر کے اطلاع دو کیا ایسا ممکن ہے۔
مرادعلی۔ (کچھ سوچ کے) اچھا تو حضور کے ذاتی مختار نامہ میں عجلت چاہیئے۔ آج رجسٹرار صاحب کو لے آؤں گا سب مجھے بہت جلد کلکتہ جانا ہوگا۔ اُس سے پہلے یہ مختار نامہ میرے نام ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد مرادعلی رخصت ہوا۔ وہ ابھی رخصت نہ ہوتا اس اثنا میں حکیم جعفر علی صاحب آگئے تھے اور خورشید مرزا صاحب کے چشم ابرو سے مرادعلی کو معلوم ہوا کہ تخلیہ منظور ہے۔ لہٰذا مرادعلی قبل اس کے کہ اٹھایا جائے خود چلا گیا۔ چلتے چلتے اسکا جی چاہتا تھا کہ خورشید مرزا اور جعفر علی کی ملاقات میں اسکو بھی دخل در معقولات کا موقع دیا جائے۔ اس لئے مرادعلی نے اِن الفاظ میں رخصت چاہی جس سے اس کو بیٹھے رہنے کو کچھ نہیں تو اتفاقاً اجازت ہو جائے، کیونکہ وہ حکیم جعفر علی کو جانتا تھا کہ یہ اسی زمانہ کے آدمی ہیں، جو بل میں نے چڑھا رکھے ہیں ایسا نہ ہو اُن کو کھول دیں تو میری تمام اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ الفاظ رخصت طلب یہ تھے۔

مرادعلی۔ اگر میرا حاضر رہنا خلاف مصلحت نہ ہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ رخصت ہوتا ہوں۔

خورشید مرزا۔ اس کی اتنی حقیقت نہیں سمجھتے تھے کہ اُس کے حسن طلب پر لحاظ کیا جاتا۔ ہاں اب تم کو آئے ہوئے دیر ہوئی اچھا جاؤ۔

مراد علی۔ دل میں کہتا جاتا ہے کہ جعفر علی صاحب کی کوئی حکمت یہاں نہیں چل سکتی اُس کو خبر نہ تھی کہ پڑھے لکھے آدمی بلا کے پتلے ہوتے ہیں وہ بھی اسی زمانہ کے تھے، خورشید مرزا کی طرح اگلے وقتوں کے بھولے آدمی نہ تھے۔

حکیم صاحب۔ کیا آپ دیر سے آئے ہوئے ہیں۔ اب کچہری کا وقت بھی ہے۔

آخر مراد علی کو جانا ہی پڑا۔

خورشید مرزا اور حکیم جعفر علی، بعد معمولی مزاج پرسی کے،

خورشید مرزا۔ اب اختری بیگم کا مزاج رو باصلاح ہے کوئی شکایت باقی نہیں ہے۔

حکیم صاحب۔ جی ہاں ماشاء اللہ جوارش نے بہت فائدہ کیا مگر اب اُس کا استعمال ترک ہو جائے، ہاں وہ عرق ہاضم برابر پیتی رہیں، ذرا آپ تاکید رکھئے وہ اکثر اپنے علاج سے غافل ہو جاتی ہیں۔ ضعف ابھی باقی ہے مقویات ترک نہ ہوں۔ ہاں بہن جعفری بھی تو فیض آباد سے آگئیں۔

خورشید مرزا۔ اِس پچھلی بات کا کسی قدر بے پروائی بلکہ طنز سے جواب دیا، جی تشریف لائیں۔ باپ اس بیٹی سے بہت خفا تھے۔

حکیم جعفر علی۔ اِن دونوں میں نہیں بنتی۔

خورشید مرزا۔ کون دونوں۔

حکیم صاحب۔ بہن جعفری بیگم اور اختری بیگم میں۔

خورشید مرزا۔ اپنے آپس کا میل ملاپ ہے۔ میں تو اس میں زیادہ دخل نہیں دیتا۔

حکیم صاحب۔ میں نے اسی سے عرض کیا کہ اختری کے مزاج میں غیرت ہے اور غصہ کے ضبط کرنے کی عادت ہے۔ ذرا سی بات خلاف مزاج ہوئی اور وہ دل ہی دل میں رنج کرنے لگیں، یہ اُن کی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ اس خاندان میں خاص امراض

کے پیدا ہونے کی صلاحیت ہے اس سے خوف ہوتا ہے۔

خورشید مرزا۔ خاندان کے نام سے سلسلہ خیالات اصل مقصود کی طرف رجوع ہوئے۔ (ہاں خوب یاد آیا جعفر علی تم نے کبھی اپنی خالہ مرحومہ کی زبانی یا اور کسی سے سُنا ہے کہ اختری کے کوئی حقیقی چچا میاں جان نامی زندہ ہیں۔

حکیم جعفر علی۔ جی نہیں میں نے تو کبھی یہ نہیں سُنا، میرے خیال میں تو علی جان مرحوم کے ایک بھائی تھے تو وہ اُن کے عین حیات مر چکے تھے۔

خورشید مرزا۔ (فی الجملہ تسکین ہوئی)، مگر یہ شہادت منفی ہے۔ کہنے والا اثباتی شہادت دیتا ہے، بلکہ خود میاں جان نے یہ اشتہار دیا ہے (اشتہار حکیم جعفر علی کو دکھا کے)

حکیم جعفر علی۔ یہ اشتہار یہاں کس نے پہونچایا۔ کیا آپ یہ اخبار منگاتے ہیں میں نے تو کبھی یہ آگرہ کا اخبار لکھنؤ میں نہیں دیکھا خصوصاً آپ کے پاس۔

خورشید مرزا۔ اخبار مراد علی لایا ہے۔

مراد علی کا نام آتے ہی حکیم کا ذہن مقدمہ کی تہ کو پہنچ گیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ چند روز ہوئے مراد علی آگرہ گیا تھا۔

حکیم صاحب۔ یہ اشتہار مراد علی آگرہ سے اپنے ساتھ لائے ہوں گے ماموجان میں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ مراد علی بڑا مفسد ہے اور متفنی ہے۔

خورشید مرزا۔ جعفر علی کی بیجا بدگمانی سے کسی قدر آزردہ ہو کے تو کیا کیا جائے

ع - باہمیں مردمان بباید ساخت

مراد علی لایا ہو یا کوئی اشتہار موجود ہے، میاں جان کا پتہ موجود ہے۔ کسی کو جھوٹے اشتہار دینے کی جرأت ہو سکتی ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ میاں جان خود اسم فرضی ہو۔ مگر یہ قیاس سے بہت بعید ہے۔

اگلے لوگ سفیدی پر سیاہی چڑھانا یعنی کاغذ پر کچھ تحریر کرنے کو نوشتہ کی سچائی کا

پورا ثبوت جانتے تھے کیا ایسے بے ایمان بھی ہیں جو کاغذ پر جھوٹی بات لکھتے ہیں۔ جھوٹی بات کا اخبار میں چھپ جانا اس کو تو قطعی محال جانتے تھے، خورشید مرزا اسی خیال کے تھے اُن کو خبر نہ تھی کہ اب دنیا میں اس کی آن نہیں رہی جس طرح جھوٹی بات منہ سے کہدینا سہل ہے اُسی طرح لکھنا یا اخبار میں چھاپ دینا صاحب اخبار کو واقعہ سے کیا غرض، بس اشتہار کی اُجرت ملی، مشتہر کی ذمہ داری پر چھاپ دیا۔

حکیم جعفر علی (خورشید مرزا کی دیانت پر بھروسہ رکھتے تھے) تو پھر

آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

اگر کوئی دعویدار ولایت پیدا ہو گا۔ تو کیا ہو گا۔ اختری خود قانوناً بالغ ہوا چاہتی ہے۔

خورشید مرزا۔ (اختری بیگم کو ہمارے گھر سے تو لے جائیں گے) خدا جانے روپیہ کے لالچ سے کیا سلوک کیا جائے حقیقتاً یہ اندیشہ ہے۔

حکیم جعفر علی۔ (خود بھی تھوڑی دیر متردد رہے پھر بہت خوش ہو کے بولے) جی نہیں کیا مجال کسی کی جو اختری بیگم کو لے جا سکے۔ الہ آباد کورٹ کی نظیر موجود ہے کہ نابالغ جب سن تمیز کو پہنچ گیا ہے یعنی دس گیارہ برس کے سن کے بعد اگر قانونی ولی کے پاس رہنا پسند کرے تو اس کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اُس کو جبراً رکھ سکے، مجھے تو خیال ہے کہ سات برس کے سن کے بعد نابالغ کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے لیکن دس بارہ برس کے بعد تو یقین کامل ہے کہ کوئی اُس کو جبریہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ صرف حفاظت مال اور نگرانی ذات کی قانونی ولی کر سکتا ہے۔ وہ اس گھر میں ضرور رہ سکتی ہیں کیونکہ ماں کی وفات کے بعد یہاں بخیر و عافیت رہیں نہ اُن کو کسی قسم کی تکلیف کا یہاں اندیشہ ہو سکتا ہے نہ ولی قانونی کو آپ کے اعلیٰ درجہ کی حیثیت اور عزت کو مشتبہ کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔

خورشید مرزا۔ (دل میں، اور یہ میں مراد علی کے اغوا سے کئی لاکھ روپے جو اپنے

تصرف میں لایا ہوں اس کا علم جعفر علی کو نہیں ہے، اس کی حساب فہمی تو دلی قانونی ہر حالت میں لے سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے، مگر میں جعفر علی سے اس کو بیان نہیں کرسکتا، مجھے پہلے بھی اطمینان تھا اور اب تمہارے مشورہ سے اور بھی تقویت ہوئی، یہی اندیشہ تھا۔ تم کو یقین ہے کہ ایسی نظیر موجود ہے۔

حکیم صاحب یقین کامل! لا رپورٹ موجود ہے۔ میں یہ مقام ڈھونڈھ کے نکال دوں گا، آپ خود ملاحظہ کرلیجئے گا۔

خورشید مرزا۔ مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے، اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ نابالغ پر یہ جبر کیوں کیا جائے کہ اگر مثلاً اوسکو کسی سے اندیشہ ہو تو وہ اس کے قبضہ میں رہنے پر کیوں مجبور کیا جائے۔

اختری یہ ساری تقریر سُن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ اب ایک حمایتی کو اور خبر ہونا باقی ہے یعنی نواب مرزا، حکیم جعفر علی اور نواب مرزا نے جو اختری کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ خورشید مرزا کی محبت سے زیادہ مفید اور قابل قدر ہے۔ یہ دو شریف جواں مرد بلا غرض یا واجبی اور جائز نفع کی اُمید سے اختری کے حمایتی بن گئے تھے۔ یہ اختری کی ذاتی نیکی اور خوش نیتی کا پھل تھا۔

# باب ۱۵

تم مرد کی جھوٹی قسموں پر نہ جاؤ ـــــ وہ دو ہی دن میں جھوٹ سچ کھل جائیگا

جعفر علی، خورشید مرزا کی اجازت سے گھر میں گئے، اختری کے رشتے کے بھائی تھے اور ہمعالج، اُن کو اُس کے پاس تنہائی میں جانے سے کون مانع ہو سکتا تھا، مگر جعفری کی تنک مزاجی کے خیال سے (بڑی سالی خفا نہ ہو جائیں) پہلے اُنھیں سے ملے۔

جعفری۔ یہ آج مجھ پر کیا عنایت ہے پہلے اپنے سرکار کا مزاج تو پوچھ لیا ہوتا (یہ اختری کی طرف اشارہ تھا کہیں وہ خفا نہ ہو جائیں)۔

جعفر علی۔ (اس کا کیا جواب دیتے کہ ایسی چھچھوری طبیعت اختری کی نہیں خدا جانے تم اس کو کیا سمجھ رہی ہو مگر خدا کی مار اس رازداری پر کہ اختری بیچاری پر ظلم ہوتے دیکھتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے، ابھی بی جعفری کو معلوم ہو کہ اختری کی سرکار کے بدولت اس چار دیواری میں بیٹھی حکومت کر رہی ہے ورنہ مکان کب کا نیلام ہو گیا ہوتا۔ جعفری بیگم صاحب اس محل میں نہ ہوتیں کسی تنگ و تاریک مکان میں جو چار پانچ روپیہ ماہوار کرایہ پر لیا جاتا پڑی ہوتیں۔ اُسی کی دولت کھائیں اور اُس کو اُٹھتے بیٹھتے آزار پہنچائیں) جعفری بیگم سے جی نہیں ماموں جان کے بعد خدا اُن کو ہزاروں برس زندہ رکھے پھر آپ ہی تو بزرگ خاندان ہیں اسلئے آپ کے پاس آنا ہمارا فرض ہے۔ کہیئے فیض آباد میں کیسی گذری۔

جعفری ۔ سچ کہوں فیض آباد میں میرا دل نہیں لگا ۔ جدھر دیکھو کھپریلیں

حکیم صاحب ۔ بس پھر ملیں دیکھ لیں، وہاں کی نیک بختی، شرافت ملنساری کسی بات کا خیال نہیں کیا ۔ اچھا ہمارے لئے بھی کچھ لائیں، چلتے چلتے جھینگا مچھلیوں کے لئے کہا تھا ۔

جعفری ۔ اے ہے ان کی صورت سے تو مجھے گھن آنے لگی، ہاں تھوڑا تمباکو تمہارے لئے لائی ہوں ۔ ابھی صندوق نہیں کھولا ہے کھولوں گی تو بھجوا دوں گی ۔

حکیم صاحب ۔ دیکھئے صندوق کب کھلتا ہے، اُمیدوار سواد بدانند ۔

جعفری ۔ صندوق کیا کھولتی، جب سے لونڈی آئی ہے پھر گھر کے دھندوں میں لگا دی گئی ہے، لونڈی کے پیچھے بیویوں نے جو کارستانی کر رکھی ہے لونڈی کو بھگتنا پڑے گی ۔

حکیم صاحب ۔ باجی یہ آپ کیا کہتی ہیں، آپ گھر کی مالک ہیں سب آپ کا ادب کرتے ہیں، ماموں جان خود آپ کو مانتے ہیں ۔ "مانتے ہیں" اتنا حکیم صاحب کی زبان سے نکلا تھا کہ جعفری کا یہ حال ہوا جیسے کسی نے ٹھٹکاری کے سر پر نمک رکھ دیا ۔ آئے تم بھی میرا جی جلانے، خاک مانتے ہیں غیروں کو چپکے چپکے ہزاروں دئے جا رہے ہیں ۔ ہم نے موئے ایک پرانے پیجامہ کے لئے منہ پھوڑ کے کہا تو منہ بھوتھا لیا ۔ سچ کہوں میرا تو اس گھر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا ۔ یہ جانتی ہوں کہ باپ کی شکایت ہوتی ہے دوزخ میں گھر بناتی ہوں مگر کیا کروں جب آنکھوں سے لٹتے دیکھ رہی ہوں تو کب تک چپ رہوں، نہ بابا مجھ سے یہ اندھیر نہ دیکھا جائے گا ۔ قرضہ ہے کہ گاؤں، باغ مکان، نیلام پہ چڑھے ہیں مگر لوگوں کو چپکے چپکے تھیلیاں کی تھیلیاں پہنچائی جا رہی ہیں، اب تو رقعہ بازی پر روپیہ ملتے ہیں ۔

حکیم صاحب اس تمام شکایت کی اصلیت سے واقف تھے مگر دم مارنا منع تھا، آخر کسی طرح پیچھا چھڑا کے اختری کے پاس گئے ۔

اختری۔ حکیم صاحب کو نبض دکھا کے۔ آپ نے سب سنا کوئی میرے چچا پیدا ہوئے ہیں، میں نے تو زندگی بھر نہ کسی چچا کو دیکھا نہ نام سنا، یہ میاں مراد علی نے کوئی چچا نکالے ہیں، مشکل یہ ہے کہ ماموں جان کو اُس کی بات کا یقین ہے۔

حکیم صاحب۔ آپ خاموش رہیے۔ میں نواب مرزا صاحب سے مل لوں یا تو وہ اُس کی تفتیش کو نکلیں گے یا میں جاؤں گا، چار دن میں چچا بچا کا حال معلوم ہو جائے گا۔

اختری۔ میرا کوئی چچا نہیں ہے۔ کیوں تکلیف کیجیے جاڑوں کے دن سفر کی زحمت۔

حکیم صاحب۔ مگر اس اشتہار کا جعل کھولنا ضرور ہے، میاں مراد علی کی قلعی ایک مرتبہ کھول دی جائے، پھر امن ہو جائیگا۔ آپ یہ جعلیوں کے قانونی پیچ نہیں جانتیں۔ اس معاملہ میں خاموشی سے نقصان پہنچ جائے گا۔

اختری۔ اچھا جیسا مناسب ہو، میں نے فقط آپ کی تکلیف کے خیال سے کہا تھا اور پھر کہتی ہوں کہ یہ چچا وچا کوئی نہیں ہیں، مراد علی کا فقرہ ہے۔

حکیم صاحب۔ آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ کہیے جعفری بیگم سے کیسے بنی۔

اختری۔ فیض آباد سے آنے کے بعد مزاج زیادہ بگڑ گیا ہے۔ مگر

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب تو ہم انکی یہی رنجشوں کے عادی ہو گئے ہیں اب زیادہ بُری نہیں معلوم ہوتیں اور حق انھیں کی طرف ہے مجھے وہ اس گھر میں مد زائد سمجھتی ہیں اور یہ سچ ہے یہ سب اس رازداری کا قصور ہے مگر آجکل زیادہ برہمی کا سبب نہ معلوم ہوا۔

بات یہ ہے کہ پیجامہ والا ٹکڑا جعفری نے حکیم صاحب سے نہیں کہا اسلئے کہ ذرا اس میں چھوٹے بہنوئی کی آنکھ میں حقارت کا اندیشہ تھا اور یہ جعفری کی شرافت

تھی، کہ اپنے گھر کی بات باوصف سخت رنجش کے بھی زبان سے نہ نکلا۔

حکیم صاحب۔ دیکھئے اب اس راز کے کُھلنے میں زیادہ دن باقی نہیں ہیں، اور تو کچھ نہیں اِس مراد علی مردود کی ذات سے دن رات خوف لگا رہتا ہے اور ماموں جان اُس کے فریب میں آ گئے ہیں، وہ بزرگ ہیں ہماری فہمائش کی مجال نہیں، یہ مقدمہ جس نے ماموں جان کو سخت پریشان کر رکھا ہے، اور اُن کی پریشانی کے وجوہ مجھے خوب معلوم ہیں گو وہ مجھ سے نہ کہیں گے اور نہ میں پوچھ سکتا ہوں۔

اختری۔ معاف کیجئے گا آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ آج یہ صلاح دے رہا تھا کہ اختری کی کل جائداد اپنے نام منتقل کر لیجئے۔

حکیم صاحب۔ ذرا تعجب سے اور برہم ہو کے، اس پر ماموں جان نے کیا فرمایا، اور پھر آپ ہی آپ، مجھے ماموں جان سے یہ توقع نہیں بکنے دو اُس مردود کو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اختری۔ اُس کا بیان تھا کہ یہ میرے (اختری کے) لئے بہتر ہے اور یہ اِس استحکام اور بلند آواز سے کہا تھا کہ شاید میرے سُنانے کو کہتا تھا۔ پھر اگر واقعی اس میں کچھ مصلحت ہو تو میں بخوشی راضی ہوں۔ اور وہاں اپنے نام ماموں جان کا مختارنامہ کرانا چاہتا ہے اس کی بہت جلدی ہی کر رہا ہے۔

حکیم صاحب۔ اب خیریت نہیں نظر آتی کسی بڑے جعل کی فکر ہے بلکہ صاف صاف یہ ہے کہ کوئی بڑی بھاری رقم اوڑانے کا قصد ہے۔ تو بس مجھے نواب مرزا صاحب سے فوراً مل کے اس کی روک تھام کرنا چاہیئے روک تھام کیسی پورا بندوبست کیا جائے گا۔

اختری۔ اور وہاں کہتا تھا کہ زیور اور جواہرات کو مقفل کر کے مہر لگا کے کسی مہاجن کا نام لیا تھا مجھے یاد نہیں رہا اُس کے پاس رکھوا دینا چاہیئے۔

حکیم صاحب - اور کیا ماموں جان اُس کی اِن سب باتوں پر راضی ہو گئے۔
اختری - یہ میں نہیں کہہ سکتی - شاید یہ جواب دیا تھا دیکھا جائے گا۔
حکیم صاحب - ماموں جان کو صاف اِنکار کرنا تھا، افسوس وہ اِس مردود حرام خور کو خیر خواہ جانتے ہیں۔
اختری - وہی نہیں جعفری بیگم اُس کو اپنا رفیق سمجھتی ہیں۔ مامائیں اصلیں خدمتگار سب اُس کا کلمہ پڑھتی ہیں۔
حکیم صاحب - آپ کی جلن سے اور نوکروں چاکروں کو وہ خفیہ تنخواہیں دیتا ہے بڑا فتوریہ ہے۔
اختری - ایک نادری اور ایک اُن کی کھلائی کریمن اور اُن کی دیکھا دیکھی میں بھی یہ تین شخص اُس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

# باب ١٦

## ہرمزی بیگم کا تبدیلِ آب و ہوا کرنا

ہرمزی بیگم کی والدہ خاندانِ سادات صحیح النسب سیدوں کے نیک اعمال، متبرک نورانی چہرہ ماتھے پر سیاہ گھٹہ، خاکساری کا تمغہ گورے چہرے پر ستارے کی طرح چمکتا تھا، مگر اب بیچاری دونوں پاؤں سے بے کار ہو گئی تھیں۔ اکثر قرآن و حدیث کے اردو ترجمے بیٹھے بیٹھے مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ہرمزی ضعیف ماں کی خدمت میں ہمہ تن معروف چھ گھنٹہ روزانہ اسکول میں اور پھر کھانے پکانے میں بسر ہوتے تھے۔ سخت محنت کرنا پڑتی تھی دس روپیہ ماہوار کے سوا اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ دونوں وقت ڈولی پر اسکول آتی جاتی تھی، گھر کے سودے سلف کے لئے ایک ایک کی خوشامد بھی دینا اور پھر کمینی عورتوں کی باتیں سُننا۔ کم بخت غریبی وہ بلا ہے کہ بلاوجہ بھی لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، آخر ایک دن چپکے سے ماں بیٹیوں میں یہ مشورہ قرار پایا کہ ہرمزی برقعہ ڈال کے قریب شام خود کہیں دُور سے جہاں اُس کو کوئی پہچان نہ سکے ضرورت کی چیزیں خرید لایا کرے۔ سخت مجبوری کے عالم میں یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا تھا۔

ماں۔ بیٹا ہرمزی ہمارے خاندان میں کوئی اس طرح نہیں نکلا میں کیونکر کہوں کہ تم باہر نکلو۔

بیٹی۔ اماں کسی نے ہمارے کنبہ میں دس روپیہ کی اسکول کی نوکری بھی تو نہیں کی۔ مجبوری سے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ان کم بخت کمینی عورتوں کی باتیں سننے سے تو

ہزار درجہ بہتر ہے۔ پھر میسہ میں دھیلا چراتی ہیں۔ تم خاطر جمع رکھو میں اس طرح باہر نکلوں گی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

ماں۔ بیٹی تو برقع ڈال کے شہر میں نکلے گی میں کیوں کر کہوں۔

بیٹی۔ اماں یہ ڈولی پر چڑھ کے نکلنا تو کسی حدیث میں نہیں لکھا۔ مطلب پردہ سے ہے خدا نے چاہا اور کربلا جانا ہوا تو پھر چادر پیچہ کر کے نکلنا ہوگا۔ اونٹوں کی سواری قاطروں کی سواری پر سب نکلتے ہیں، یہی وہاں کا دستور ہے۔ ڈولی ڈنڈا تو فقط ہندوستان میں ہے (وہ جغرافیہ پڑھی تھی لفظ ہندوستان صحیح معنوں میں کہا تھا) کسی ملک میں یہ دستور نہیں، پاؤں توڑ کے عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا کوئی اچھا دستور نہیں ہے۔

ماں۔ برقعہ میں لوگ تمہیں پہچان لیں گے ایسا نہ ہو کہ لوگ ٹوہ کریں۔

بیٹی۔ پہلے دیکھ لیجئے میں کس طرح نکلوں گی۔ پھر آپ کا دل گواہی دے تو اجازت دیجئے گا۔

ماں۔ بیٹی تو کس طرح نکلے گی نہ بابا میری عقل میں نہیں آتا۔

بیٹی۔ ہر مزی نے ماں سے چھپا کے ایک برقعہ تیار کر رکھا تھا۔ اس برقعہ کی صفت یہ تھی کہ نئے کپڑے کا رنگا ہوا تھا مگر کسی قدر پرانا معلوم ہوتا تھا۔ رنگ ایسا نہ تھا جس پر خواہ مخواہ نظر پڑے۔ ایک میم صاحبہ نے اس کو ایک بڑھیا کا چہرہ دیا تھا وہ اس طرح کا تھا کہ اگر بہت غور سے نہ دیکھا جائے تو اصلی معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں ایسے چہرہ کو بیجا کہتے ہیں مگر بیجا کی صورت ڈراونی ہوتی ہے۔ جس سے لڑکے ڈرائے جاتے ہیں۔

یہ چہرہ ایک ادھیڑ گورے رنگ کی عورت کا معلوم ہوتا تھا کہ اگر برقعہ کسی وجہ سے کھل جائے تو بھی اصلی صورت برقعہ پوش کی نہ پہچانی جائے، ہاتھوں میں سفید دستانے پاؤں میں سفید جرابیں، بوٹ سادی وضع کا پورا سلیپر بادامی یہ باہر نکلنے کا تھا یہ ہر مزی

نے چپکے چپکے تیار کرلیا تھا۔ پہلے تو چہرہ لگا کے اُس نے ماں کو دکھایا جس سے زینب بیگم کو کہنا پڑا کہ اگر یہی چہرہ لگا کے کوئی باہر نکلے تو بھی کسی کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا ہے کہ بنا ہوا ہے۔ پھر اس پر برقعہ ڈال کے اور پوری چادر پیچھ کر کے ہرمزی نے ماں کو دکھایا۔ ماں نے کہا، اچھا بیٹی تو جان۔ شریف زادیوں کو اپنی آبرو کا خود ہی خیال چاہئے۔ پھر بھی احتیاط کی جاتی تھی کہ جھٹپٹے وقت پر دیکھ بھال کے گلی میں کوئی نہ دیکھتا ہو گھر سے نکل جاتی تھی اور نون تیل لکڑی ضرورت کی سب چیزیں خرید لاتی تھی، اس راز کے چھپانے کی بڑی کوشش کی گئی تھی سوا ان دونوں ماں بیٹیوں کے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ تھی۔ یہ سامان طبیعت کے شوق یا سیر تماشے کی ہوس سے نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اصلی سبب مفلسی اور غیرت داری تھی۔ نہایت مجبوری کے وقت اُس سے کام لیا جاتا تھا۔ جب کوئی سودے سلف کے لئے نہ ملتا تھا تو ہرمزی گلی والوں کی نظر بچا کے نکل جاتی اور پر محلہ سے ضرورت کی چیزیں خرید لاتی تھی۔

اختری سے ملنے کے بعد ممکن تھا کہ افلاس کسی حد تک دُور ہو جاتا مگر جب اختری کچھ دینا چاہتی، ہرمزی کی ماں سختی سے انکار کر دیتی، نہیں بیٹا ہم لوگ غریب آدمی ذرا سی آبرو رکھتے ہیں، اس ذرا سی آبرو کا ہم کو بڑا خیال ہے۔ دس روپیہ ماہوار جو ہرمزی لاتی ہے وہ ہمارے لئے بہت ہے۔ ہم کسی کے دست نگر ہو کے اور خیرات کے ٹکڑے کھا کے دنیا میں رہنا نہیں چاہتے۔ کئی مرتبہ نذر سادات یا امام ضامن علیہ السلام کے نام سے جو کچھ دینا چاہی وہ صرف ایک یا دو مرتبہ اس کے بعد صاف انکار کیا۔ جسقدر اصرار ہوا اُس سے زیادہ انکار ہوا آخر ایک دن ہرمزی کی ماں اکیلی بیٹھی تھی ہرمزی اسکول میں تھی، اختری رونے لگی اور رو رو کے یہ کہا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میں بن ماں باپ کی ہوں میرا دل بہت نازک ہے۔ میں آپ کو اپنی ماں سمجھتی ہوں اور ہرمزی کو بہن، میری تقدیر میں نہ تھا کہ میں ماں کی خدمت کرتی۔ خدا آپ کو بہن

ہرمزی کے سر پر سلامت رکھے۔ افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت کو نہیں پہچانا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے وہم آتا ہے کہ بہن ہرمزی کی قسمت پر مجھے رشک ہے۔ آپ خود کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں کہ میں تجھے ہرمزی کی طرح اپنی بیٹی سمجھتی ہوں، مگر خطا معاف یہ زبانی ہے جب آپ کو بہن ہرمزی کے روپیہ سے پرہیز نہیں ہے اور آپ اُسے اپنا مال سمجھ کے اُٹھاتی ہیں تو میرے پیسے سے آپ کو اس قدر انکار کیوں ہے۔ میری کس طرح تشفی ہو کہ آپ مجھے بیٹی سمجھتی ہیں، یا تو آج سے آپ مجھکو اپنی لونڈی بنا لیجئے، یا صاف انکار کر دیجئے۔ یہ ظاہرداری مجھکو بھی پسند نہیں ہے۔ میں نے بہت گستاخ ہو کے یہ چند باتیں کہی ہیں۔ اور دست بستہ عرض کرتی ہوں کہ آج سے لونڈی اپنے کو آزاد نہ سمجھے گی۔ آپ سیدانی ہیں آپ کو رحم کرنا چاہیئے۔ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو چور چور نہ کیجئے میں سمجھ گئی کہ جس طرح اُس کی ماں کی خدمت میرے مقدر میں نہ تھی جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی طرح اُس ماں کی خدمت کے قابل بھی نہ ٹھہری جس نے مجھکو منہ سے بیٹی کہا تھا۔ ایک طرف سے خدا کی مشیت نے بے آس دوسری طرف سے ایک بزرگ واجب التعظیم سیدزادی کی ضد نے۔ یہ کہتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سخت سے سخت دل بھی اس انکساری سے موم ہو جاتا، آخر زینب بیگم کو زیادہ انکار کا کوئی محل باقی نہ رہا اختری کے اخلاق نے زینب بیگم کو دبالیا! ور ایک حرف انکار منہ سے کہنے کی فرصت نہ دی۔

ہرمزی کئی سال تک سخت محنت کرنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ حکیم جعفر علی صاحب کو جو اکثر زینب بیگم کا علاج کر رہے تھے بلا کے ہرمزی کی نبض دکھائی گئی۔ حکیم صاحب نے کہا نبض میں بہت ضعف ہے، خفیف سی حرارت بھی ہے۔ ضعف تمام امراض کی اصل ہے، مناسب ہے کہ ہرمزی کچھ دنوں کے لئے آرام کریں کیونکہ اگر ضعف کی شدت سے خدانخواستہ بخار بڑھ گیا تو پھر مشکل سے دور ہوگا۔ یہ تو صاف

صاف نہیں کہا کہ جوان آدمی کو ایسی حالت میں دِق ہو جاتی ہے لیکن اشارہ کنایہ سے بھی مطلب ادا کر دیا)"۔

زینب بیگم کے رشتہ کے ایک بھائی مُدت سے رُڑکی میں سکونت رکھتے تھے۔ فوجی خدمت کے صلہ میں اُن کو پچیس بیگہ قطعہ آراضی سرکار سے عطا ہوا تھا وہاں کھیتی باڑی کر کے خوش گذران کرتے تھے، زینب بیگم کو کئی مرتبہ بلایا مگر بعض وجوہ سے وہاں جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ حکیم صاحب سے مشورہ لیا گیا اُنھوں نے فرمایا رڑکی دامنِ کوہ میں واقع ہے۔ معتدل آب و ہوا ہے نہر گنگ کی وجہ سے بھی کسی قدر خنکی ہے غرض ہر طرح ہرمزی کے لئے مناسب ہے وہیں جانا چاہیے سید محسن علی (زینب بیگم کے رشتہ کے بھائی کا نام تھا) کو خط لکھا گیا اُنھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہرمزی تنہا نہ آئے باجی بھی آئیں وہاں سے روانگی کا تار دیں، میں اسٹیشن پر سواری لے کے آجاؤنگا۔ میں تو خدا سے دعائیں مانگتا تھا، باجی کا آنا باعثِ برکت ہوگا ضرور آئیں اور جلد آئیں۔

یہ لکھنا فضول ہے کہ اختری نے اس سفر کے لئے کافی سامان کر دیا تھا غرض اچھی تاریخ نیک ساعت دیکھ کے دونوں ماں بیٹیاں روانہ ہو گئیں۔

# باب ۱۷

## کچھ دنوں کے لئے وطن چھوٹنا — دیکھئے کیا خدا دکھاتا ہے

رڑکی اسٹیشن پر محسن علی مع سواری موجود تھے، دونوں ماں بیٹیوں کے برقعے تیار ہو گئے تھے، مگر زینت بیگم بیچاری دونوں پاؤں سے معذور تھیں، آخر ڈولی پر بٹھا کر بیل گاڑی پر لائی گئیں، محسن علی صاحب زراعت پیر آن کلیر سے کچھ فاصلہ پر رڑکی سے تین چار میل کی دوری پر رہتے تھے، شام ہوتے ہوتے سواری پہنچی، مہمان اتارے گئے۔

محسن علی صاحب کی چھ لڑکی لڑکوں میں صرف ایک لڑکی بچی تھی، بوٹن نام تھا، دیہاتی کچا مکان مگر لپا پتا صاف ستھرا۔ اس گھر کے تین رہنے والے تھے ایک خود محسن علی دوسرے اُن کی بیوی، تیسرے لڑکی۔ ایک عورت گھر میں کام کاج کرتی تھی وہ روز گاؤں سے صبح کو آتی تھی اور شام کو چلی جاتی تھی۔ باہر کئی نوکر تھے جو کھیتی کا کام کرتے تھے۔ دو گوئیاں ناگوری بیلوں کی تھی ایک گائے دو بھینسیں، بھیڑیں، بکریاں، غرض کہ ہر طرح سے بھرپُرا گھر تھا۔ شہری تکلفات شیرمال کباب کا تو وہاں ذکر بھی نہ تھا، البتہ دودھ دہی، گھی، راب گُڑ (جس کو وہاں اندر کی کہتے ہیں) افراط سے۔

اِن دونوں ماں بیٹیوں کے لئے ایک کوٹھری ایک دالان پہلے سے لیپ پوت کے خالی کر دیا گیا تھا، دالان کے سامنے کا چھپر اِن کے آنے سے ایک دن پہلے نیا پڑ گیا تھا مکان گھنے درختوں کی آڑ میں نہر کے قریب تھا اس لئے گرمی کے موسم میں بھی سرد رہتا تھا۔ نہر کے پشتہ سے ایک پانی کا جھرنا نکلا تھا، ایسے جھرنے نہروں کے کنارے

اکثر ہوتے ہیں۔ ان کا پانی نہایت سرد ہوتا ہے گویا پشتہ سے صاف (فلٹر) ہو کے نکلتا ہے اس لئے صاف اور ٹھنڈا ہوتا ہے ایسا کہ برف کی ضرورت نہیں ہوتی ' برف دیہات میں کہاں، غریب کسانوں کے لئے خدا نے مفت ایسے سامان کر دئے ہیں جو اہلِ شہر کو خرچ کرنے سے بھی ممکن نہیں ہو سکتے۔ اوّل تو صاف میدان کی ہوا جو چُونہ سُرخی کی پختہ عمارتوں کی گرمی سے بچی ہوئی ہے درختوں سے نکلتے ہوئے وہ مادّۂ حیات (اکسیجن) ہوا جو شہر والوں کو میسر نہیں ہر طرح کی غلاظت کثافت سے پاک، بشرطیکہ گوبر اور کھاد کے انبار گھروں سے ذرا دُور ہوں اور مکانات مقدس مفید گاسئے کے فضلے سے بہت آلودہ اور متعفن نہ ہوں، اس گھر میں ان دونوں ماں بیٹیوں کو بہت آرام ملا۔ میزبانوں نے ان مہمانوں کی بے تکلف سادہ دعوتیں ایسی سیر چشمی اور کشادہ پیشانی سے کیں کہ اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ تو مہمانی زندگی بھر کے لئے ایک عمدہ یادگار ہو جاتی۔

محسن علی کی لڑکی بوٹن اچھی صورت شکل کی تھی، جامہ زیب شوخ گرما گرم۔ چمپئی رنگ بڑی بڑی خوشنما آنکھیں سیاہ بھنور پتلی، مجھوئی ستواں ناک پتلے پتلے سُرخ ہونٹ، ننھا سا دہانہ، دانت جیسے موتی کی لڑیاں نہ بڑے بڑے ہر کے ہونٹوں کے باہر نہ چوہیا کے سے چھوٹے، پتلی صراحی دار گردن، اسم بامسمیٰ بوٹا سا قد نہ بہت لمبا نہ ٹھگنا ڈیل ڈول بھی خاصہ، نہ دُبلی دق زدہ نہ موٹی بھسڑی۔ بھرے بھرے دیہاتیوں کے ایسے بازو بھری بھری گول کلائیاں غرض کہ نکھ سکھ سے درست تھی، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اگرچہ دیہات میں پلی پُسی تھی مگر بلا کی شوخی شرارت رگ رگ میں بھری تھی۔ ماں باپ کی ایک اکلوتی بیٹی آنکھوں کی اکلوتی بیٹی حد سے زیادہ لاڑ پیار تھا۔ جس بات پر ہٹ کرے کر کے چھوڑے، جو زبان سے نکل جائے ہو کے رہے۔

زینب بیگم کو یہ دلار ناگوار ہوا دو ایک دفعہ ٹوکا بھی مگر روک ٹوک ماں باپ

کو ناگوار ہو۔

بوٹن کی ماں۔ (ہرمزی کی ماں سے) کہتی تھیں چھ سات لڑکے لڑکیوں میں ایک یہ ہے خدا اس کو جلا دے۔ ہم تو اولاد کی طرف سے ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ اب کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اے لو اس کی جان سے دُور سات سمندر پار اس کے اوپر کی جو لڑکی تھی ایک دن باپ نے گھُرکا، دوسرے دن بخار چڑھا پھر نہ اُترا، آخر تپ میں تڑپ کے چلے آئے۔ او رگھر کو! ۔ اُس سے پہلے ایک لڑکے کو خوب پڑھایا لکھایا۔ مولوی (خدا غارت کرے) بچے کو جب نہ تب مار بیٹھتے میں بوٹن کے باپ سے کہتی تھی کہ لڑکے کو مکتب سے اٹھالو، میری اولاد بے عزت نہیں ہے جان جائے گی آخر پڑھانے کی دھن میں ان کو نہ سوجھی، لڑکے سے ہاتھ دھو بیٹھے، وہ ایک فقیر میری شادی ہونے سے ایک برس پہلے کہہ گیا تھا کہ اس لڑکی کے اولادیں ہونگی مگر مر مر جائیں گی اِس کی اولاد مار نہیں کھا سکتی۔ باجی فقیر کی بات پتھر کی لکیر ہوگئی، میرے تو جتنے لڑکے لڑکیاں گئیں مار اور گھُرکی لے گئیں، میں کمبخت کیا جانتی تھی نہیں تو پھول کی چھڑی نہ چھواتی، آدھی بات نہ کہتی، اسی سے میری بوٹن خدا رکھے چاہے جتنی شوخی کرے۔ اولاد ہے تو کیا ہوا بُرا لگتا ہے مگر ماممتا منہ کھُلنے ہاتھ اُٹھنے نہیں دیتی، بوٹن کے باپ کو پہلے سند نہ تھی مگر اب وہ بھی سمجھ گئے ہیں اب سمجھے تو کیا سمجھے۔

ع۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

باجی بچوں سے اُس وقت گھر بھرا ہوا تھا۔ ہم نے خود اپنے ہاتھوں بچوں کو گنوایا۔

غضب یہ تھا کہ یہ سب باتیں بی بوٹن سنتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں خوب کدکڑے لگاتی پھرتی جیسے الیل بچھیری، دن دونی رات چوگنی ہوتی جاتی تھیں، خیریت تھی کہ بوٹن نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو نہیں ستایا اُس کو ہرمزی سے محبت ہو گئی جب سے ہرمزی آئی تھی یہ لڑکی کسی وقت اُس کو نہیں چھوڑتی تھی۔ لکھنؤ کی ایک ایک بات

پوچھتی تھی، کہیں شاید دس گیارہ برس کے سن میں لکھنؤ میں تین مہینہ رہی تھی، اُسکو ایک ایک بات یاد تھی اور وہ جو کہاوت میں ہے۔ "ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے" وہی اس کا حال تھا۔

دیہات میں زیادہ پردا نہیں ہوتا نہ اس قدر راستوں میں مجمع ہوتا ہے۔ نہ غریب کاشتکار کسی کی بہو بیٹی کو بُری نظر سے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں کیونکہ ان کی عورتیں خود کوسوں اکیلی نکل جاتی ہیں، بلکہ دیہات میں دوسرے کی بہو بیٹی کو اپنی سمجھتے ہیں چمار بھی نمبردار کی لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ بیٹا کہتا ہے۔ اکثر فصلیں کٹ چکی ہیں کچھ کٹتی جاتی ہیں۔ بوٹن زراعت کے کاروبار سے زیادہ واقف تھی وہ ہرمزی کو ایک ایک کھیت کی باتیں بتاتی جاتی ہے۔ بوٹن ہرمزی کو ساتھ لے کے گھر سے نکلی۔ قریب شام۔ عجیب لُطف کا سماں تھا اُتر کی طرف کمایوں پہاڑ کا سلسلہ تمام افق کو گھیرے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہت ہی قریب ہے حالانکہ تیس چالیس میل کا فاصلہ ہے کوہ منصوری کا جس کا تذکرہ اختری سے بارہا سُنا تھا وہ اسی سلسلہ میں ہے۔ اسی پہاڑ کے دامن میں کہیں اختری کی والدہ آرام کرتی ہیں قیامت کی صبح کو اٹھیں گی۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی ہے سرسبز کھیتیاں نظر آتی ہیں کہیں گنے (اوکھ جس کو وہاں شاید ایکھ) کے کھیت کہیں چنے اور مٹر کے کھیت۔ اس میدان کے درمیان سے نہر گنگ لہریں لیتی سیدھی بہتی چلی گئی ہے۔ بوٹن نہر کے کنارے لے گئی ایک تربوز کسی گنوار سے مول لے کے نہر کے کنارے بیٹھ کے کھایا چھلکا خالی کر کے نہر میں چھوڑا گیا۔ بوٹن یہ چھلکا بہتا ہوا تھوڑی دیر میں رُڑکی پہنچ جائے گا۔ اگر چھوٹی سی ناؤ ہوتی تو ہم گھنٹہ بھر رُڑکی پہنچ جاتے۔ یہاں سے تین کوس بہاؤ کی طرف سولانی ندی ہے سُنتی ہوں اُس کی بالو سے سونا نکلتا ہے۔ چلو ایک دن چل کے بالو سمیٹ لائیں سُنار سے گلوا کے بالیاں بنوائیں۔ ہرمزی ہنس کے چپ ہو رہی۔ اُسی ندی پر سے یہ نہر جاتی ہے۔

ہرمزی۔ ہاں میں نے کتابوں میں اس کا حال پڑھا تھا، یہاں آئے وقت دیکھا کوئی آدھ کوس کا پل ہے (ہرمزی جغرافیہ جانتی تھی)، یہ تربوز کا چھلکا اگر یوں ہی بہتا چلا گیا تو چار پانچ دن میں کانپور پہنچ جائے گا۔ اگر ہم بھی اس چھلکے کے ساتھ بہتے ہوئے جائیں تو کانپور میں داخل ہوں وہاں سے نوآنے دے کے لکھنؤ پہنچ جائیں۔

بوٹن۔ لکھنؤ کا نام سنتے ہی میری اچھی باجی مجھے لیتی چلو۔

ہرمزی۔ ہاں ہاں چلنا۔ مگر تم اپنا یہ چبلاپن چھوڑ دو۔ لکھنؤ میں لوگ نام رکھیں گے۔

بوٹن۔ خفا ہو کے۔ مجھے کوئی کیا نام رکھے گا۔ دس کو تو میں نام رکھ کے چھوڑ دوں۔ اچھا چلو تمہیں پیران کلیر دکھالائیں۔ جو مراد مانگی پوری ہو گی۔

ہرمزی کو ان باتوں کا اعتقاد نہ تھا مگر بوٹن کی خاطر سے ساتھ ہو گئی۔

واقعی یہ سیر کی جگہ تھی، اونچے اونچے گھنے درختوں میں پختہ عمارت چار دیواری مقبرہ کا گنبد، صحنچیاں حجرے صاف ستھرے۔ مگر خالی پڑے ہوئے۔ صرف دو ایک مجاور دو چار پیسوں کی طلب میں پھیر کے کھڑے ہو گئے۔ ہرمزی یہ سب دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ پھر یہاں سے تھوڑی دور امام زادے مزار اونچے ٹیکرے پر ہے شاندار گنبد چودری سے نظر آتا ہے، چاروں طرف چوڑا پختہ چبوترہ، اس وقت بڑی تفریح کا مقام تھا چاروں طرف میدان۔ بوٹن کا گھر صاف نظر آتا تھا۔ اب رات ہوا چاہتی تھی مگر کچھ خوف نہ تھا، لڑکیوں کو آتے دیکھ کے دو گنواروں کو پیچھے پیچھے بھیجدیا تھا، خیر دونوں سیر کرتی ہوئی نہر کو ایک مرتبہ پھر دیکھتی ہوئی چراغ جلے بعد گھر میں پہنچ گئیں۔ ہرمزی کو یہ سیر مدت العمر یاد رہی۔

زینب بیگم کو سب سے زیادہ یہی خوف تھا کہ کہیں صاحبزادی میرے ساتھ لکھنؤ چلنے پر نہ ضد کریں تو سخت مشکل ہو گی آخر وہی ہوا۔ زینب بیگم کو جس بات کا خوف تھا۔ خوف اس لئے زیادہ تھا کہ صاحبزادی کا جی یہاں بہت لگا ہوا سا تھا۔ وہاں کوئی تھا نہیں

مگر جہاں کسی نوجوان ہم سن کو دیکھا تاک جھانک اشارہ بازی، آنکھ مار دینا، منھ چڑھا دینا۔ پاس آیا تو چٹکی لے لی کچھ نہ ہوا تو کوئی چیز کھینچ ماری یہ گنوار لوگ تھے دوسرے محسن علی کا دباؤ تھا۔ ہنس کے چپ ہو جاتے تھے۔ یا اگر کوئی دیکھتا نہ ہوا اُنھوں نے بھی نگاہیں ڈال دیں، اشارہ کا جواب اشارہ سے دیا۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ زستم ہند کی لڑکی بھی کسی کو چھیڑے تو وہ بھی چھیڑے بغیر نہ رہے گا۔ جب عورت آپ سے گر سے تو مرد کیا کر سکتا ہے کہاں تک خاموش رہ سکتا ہے۔ ہر مرد حضرت یوسفؑ نہیں اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر جناب یوسفؑ کی عصمت گویا ایک عام واقعہ تھا نعوذ باللہ!

بوٹن دہرمزی کے پیچھے پڑ گئی، اچھی باجی مجھے لکھنؤ لیتی چلنا۔

زینب بیگم نے کہا لو غضب ہوا میں جانتی کہ یہ بلا میرے پیچھے چمٹ جائے گی تو کبھی یہاں آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ خدا جانے لکھنؤ میں جاکر کیا گن کریں۔ میرے لئے تو کلنک کا ٹیکا ہو جائے گا۔ زینب بیگم نے لاکھ ٹالا مگر وہ ہرمزی کی منت کرنے لگی، باجی میری اچھی باجی پھوپی سے کہہ کے مجھکو لکھنؤ اپنے ساتھ لے چلو۔ اِدھر ماں باپ کی خواہش ظاہر ہوئی کہ کیا مضائقہ ہے، بوٹن ایک مہینہ کے لئے لکھنؤ ہو آئے۔ وہاں کی صحبت سے ذرا شہر میں رہ کے تمیز داری آجائے گی۔ ماں باپ کو ہرمزی کا نیک رویہ دیکھ کے یہ خیال ہوا تھا، کہ اُس کے ساتھ رہنے سے لڑکی سگھڑ ہو جائے گی، سنور جائے گی۔

ماں۔ ماشاء اللہ بوٹن کا ذہن اچھا ہے، یہاں کوئی سکھانے والا نہیں ورنہ سینے پرونے کا کام چکن کاڑھنی بوٹ کی اوگیاں، اونی کام کی، یہ سب کام جلدی سے سیکھ لے گی، بیٹی ذات کے لئے کسی ہنر کا ہاتھ میں پڑا رہنا اچھا ہے۔

باپ۔ باجی آپ کو زیادہ تکلیف نہ ہوگی، میں بوٹن کے خرچ کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ ذرا ہرمزی کے ساتھ رہ کے اس کو تمیز آجائے گی کوئی ہنر سیکھ جائے گی۔

زینب بیگم ۔ بھیا اب ایسے بھی ہم گئے گذرے نہیں ہیں کہ بوٹن کو دو روٹیاں نہ کھلا سکیں گے ۔

محسن علی ۔ نہیں باجی میں تمہاری طبیعت سے خوب واقف ہوں ، جیسے ہرمزی ویسی بوٹن اچھا تمہیں کھلاؤ ۔ تمہاری لڑکی ہے مجھے کیا اختیار ہے تم میری بھی بڑی ہو ۔

مگر چلکے سے بوٹن کو بجیس روپے دیدیئے ، کیونکہ بیٹی کے چھوڑے پن سے اچھی طرح آگاہ تھے ، یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اس کا جی کسی چیز کو چاہے اور نہ لے سکے ۔ دونوں میاں بیوی خود بھی ساتھ آتے مگر کھیتوں کی کٹائی کے دن تھے ۔ زیادہ بوجھ بھی زینب بیگم پر ڈالنا اچھا نہ تھا اس لئے دو دن کے لئے ان سب کو پہونچانے کے لئے لکھنؤ آئے اور ایک دن یہاں ٹھہر کے بیٹی کو چھوڑ کے چلے گئے ۔

یہاں بوٹن کا اور اختری کا سامنا ہوا ۔ اختری اور ہی مزاج کی لڑکی تھی اور کیا بوٹن کی چٹک مٹک آڑ ادو بیہ غرض کوئی ادا دل سے نہ بھائی مگر ہرمزی سے اُس کو محبت تھی ۔ زینب بیگم کو بزرگ جانتی تھی ۔ بوٹن ان کی عزیز تھی اور مہمان اس لئے اُس نے بھی خاطرداری کی ایک دن تکلف سے دعوت بھی کی ۔ مگر سب ہرمزی کے اہتمام سے انھیں کے گھر میں خود بھی دسترخوان پر بیٹھی مگر بوٹن کی زیادہ بے تکلفی جو بدتمیزی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی کچھ خوش نہ ہوئی ۔

بدتمیزوں کا قاعدہ ہے کہ دوسروں کی تحقیر کر کے اپنی شان بڑھانا چاہتے ہیں خود بے وقوف ہیں مگر دوسروں کو بے وقوف جانتے ہیں ، خود بے تمیز ہیں مگر دوسرے کی بے امتیازی ثابت کرنا منظور ہے خود غریب ہیں زیادہ مقدور نہیں مگر امیروں سے مل کے اُن کی برابری کا دعویٰ ۔ " کیا ہم کوئی محتاج ہیں کیوں دبیں کیوں خوشامد کریں " یہ خدا کے بندے یہ نہیں خیال کرتے کہ اگر کوئی دولت مند ہے یا صاحب علم یا ہنرور ہے اور تم خود نادار جاہل بے ہنر ہو تو وہ اپنا مرتبہ گھٹا کے کیوں تمہاری خاطر سے تمہارا

ہمسر بن جائے - قدرتاً تم اُس کے دستِ نگر ہو سکتے ہو تم اُس کے محتاج ہو سکتے ہو
مگر وہ کب تم سے خوشامد طلب کرتا ہے وہ کب کہتا ہے کہ تم میرے آگے ہاتھ پھیلاؤ اگر
وہ خلوص سے تمہارے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے اور اخلاقاً تمہاری عزت کرنے کو
موجود ہے یہ اُس کی نیک نفسی ہے تم اس لائق نہیں ہو پھر تم اُس سے جلتے کیوں ہو اُسکو
گھٹانا کیوں چاہتے ہو - اگر تم اس کی خوشامد نہیں کرنا چاہتے جس کا وہ تم سے طالب
نہیں تو وہ تمہاری بیجا خوشامد کیوں کرے، وہ تمہارا نازبردار کیوں ہو - بوٹن کے ایسے
گہرے خیالات تو نہ تھے مگر محض شرارت اور بدتمیزی، بوٹن دسترخوان پر آئی ہے،
سالن میں مرچیں نام کو نہیں یہ کس نے پکایا ہے - پکانے والی سامنے بیٹھی ہے. کھانا
نکال رہی ہے - ایک گالی دے کے میری نوکرانی ہوتی تو موئی کا سر مونڈ ڈالتی، لے
توبہ بھلا گھی کتنا افراط سے ڈال دیا۔

اختری نے کبھی اپنے کسی نوکر کو آدھی بات نہیں کی تھی - پکانے والی کے
تیور بگڑے مگر اختری نے آنکھ کا اشارہ دے کے چپ رکھا - پھر دوسرے وقت سمجھا
دیا بوا امامن یہ لڑکی سخت منہ پھٹ بدتمیز ہے تم کو اُس سے کیا واسطہ اگر میں جانتی
کہ ایسی بیہودہ ہے تو کبھی بات نہ کرتی - ہم نے تو ہرمزی کی بہن سمجھ کے خاطرداری
کی یہ ہرگز اس لائق نہیں -

امامن - بیوی ذرا دیکھئے آپ نے مالک ہو کے کبھی آدھی بات نہیں کہی،
چھوٹتے ہی "حرامزادی - سر مونڈ ڈالتی" ذرا یہ زبان تو دیکھئے - ہم نے بڑے
محل محلات کی نوکریاں کی ہیں شہزادیوں کے دسترخوان سجے یہ بدزبانیاں کبھی نہیں
سُنیں - شاید اُنھوں نے اپنے گاؤں کی کوئی اماری چماری سمجھ لیا ہوگا - بیوی
ہم نے ہاتھ بیچا ہے ذات نہیں بیچی - آپ کا منہ کیا، نہیں تو حرامزادی کہنے کا مزا
چکھا دیتی -

اختری - ہاں ہاں بوا امامن میں سمجھ گئی - میں خود اب اس کو منہ نہ لگاؤنگی -

واقعی بوٹن کے آنے کے بعد اختری کی آمد و رفت میں کسی قدر کمی ہو گئی ' زینب بیگم کو اس کا ملال ہوا اور انھوں نے اختری سے معذرت کر کے اپنی مجبوری سے اُس کے لکھنؤ میں لانے کا حال بیان کر دیا ' اختری زینب بیگم سے تو صاف ہو گئی ' بوٹن سے اُس کو کچھ سروکار نہ تھا - اختری نے کچھ اس طرح کا برتاؤ کیا کہ نہ زیادہ خلا ملا بڑھنے پایا نہ کوئی رنجش ہی ظاہر ہوئی -

# باب ۱۸

مراد علی اپنی بدذاتی سے اب بھی باز نہیں آتا، خورشید مرزا اُس کے قابو پر چڑھ گئے تھے اُس نے کوشش کی کہ اختری پر ڈورے ڈالوں۔ ماماؤں اصیلیوں کو بہت کچھ دے دلا کے آخر پیام سلام کا سلسلہ پیدا کیا۔ مگر اختری پر اُس کا جادو نہ چل سکا اب وہ ذرا بے آزار ہوا چاہا کسی ناجائز طریقہ سے کامیابی حاصل کروں اُس کو معلوم ہو گیا کہ اختری زینب بیگم کے پاس آتی جاتی ہے۔ اس لیے اُس نے ٹوہ لگاتے لگاتے ایک سلسلہ نکال ہی لیا۔ بہت بڑی نفع کی اُمید تھی اس لیے زر خرچ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ زینب بیگم کے مکان کے برابر ایک چھوٹا سا مکان جو کسی باورچی کا تھا ہمیشہ کرایہ پر چلتا تھا۔ کرایہ تین روپیہ ماہوار تھا۔ آجکل خالی پڑا تھا یہ موقعہ اسکو خوب ہاتھ آیا۔ رحیم بخش نامی ایک شخص بارہ بنکی کا رہنے والا تبلاش معاش لکھنؤ میں آیا تھا شیخ احمد علی کے نام کا ایک رقعہ اُن کے کسی دوست سے لکھوا لیا تھا۔ مراد علی نے اُس کو فوراً نوکر رکھ لیا۔

یہ شخص قوم کا بھٹیارہ عمر بھر بوادی پیشہ کرتا رہا تھا اور اُس کی جورو شرفو بھٹیاری کسی زمانہ میں بڑی بدکار آفت روزگار تھی مگر اب خدا جانے سچ یا جھوٹ حج کر آئی۔ اس کے ماورا اجمیر شریف دیوان شریف، ردولی شریف، بانسہ، کچھوچھہ، مکن پور، پیران کلیر مقامات میں جا کے شرف حاصل کیا۔ بڑی نمازی پرہیزگار رحجن کے نام سے مشہور تھی، کہیں مُرید بھی ہو آئی تھی، اب کیا پوچھنا۔

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلاّلی

رحیم بخش کو وہ مکان کرایہ پر لے دیا اور رحیم بخش اور شرفو دونوں اُس کی رازداری میں داخل ہوئے، مراد علی رات کو چھپ کے اس مکان میں جا کے بیٹھنے لگا۔ شرفو کی بدولت دلچسپیوں کے سامان روز رات کو موجود رہتے تھے اکثر وہیں رہتا تھا، دو منزلہ مکان تھا نیچے کے مکان میں دالان کوٹھریاں کھاری پانی کا کنواں یہ سب رحیم بخش اور شرفو کی ضرورتوں کے لئے کافی تھا۔ کوٹھے پر ایک کمرہ منشی جی (مراد علی) کے روزانہ شراب خوری بدکاری کے لئے بہت مناسب اور موزوں تھا، مراد علی اپنے مطلب کے حاصل ہونے کی پوشیدگی کو نہایت ضروری سمجھے ہوئے تھا۔ اس لئے جو کچھ کرتا تھا بہت پوشیدہ، رحیم بخش اور شرفو بڑے پختہ کار رازدار ہاتھ آئے تھے، جاہل بیہاتی کم اوقات تھوڑے سے خرچ پر بڑے بڑے کام کرنے والے آئندہ انعام کے اُمیدوار اپنے پیشہ میں جو درمیان دونوں طاق پورے مشتاق، اگر میاں زمین میں گھس کے پتال کی خبر لانے والا تو جورو آسمان پھاڑ کے تھگلی لگانے والی جیسے کٹنے کٹنیاں قصہ کہانیوں میں سُنی تھیں، یہ دونوں جورو خاوند ویسے ہی تھے۔ جورو خاوند کیسے عمر بھر ناجائز تعلق رہا، اب حجن بننے کے بعد نکاح پڑھالیا تھا گویا حرامکاری سے تائب مگر دو سر ملادینے میں خواہ وہ غیر شرعی طریقہ سے کیوں نہ ہو ستر حجوں کا ثواب ملتا ہے یہ اعتقاد اور یہ چال چلن لوگوں کے دکھانے کے تھے سوداگر بنے، سنگی گلبدن محمودی نینو ڈورئیے کے تھان ایک بقچہ میں باندھ کے رکھ چھوڑے، کبھی کبھی پھیری کو بھی نکلتے ہیں۔ یہ مراد علی کی رازداری کا پردہ ہے تاکہ محلہ والے نہ بھانپیں ورنہ ایسے بدمعاشوں کو محلہ میں کون رہنے دیتا ہے فوراً اٹھا دئے جاتے ہیں۔ بی شرفو بھی گھروں میں کپڑا بیچنے کے حیلہ سے جاتی ہیں پرائی بہو بیٹیوں کو بدراہ کرنے بھگانے جانے کا اچھا خاصہ سامان کر لیا گیا ہے مگر ہر کسی کا کٹنا پا بالفعل منظور نہیں، منشی جی کا

کام ہو جائے تو زندگی بھر کی روٹیاں ہو جائیں گی، خورشید مرزا کے محل میں گھسنے کی تو جرات نہیں ہوئی اس لئے، دار بخش کالے ناگ کی طرح دن رات پہرے پر بیٹھے رہتے تھے، اونگھتے ضرور تھے مگر ذراسی پاؤں کی آہٹ سے چونک پڑتے تھے۔ ان کو تاکید تھی کوئی اجنبی عورت گھر میں نہ جانے پائے، قدیم مہترانی دھوبن کنجڑے کے سوا کوئی جانے نہ پاتا تھا۔ جب سے میاں جان کا اشغلہ اٹھا تھا تاکید زیادہ ہو گئی تھی، زینب بیگم کا گھر غریب کا گھر تھا۔ یہاں شرفو آنے جانے لگی۔ اختری پر تو ان کی نظر نہیں پڑی بوٹن کو اپنے ڈھب کا پایا۔ مراد علی سے تعریف کر کے پورا مشتاق بنا دیا بوٹن بے چین طبیعت کی تھی کسی نہ کسی طرح مراد علی نے ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اختری سے صرف روپیہ کی طمع میں ملنا چاہتے تھے یہاں محض صورت شکل پر فریفتہ ہو گئے۔ شیر کا شکار نہ ہو سکے تو لومڑی ہی سہی وار خالی نہ جائے۔ بوٹن پہلے ہی سے عاشق تن تھیں شرفو سے دو دو باتیں ہو ہی گئیں اس طرح کہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کوٹھے پر چڑھ کے منشی جی سے آمنا سامنا اشارے بازی ہوئی عطر پان پھول مٹھائیوں کے دَور لے۔

قول و اقرار چاہ کے وعدے + زندگی بھر نباہ کے وعدے

یہ سب کچھ ہوا۔ بانس کی سیڑھی تیار ہوئی، پورے سامان بھاگ جانے اور بھگا لیجانے کے ہو گئے۔ بوٹن سمجھتی تھی بس بانس کی سیڑھی سے نیچے اترنے کی دیر ہے پھر مجھے کون پائے گا۔ ناتجربہ کاری الھڑپن طبیعت کی شوخی چالاکی اکسا رہی تھی۔ مگر مراد علی ایسا بے وقوف نہ تھا جو محلہ میں زیر دیوار یہ جرأت کر بیٹھتا دوسرے اختری کی طرف سے ابھی بالکل مایوس نہ تھا ادھر رحیم بخش اور شرفو دونوں ہڑبڑا گئے منشی جی ذرا سوچ سمجھ کے کام کرنا چاہیئے ہم دونوں فوراً گرفتار ہو جائیں گے۔ پہلے ہم کو بھاگ جانے دیجئے پھر اپنا کام کیجئے۔ مشکلیں دُور نہ ہوتی جاتی تھیں، فکر یہ تھی کہ

اختری نہ سہی اختری کا مال کم از کم جواہرات کا صندوقچہ قبضہ میں کر لو پھر اس پیرزادے کو لے کے اُڑ جاؤں گا۔ اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے گا اُسکو خبر نہ تھی کہ نواب مرزا اور جعفر علی سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے رہتے ہیں۔ اس کے ماورا دو خفیہ پولیس کے اہلکار جن کو نواب مرزا اور جعفر علی نے لگا رکھا تھا۔ اُس کی تمام حرکات و سکنات کی خبر رکھتے تھے وہ کہیں ہو کوئی نہ کوئی اُس کے پاس بلکہ ساتھ رہتا ہے یہ خفیہ مکان بھی اُن سے چھپا ہوا نہ تھا جب یہ یہاں آتا ہے ایک لنگڑا فقیر پیچھے پیچھے دروازوں پر بھیک مانگتا ہوا آگے پیچھے ساتھ ہی ساتھ دروازے میں پہنچا جاتا ہی پھر پولیس کے سپاہی کا پہرا گلی میں رات بھر رہتا ہے، یہ سب اس کی ٹوہ میں ہیں مراد علی اپنے کو بڑا ہوشیار سمجھتا تھا مگر علم و عقل میں بڑی قوت ہے خصوصاً نیک نیتی کے ساتھ جو کام ہوتا ہے کامیابی ہوتی ہے وہ چوروں کی احتیاط نہیں ہے بلکہ چوروں سے محفوظ رہنے والوں کی احتیاط ہے۔ اختری کے حامیوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ کوئی وار اختری کی ذات یا مال پر کرنے والا ہے اس لئے اس کو نگرانی میں رکھا تھا، عین ارتکاب جرم کے وقت گرفتار کر لینے کا مصمم قصد کر لیا تھا۔

# باب ۱۹

## کیا میاں جان اختری کا حقیقی چچا ہے؟

نواب مرزا اور حکیم جعفر علی اور خود اختری کو بھی ایک لمحہ کے لئے یہ شبہ نہیں ہوا کہ میاں جان کوئی شخص اُس کی ولایت کا دعوے دار ہے۔ مگر خورشید مرزا کو مراد علی نے یقین کرا دیا تھا اور اس بہانے سے وہ اختری کا مال کھسکاتا جاتا تھا، جواہر کا صندوقچہ مقفل ہو کے خورشید مرزا کی لاکھی مہر ہونے کے بعد چنال کی کوٹھی میں مُراد علی کی معرفت پہنچ گیا تھا۔ شیخ احمد علی کو انتقال کئے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اب مراد علی کے نام خورشید مرزا کا مختار نامہ عام کامل اختیارات کے ساتھ تصدیق ہو چکا۔ یہ سب اُمور نواب مرزا اور حکیم جعفر علی کو معلوم ہیں، مراد علی کی نگرانی کی اب سخت ضرورت ہے کسی وقت مراد علی فی الحقیقت آزاد نہیں ہے ہر وقت دو ایک ہوشیار شخص اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔ نواب مرزا اور جعفر علی میں مشورہ ہوتا ہے۔

نواب مرزا۔ بھائی خورشید مرزا اس بدمعاش کے دم میں آ گئے، بالکل قابو میں ہیں اب کوئی وار کیا ہی چاہتا ہے۔

جعفر علی۔ کیا کہوں ماموں جان کس خواب غفلت میں ہیں۔ مراد علی میاں جان کا خوف دلا کے جو ماموں جان سے کہتا ہے وہ کر دیتے ہیں، یہ جواہرات کا صندوقچہ مہاجن کے پاس جب سے گیا ہے مجھے بڑا اندیشہ ہے۔ مراد علی جب چاہے مہاجن سے لے کے چلتا ہو۔

نواب مرزا - خورشید مرزا کا مختار عام پھر اُس کی معرفت صندوقچہ رکھوایا گیا ہے۔

جعفر علی - اچھا تو ایک احتیاط اور کر لینا چاہیے حسین علی خاں کی معرفت دو سپاہی نوکر رکھ لیجئے اور مراد علی کی شکل سے دُور دکھلا دیجئے۔ جتنی ریلیں لکھنؤ سے جاتی ہیں، سب کو دیکھ لیا کریں۔ جانے والے مسافروں کے پھاٹک کے پاس ٹکٹ جہاں بٹتا ہے اور جدھر سے نکل جانے کا احتمال ہو نگرانی رکھنا چاہیے۔

نواب مرزا - دو سپاہی نہیں کم سے کم پانچ چھ ہوشیار آدمیوں کی ضرورت ہے مگر میرا یا آپ کا ہونا موقعہ پر ضرور ہے ورنہ اور کسی کو ایکا ایکی مراد علی پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت مشکل سے ہو گی۔

جعفری علی - بے شک! تو پھر مجھکو یا آپ کو اسٹیشن پر رہنا چاہیے مگر یہ میاں جان والا واقعہ صاف ہو جائے تو بہتر ہے۔

نواب مرزا - مجھ کو تو اُس کے فرضی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کو کالعدم سمجھ کے کارروائی کیجئے۔

جعفر علی - میں آپ کے پچھلے جملے سے متفق نہیں ہوں۔ جب تک یہ شبہ صاف نہ کیا جائے گا۔ ماموں جان پر مراد علی کا جادو چڑھا رہے گا۔ ادھر یہ جعل کھلا اور ماموں جان کی سرکار سے یہ مردود ہوا ادھر سب کام بن گئے۔

نواب مرزا - یہ بالکل درست ہے۔ اچھا تو میں جاؤں۔ مگر میرا یہ خیال ہو کہ اس کی گرفتاری کے لئے میرا لکھنؤ میں رہنا ضروری ہے۔ میں اس ملعون کو جہنم میں بھیج چکوں تو اطمینان ہو۔ ایک بن ماں باپ کی بچی کے پیچھے پڑ گیا، اگر وہ مالدار ہے تو پھر تیرے باپ کا کیا اجارہ ہے چاہتا ہے کہ میرے ساتھ نکاح کر لے اور کل مال میرے سپرد کر دے، خوب شراب خواریوں اور رنڈی بازیوں میں اُڑاؤں، اگر خدانخواستہ اس کی آرزو بر آئے تو خدا جانے اُس غریب کا کیا انجام ہو، دوسرے اُس کا کفو نہیں

کہاں وہ رئیس زادی کہاں یہ پانچ روپیہ ماہوار کا مختار پھر بدتمیز بیہودہ شراب خوار کہاں وہ نیک بخت لڑکی، پانچوں وقت کی نماز، کلام اللہ کی تلاوت، روزہ دار پرہیزگار کہاں یہ بدکار کوئی جوڑ ہے، انصاف کہتا ہے کہ یہ اُس کے قابل نہیں محض روپیہ کی طمع ہے اُس کی ماں نے اِسی دن کے لئے یہ وصیت کی تھی۔

جعفر علی۔ اچھا تو میں جاتا ہوں، انشاءاللہ شام کی گاڑی میں آگرہ اور وہاں سے گوالیار اور پھر اوجین جا کے ضرور پتہ لگا لاؤں گا۔

نواب مرزا۔ یہ تو پھیر کا راستہ ہے مہو کے چھاؤنی سے ہو کے جایئے۔

جعفر علی۔ مجھے آگرہ جانا ضروری ہے، اپنے خاص کام کے لئے، گوالیر میں میرے اکثر احباب ہیں۔ اوجین میں البتہ کوئی دوست نہیں لیکن گوالیر سے کوئی سلسلہ پیدا کرونگا۔

نواب مرزا۔ آپ کی رائے صائب گوالیر سے سلسلہ چلے گا۔ خصوصاً فوجی دفتر سے۔

جعفر علی۔ یہی میرا خیال ہے مگر یہ ٹھیک نہیں بیٹھتا کہ اوجین سے اور لکھنؤ کلکتہ ٹیا برج سے کیا تعلق ہے اگر واقعی میاں جان اسم فرضی نہیں ہے تو اسی سے پتہ چلے گا۔ مگر جناب عقل کی بات ہے اگر کوئی سلسلہ ہوتا تو جب اشتہار دیا گیا تھا یعنی سرٹیفکیٹ ولایت حاصل کرنے کے لئے اُس وقت ہر دعویدار کے لئے اچھا خاصہ موقع تھا۔ یہ میاں جان اگر واقعی حیات ہیں تو کیوں خاموش رہے اب چار پانچ برس کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔

نواب مرزا۔ بیدار نہیں ہوئے جگائے گئے ہیں مگر یہ تقریر قبل از وقت ہے آپ کے جانے سے حال کھلے گا۔

جعفر علی شام کی گاڑی سے آگرہ روانہ ہوئے وہاں پہنچ کے شہید ثالث رح کے مزار شریف کی زیارت کی پھر گوالیر روانہ ہوئے۔ یہاں کئی دن قیام کرنا پڑا۔ فوجی دفتر سے پتہ لگا کہ میاں جان پنشن خوار اوجین میں سکونت رکھتا ہے۔ اوجین کو روانہ ہوئے۔ بڑی مشکل سے پتہ لگا کہ وہاں کوئی میاں جان کے نام سے آگاہ نہ تھا۔ صوبہ دار بڑا

عہدہ ہے۔ وہ ایک فرانسیسی صاحب بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے، بالآخر معلوم ہوا صوبہ دار یہیں جمعدار کے نام سے مشہور ہے اُجین کے قریب ایک چھوٹے سے پُرانے میں کچی سی جھونپڑی میں جمعدار میاں خان یا میاں جان رہتے، جو یندہ یا بندہ، آخر یہ پہنچ ہی گئے۔ وہ بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ دو ایک گنوار گھیرے ہوئے ایک بڈھا سا آدمی مگر گرانڈیل، بڑی بڑی سفید مونچھیں۔ گل مچھے اوپر کو چڑھے فوجی انداز سے ایک لنگ کئے ہوئے پُرانا کوٹ پہنے، سپر و تلوار دیوار کی ایک کھونٹی میں لٹکی ہوئی ایک کونہ میں پُرانا فیشن کی بندوق جس کی نالی زنگ کھائی ہوئی، لکڑی کا کندہ دیمک چاٹا کونے سے لگی کھڑی ہے، قدیم فوجی نشانیاں قومی خدمت کا پتہ دے رہی تھیں۔ بات چیت کا انداز بھی فوجی ہے۔

حکیم جعفر علی۔ السلام علیکم۔

جمعدار۔ وعلیکم السلام۔ کہاں سے تشریف لانا ہوا؟

سپاہیانہ سادی وضع اور لکھنؤ کی نفاست کا مقابلہ تھا، اُدھر وہ زین کا خاکی کوٹ بڑا سا پگڑ پر جز پہنے تلنگوں کا منڈاسا منے دھرا ہوا۔

اِدھر جامہ دار کا دگلہ بیلدار پر چہ گوشیہ کمخواب کی بیلدار ٹوپی سفید شالی رومال گلے سے لپٹا ہوا لکھنؤ کی وضع طرح کہیں چھپتی نہیں۔

حکیم صاحب۔ لکھنؤ سے آیا ہوں۔

جمعدار۔ تیور بدل کے، اُسی جعلی مقدمہ میں اب آپ آئے ہیں، معاف کیجئے گا۔

حکیم صاحب۔ شاید میرا مقصد کچھ اور ہو ہر شخص جعلیہ نہیں ہوتا۔

جمعدار۔ اچھا تو اپنا مقصد بیان کیجئے۔

حکیم صاحب۔ ممکن ہے کہ مقدمہ وہی ہو جو آپ کے خیال میں ہے، میری بات

سُن کے جو چاہے رائے قائم کیجئے۔

جمعدار۔ صاف کہئے علی جان والے مقدمہ کا کوئی تعلق ہے۔

حکیم صاحب۔ وہی۔

جمعدار۔ تو آپ کیا کہتے ہیں۔

حکیم صاحب۔ مجھے صرف چند اُمور آپ سے دریافت کرنا ہیں اگر آپ اجازت دیں تو بیان کروں۔

جمعدار۔ پوچھئے۔

حکیم صاحب۔ کیا آپ علی جان مرحوم کے حقیقی بھائی ہیں؟

جمعدار۔ ہرگز نہیں۔ علی جان قوم کے مُغل تھے، منصور الدولہ بہادر کے لڑکے دوسری بیوی سے۔ میں قوم کا پٹھان ہوں۔ علی جان لکھنؤ کے تھے، میں رائے بریلی کا اصلی باشندہ ہوں مٹیا برج میں بھی رہتا تھا وہ بھی میرے باپ محمد خاں سرکار شاہی میں سپاہیوں میں نوکر تھے۔ منصور الدولہ بادشاہ کے مصاحب تھے، ہاں علی جان اور میں ہم عمر تھے میں اور وہ ساتھ کھیل کے بڑے ہوئے۔ میں اُن کی شادی میں شریک تھا۔ وہ جو بیگم صاحبہ لکھنؤ سے بیاہ کے آئی تھیں میرے سامنے بیاہ کے آئی تھیں پھر میں باپ کے مرنے کے بعد بڑے بھائی حسن خاں مرحوم سے لڑکے رائے بریلی چلا آیا۔ پھر ایک دوست کے ساتھ گوالیار گیا۔ وہیں نوکر ہوگیا۔ آجتک وہی سلسلہ چلا جاتا ہے۔ یہاں ایک عقد کر لیا تھا ایک لڑکا دو لڑکیاں ہوئیں خدا کے کارخانے، ادھر بیوی مریں لڑکا تو اُن کے جیتے جی مر گیا تھا لڑکیاں بھی ایک ہی سال کے اندر گذر گئیں۔ میں جیتا رہا۔ تینس ۳۳ برس ملازمت کے بعد اب پنشن پاتا ہوں، یہاں دو چار بگھہ زمین ہے کھیتی کام کرتا ہوں غلہ کھیتوں سے سال بھر کے خرچ کا نکل آتا ہے، پنشن سے اوپر کا خرچ چلتا ہے صبح سے شام تک چٹنی روٹی پیٹ بھر کے مل جاتی ہے مہاراجہ کو دُعا دیتا

ہوں، خدا کا شکر کرتا ہوں پڑا رہتا ہوں مجھے کیا غرض کہ اس بڑھوتی وقت میں علی جان کا بھائی بنوں، پرائے باپ کو اپنا باپ بناؤں۔

حکیم صاحب۔ یہ آپ سے علی جان کا بھائی بننے کی کس جعلیہ نے صلاح بتائی۔

جمعدار۔ وہ لاکھ بنائے میں بنتا کب ہوں۔

حکیم صاحب۔ یہ تو میں سمجھا خدانخواستہ آپ کیوں جھوٹ موٹ کسی کے بھائی، کسی کے بیٹے بنیں مگر یہ قصہ کیا ہے ذرا تفصیل سے بیان کیجیے، میں خاص اسی قصے کے سننے کے لئے لکھنؤ سے آیا ہوں۔

جمعدار۔ قصہ سُنئے، میں نے آپ سے کہا کہ بڑے بھائی حسن خاں سے رنجش ہوئی تھی اس لئے میں مٹیا برج سے چلا آیا تھا، میرے آنے کے بعد بڑے بھائی نے انتقال کیا ایک لڑکی اور لڑکی کی ماں یعنی بھابی صاحبہ وہیں رہیں۔ رائے بریلی میں میری والدہ زندہ تھیں اُن کو میں خط اور خرچ وغیرہ بھیجا کرتا تھا، بڑے بھائی کی لڑکی کی شادی کلکتہ میں قرار پائی، والدہ صاحبہ رائے بریلی سے گئیں بہت ضعیف تھیں مگر پوتی کی شادی بھی کیوں کر نہ جاتیں۔ مجھ کو خط لکھ کے کلکتہ بُلوا بھیجا۔ میں ایک دو سو روپیہ کی تدبیر کر کے لے گیا غرض لڑکی کی شادی غریبا مؤ کر دی گئی وہیں ایک صاحب جو ان سے علی جان کو دریافت کرتے پھرتے تھے اتفاقاً مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے علی جان کا حال جتنا مجھ کو معلوم تھا بیان کر دیا۔

حکیم صاحب۔ اِن صاحب کا نام آپ بتا سکتے ہیں۔

جمعدار۔ جی ہاں۔ مراد علی نام تھا خوب یاد ہے، وہ کئی دن میرے پیچھے پڑے رہے خوب سبز باغ دکھائے، مطلب یہ تھا کہ آپ علی جان کے سگے بھائی بن جائیے انھیں سے معلوم ہوا کہ علی جان کی کوئی لڑکی ہے ماں اُس کو لے کے لکھنؤ چلی گئی تھیں اور کوئی اُن کے عزیز تھے اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کے انتقال کر گئیں، اب لڑکی انھیں کے

پاس ہے، وہ صاحب مرآد علی کہتے تھے آپ دعویٰ کیجئے تو یہ ہزاروں روپیہ کی جائداد آپ کے ہاتھ لگے گی ہم آپ آپس میں حصہ بانٹ کرلیں گے، اور اگر آپ نہ لڑیں تو مقدمہ بیچ ڈالیئے۔ پہلے تو میں اُن سے ایسے ملے کرتا رہا ذرا شرم کی بات ہے لیکن اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ مجھے اُن دنوں روپیہ کی ضرورت تھی۔ مرآد علی نے کچھہ روپیہ بھی مجھکو دیا۔ میں ہاں ہاں کرتا رہا۔ میرا کبھی قصد نہیں ہوا تھا کہ میں یہ جعلی مقدمہ لڑوں مگر وہ مجھکو بیوقوف بنانا چاہتا تھا اور میں اُس کو اُلّو بناتا تھا۔ اس طرح مجھہ کو دو تین سو روپیہ کا فائدہ ہو گیا۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ آپ ایک اشتہار دیدیجئے۔ مجھہ سے کہتے رہے کہ لکھدیجئے۔ میں نے اپنے قلم سے ایک حرف نہیں لکھا آخر انھوں نے آگرہ میں یہ اشتہار چھپوا کے ایک نقل مجھہ کو بھی روانہ کی۔ جعلی مقدمہ تو مجھکو کرنا نہ تھا میں نے اخبار والے کو ایک خط لکھا کہ یہ اشتہار تم نے کس کے کہنے سے چھاپا، اخبار والے نے جواب دیا کہ اُجرتی اشتہار جو ہم کو اُجرت دے گا اُس کی ذمہ داری پر چھاپ دینگے۔ دوسرا خط میں نے مرآد علی کو لکھا کہ تم نے جعلی اشتہار میرے نام سے کیوں دیا فوراً جواب دو ورنہ میں فوجداری میں مقدمہ چلاؤں گا۔ آخر بیچارے دوڑے ہوئے اجین میں میرے پاس آئے میں نے پانچسو اور اینٹھے۔ اب آپ تشریف لائے ہیں۔

اس آخری فقرہ سے یہ مطلب تھا کہ دیکھئے آپ سے کیا وصول ہوتا ہے۔

حکیم صاحب۔ (تخلیہ کرکے) یہ سب تقریر جو آپ نے ادا کی ہے اگر اسکو قلمبند کرکے مجھکو دیں تو میں بھی کچھہ نذر کرنے کو حاضر ہوں۔

جمعدار۔ یہ سب بکھیڑا تو میں نہیں لکھ سکتا مطلب کی باتیں مختصر عبارت میں لکھ کے دے سکتا ہوں۔

حکیم صاحب مجھے صرف اتنا چاہیئے۔

"میں میاں جان بحالت صحت نفس و ثبات عقل باقرار صالح تصدیق

کرتا ہوں کہ یہ اشتہار جو میری طرف سے دختر علی جان کی ولایت کے مقدمہ میں دیا گیا تھا جھوٹا ہے - میں نے ہرگز اس اشتہار کے چھاپنے کی اجازت نہیں دی تھی، نہ میں علی جان کا حقیقی بھائی ہوں نہ رشتہ دار ہوں، مجھے مقدمہ ولایت دختر علی جان سے کوئی تعلق نہیں ہے - میں اجازت دیتا ہوں کہ یہ تصدیق میری طرف سے کسی اخبار میں چھاپ دیجائے یا جب ضرورت ہو عدالت میں پیش کیجائے۔"

فقط :-

العبد

میاں جان جمعدار پنشن خوار سرکار مہاراجہ صاحب گوالیار،

حکیم جعفر علی نے پانسو روپیہ دے کے یہ ضروری سارٹیفکٹ حاصل کیا جمعدار نے ایک دن دھوم سے دعوت کی، اس اثنار میں حکیم جعفر علی نے اس مقدمہ کے جستہ جستہ حالات، اختری بیگم کی نیک بختی مراد علی کی بدمعاشیاں خورشید مرزا صاحب کی نیکی مگر بھولاپن یہ سب واقعات جمعدار سے بیان کیے - آخر آئندہ خط و کتابت، جاری رکھنے کا اقرار لے کے حکیم صاحب کو رخصت کیا، بعد بے تکلفی و ملاقات یہ رقم پانسو کی واپس کرنا چاہی مگر حکیم صاحب نے واپس نہیں لیے۔ اس کے بعد لکھنؤ کو روانہ ہوئے۔ اس جعل کے کھلنے کے بعد حکیم صاحب نے فوراً نواب مرزا کو تار دیا۔ "طلسم ٹوٹ گیا قابل اطمینان کامیابی ہوئی" نواب مرزا نے تار کی خبر اختری بیگم کو پہنچا دی، اختری بیگم بہت خوش ہوئی -

# باب ۲۰

زینب بیگم نے بوٹن کے رنگ دیکھ کے محسن علی کو تار دیا بوٹن کو لیجاؤ وہ آئے بوٹن کو سوار کر کے لے گئے۔ ادھر سے بھی گویا مراد علی کو ناکامی ہوئی، مگر شرفو کہے جاتی تھی، منشی جی گھبرائیے نہیں یہ عورت آپ کے ہاتھ سے نہیں جائے گی، آئے پر آئے۔

ہرمزی ڈولی میں ساڑھے ۴ بجے اسکول سے آئی ڈولی دروازہ پر لگائی یہ ڈولی سے اتری کہار رخصت ہوئے۔ یہ مکان میں جا رہی تھی کہ اس کو ایک پوسٹ کارڈ دروازے کی چوکھٹ کے پاس پڑا ہوا معلوم ہوا۔ اُس نے پوسٹ کارڈ اٹھا لیا۔ پتہ لکھا تھا، شہر لکھنؤ محلہ معالی خاں کی سرا متصل مکان میر امتیاز علی (ہرمزی کے والد مرحوم کا نام تھا) رحیم بخش کو ملے۔

پوسٹ کارڈ میں لکھا تھا منشی جی کہہ دینا سونے کی بوٹی مل گئی بارھویں تاریخ جمعہ کے دن شام کی گاڑی میں ہم لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔

ہرمزی کا دل کھٹک گیا، سونے کی بوٹی۔

جاہل ناخواندہ مرد ہو یا عورت اپنی ذرا سی ہوشیاری کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اول تو شرفو کو یہ خیال ہی نہ تھا کہ پوسٹ کارڈ سوائے رحیم بخش یا مراد علی کے کسی اور کو مل سکتا ہے۔ یہ خیال تو کسی حد تک ٹھیک تھا مگر اُس کو یہ نہ یاد رہا کہ ممتاز علی جنکے پتہ سے خط آتے ہیں یہ ہرمزی کے باپ کا نام ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ پوسٹ کارڈ پہلے ہرمزی کے پاس جائے۔ ہرمزی رنڈی کی مہر دیکھ کے فوراً پہچان گئی کہ یہ

شرفو کی کارروائی ہے یہ بوٹن کو مراد علی کے لئے بھگائے لاتی ہے۔ اُس نے فوراً اختری کے ذریعہ سے نواب مرزا کو اطلاع دی، نواب مرزا پہلے سے ہی ہوشیار تھے۔ لیکن اس جدید واقعہ کی اُن کو خبر نہ تھی، اب اُن کو یقین ہو گیا کہ مراد علی بوٹن کو لے کے بھاگ جائے گا۔

مراد علی نے جواہرات کا صندوقچہ مہاجن کی کوٹھی سے نکلوایا اُس وقت بھی گرفتاری کا موقعہ تھا مگر وہ خورشید مرزا کا مختار عام تھا، فوراً کہہ دیتا نواب صاحب کے پاس لئے جاتا ہوں۔ اُنھوں نے قصد کر لیا کہ خُدا نے چاہا تو ریل گاڑی پر سوار ہوتے وقت گرفتار کر لوں گا۔ نواب مرزا نے اس دانائی سے اس کی نگرانی رکھی تھی کہ اس کو کسی قسم کا شبہ نہ ہونے پایا۔ آخر جمعہ کا دن گذرا شام ہوئی۔ ہرمزی چادر بچہ کر کے اسٹیشن پر پہنچ گئی، بریلی گاڑی دوسرے نمبر کے پلیٹ فارم پر آتی تھی۔ ہرمزی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے دیکھا ایک شخص جوان میانہ قد سے کچھ۔ بڑی بڑی مونچھیں ڈاڑھی منڈی ہوئی سانولا رنگ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر پھر رہا ہے گویا وہ بھی کسی کے انتظار میں ہے۔ ہرمزی کے دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو یہی مراد علی ہو (اُس نے مراد علی کو کبھی نہیں دیکھا تھا) اب ہرمزی کی نظریں برقعہ کی جالی سے اسی طرف متوجہ ہو گئیں۔ گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی، پلیٹ فارم پر جو لوگ تھے اُن میں باتیں ہو رہی تھیں گاڑی آج ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہرمزی کسی سے کچھ کہہ کے نہیں آئی تھی وہ کبھی رات کو گھر سے باہر نہیں جاتی تھی اُس کو خیال تھا کہ اماں بہت پریشان ہوں گی۔ مگر خیر جو کچھ ہو میں بوٹن کو لے کے جاؤں گی۔ ہرمزی نے یہ بھی دیکھا کہ اُسی جوان کے قریب قریب مسافروں کی اوٹ میں ایک اور شخص ادھیڑ سا کتروان ڈاڑھی، دراز قامت مراد علی کے پیچھے پیچھے ہے۔ اب گاڑی کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے کہ اس

ادھیڑ آدمی نے مرآد علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ذرا علیحدہ چلے آیئے یہ لفظیں خود ہرمزی نے اپنے کانوں سے سُنیں، مرآد علی اُس شخص کی مزاحمت سے پہلے کچھ گھبرا سا گیا! اُس کے بعد دلیر ہو کے میں اس وقت کسی کی نہیں سُن سکتا، میرے گھر کی سواریاں ریل پر آرہی ہیں عورتوں کو اُتارنا ہے۔ یہ موقعہ کسی سے گفتگو کا نہیں ہے۔ دباتیں کرتے کرتے یہ دونوں ہرمزی کے پاس آگئے تھے جو کچھ باتیں ہوئیں ہرمزی نے اچھی طرح سُنیں) دوسرا شخص میری بات آپ کو سُنا ہی پڑے گی، نہیں تو میں دوسری تدبیر کروں۔ مجھکو آپ کی زحمت کا خیال ہے اور اپنا مطلب آشتی سے نکالنا چاہتا ہوں ورنہ ــــــ

جوان آدمی۔ ورنہ کیا، میری زحمت کا خیال آپ کو ہے۔ خیر میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر خواہ مخواہ آپ کسی کے کیوں مزاحم ہوتے ہیں۔

ادھیڑ آدمی۔ اب میں صاف کہتا ہوں کہ مالِ مسروقہ آپ کے پاس سے ابھی گرفتار کرا سکتا ہوں۔

جوان۔ یہ غلط ہے آپ کو دھوکا ہے۔ اچھا چلئے گھڑی دیکھ کے ابھی گاڑی کے آنے میں آدھ گھنٹہ ہے۔ یہ کہہ کے وہ دونوں پلیٹ فارم سے پُل کی طرف جاتے نظر آئے اس اثناء میں دو شخص اور اُس ادھیڑ شخص کے ساتھ جاتے دکھائی دیئے مگر ذرا دور دور۔ یہ لوگ اُدھر گئے، خدا جانے کہاں گئے، ہرمزی کو معلوم نہیں، " ہرمزی خدا کرے ریل کے آنے تک نہ آئیں۔ میں بوٹن سے مل لوں، بوٹن یقیناً میرے ساتھ چلی چلے گی۔ اس کمبخت نے کیا کیا۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔" اتنے میں ریل کی سیٹی ہوئی مسافر پلیٹ فارم کے کنارے سے ہٹائے گئے، گاڑی بڑے جوش وخروش کے ساتھ جنگھاڑتی پھنکار (؟) دھواں بھق بھق نکلتا ہوا طرفۃ العین میں اسٹیشن پر پہنچکے تھم گئی، قلیوں نے گاڑیوں کو گھیر لیا۔ مسافر جلد جلد اُترنے لگے جو لوگ کسی کو لینے آئے تھے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے

بھاگنے لگے - ہرمزی بھی اپنی جگہ سے اٹھی گاڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی - بوٹن نہیں آئی - اتنے میں اس کی نظر شرفو پر پڑی - اب ہرمزی کو یقین ہو گیا بوٹن بھی ضرور ہے - بوٹن برقعے میں لپٹی لپٹائی اُتری - ہرمزی نے پاس جا کے ہاتھ پکڑ لیا - شرفو کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - اب دو برقعہ پوش عورتیں آمنے سامنے کھڑی ہیں - شرفو پل کی طرف جلد جلد قدم اُٹھا کے جاتے دکھائی دیا -

ہرمزی - بوٹن یہ تو نے کیا غضب کیا، ارے نہ اپنی آبرو کا خیال کیا نہ ماں باپ کی -

بوٹن - ڈر سی گئی، کچھ دیر خاموش رہی (ہرمزی سمجھی کہ جواب کیا دے گی، اب میرے ساتھ شہر چلی چلے گی جو کچھ ہوا اب اس وقت زیادہ چھیڑنا اچھا نہیں) -

ہرمزی - اچھا تو اب چلو -

بوٹن - (چلوں کہاں) اب میرا منہ اس قابل نہیں کہ کسی کو صورت دکھاؤں جو میری قسمت کا لکھا تھا پورا ہوا - لے تم جاؤ -

ہرمزی - اب میں تم کو چھوڑتی ہوں ساتھ لے کے جاؤں گی -

بوٹن - بہن ہرمزی ضد نہ کرو میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی -

ہرمزی سمجھی کہ دب گئی، کسی قدر تحکم کے ساتھ کیوں کر نہیں جاؤ گی - میں تو لے کر جاؤں گی -

بوٹن - جب میں نہیں جاتی تو تم کیا لے جاؤ گی، کس کو لیجاؤ گی - کسی قدر آوازیں بلند ہو چلی تھیں -

ہرمزی - ذرا آہستہ ہاؤ چپکے چپکے بات کرو - چاروں طرف غیر مردوئے ہیں، کیا لڑو گی اور پھر سرِ بازار، لے اب چلیے، ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف گھسیٹا -

بوٹن - زور سے ہاتھ جھٹک کے، اور غصہ سے، نہیں جاتے، یہ بھی زبردستی ہے، میں اپنے شوہر کے انتظار میں کھڑی ہوں وہ یہیں کہیں ہوں گے -

ہرمزی - شوہر کیسا - یہ شر تو کسٹی تم کو گھر سے نکال کے لائی، ٹھہر جاؤ دیکھو اس کا سر مونڈ اجائے گا ناک کاٹی جائے گی -

بوٹن - وہ کیا بھگا لاتی — میں ایسی ننھی بچی ہوں کوئی پھسلا کے لے آتا - میں اپنے نکاحی خصم کے پاس آئی ہوں -

ہرمزی - نکاح کیسا - کس نے نکاح کیا - کہاں ہوا کیوں کر ہوا -

بوٹن - اس قصہ سے تم کو کیا میں اپنی آپ مختار ہوں - میں نے خود خوشی سے اپنا نکاح کیا، لے اب جاؤ - ابھی تک میں بہن بہن کہے جاتی ہوں - نہیں تو —

ہرمزی - نہیں تو کیا - اندھیر ہے نہ کہ میں تم کو چھوڑ کے، ایک بدمعاش کے حوالے کر کے چلی جاؤں -

بوٹن - لے سیدھی چلی جاؤ نہیں تو میں ابھی چیختی ہوں کہ میں اس عورت کو نہیں جانتی، میں مسافر ہوں اپنے شوہر کے پاس آئی ہوں، یہ زبردستی مجھکو پکڑ کے خدا جانے کہاں لیجانا چاہتی ہے - خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے - لے ہاتھ چھوڑ دو نہیں تو چیختی ہوں -

ہرمزی - اس حد تک بوٹن کو ڈھیٹ نہ جانتی تھی، اس کو یقین تھا کہ میرے ملنے کے بعد چپکی ساتھ چلی آئے گی، اُس نے یہی بڑی جرأت کی تھی کہ اس طرح ماں کی بلا اجازت اسٹیشن پر آئی، بوٹن کسی پڑھے جن کی پڑھائی ہوئی تھی - واقعی اگر اُس نے یہی کیا جو کہتی ہے اور وہ مرُدوا ابھی آ گیا تو خدا جانے کیا ہو، یہ کہتی ہے کہ میرا نکاحا خصم ہے اگرچہ یہ ضرور جھوٹ ہے اس وقت تو اس کا فقرہ چلتا ہوا ہے - مجھے کیا پڑی ہے جو بھٹے میں جائے -

یہ بات دل میں سمجھ کے ہاتھ چھوڑ دیا اور ہٹ کے علیٰحدہ کھڑی ہو گئی، اب اُس نے دیکھا کہ وہ نوجوان آ گیا اور آتے ہی بوٹن کے پاس گیا - دونوں میں چپکے چپکے باتیں ہوئیں - وہ شخص ادھیڑ سا جو ساتھ گیا تھا اب ساتھ نہیں ہے -

اب یہ دونوں ڈیننگ، روم کی طرف روانہ ہوئے۔

جب بوٹن اور مرادعلی (کیونکہ اب ہرمزی کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص مرادعلی ہے) ملے بوٹن نے مرادعلی سے ملتے ہی گھبرا کے دریافت کیا، کانپور کی گاڑی کب جائے گی۔" مرادعلی کو اس کا علم ابھی نہیں ہونے پایا تھا کہ کوئی عورت یا مرد بوٹن کو لینے آیا ہے" کانپور کی گاڑی دس بجے۔

ہرمزی۔ ادھیڑ سے شخص کو سمجھ گئی کہ یہ کوئی دوست مرادعلی کا نہیں ہے بلکہ اس کی گرفتاری کی فکر میں آیا ہے خدا جانے مُوا اب تک گرفتار کیوں نہ ہو گیا۔ اگر یہ بدمعاش گرفتار ہو جائے تو بوٹن ضرور میرے ساتھ چلی چلے گی۔ اس خیال سے ہرمزی اسٹیشن پر ٹھہری رہی۔ آخر تو میں آئی ہوں دو تین گھنٹے ہو گئے مگر بہت بری بات ہو شاید بوٹن اس بدمعاش کے پھندے سے نکل کے میرے ساتھ ہو جائے۔

ہرمزی چپکی ایک بنچ پر بیٹھ گئی جو زنانہ ڈیننگ روم سے کسی قدر فاصلہ پر تھی، اُس نے دیکھا کہ مرادعلی اپنا اسباب بوٹن کے پاس چھوڑ کے پوریاں مٹھائی خرید کے لایا۔

ہرمزی کا کوئی بس نہیں چل سکتا اگر اس وقت ہرمزی اُس شخص سے جو ادھیڑ ہے یہ حال کہے تو شاید کچھ ہو سکے۔ مگر غیر مرد سے بات کرنے کی اُس کو جرأت نہ ہوئی۔

ہرمزی نواب مرزا کا نام اختری سے سُن چکی تھی مگر صورت نہ دیکھی تھی۔ دل میں خیال تھا کہ یہی نواب مرزا ہیں مگر کیا وجہ ہوئی کہ انھوں نے اس کو (مرادعلی) کو چھوڑ دیا لو ساڑھے نو ہو گئے صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے یہ نواب مرزا ہیں جن کو تھوڑی دیر ہوئی دیکھا تھا، یقیناً وہی ہیں، اے ہے حکیم صاحب اس موقعہ پر کیوں نہ ہوئے اُن سے میں بات کر سکتی تھی ہرمزی غریب کو کیا معلوم تھا کہ حکیم صاحب راجپوتانہ کی سیر کر رہے ہیں۔

نواب مرزا نے فوراً کیوں نہ گرفتار کیا؟ بات یہ ہے کہ مرادعلی بڑا چلتا پرزہ تھا۔ جس طرح چور جب چوری کو نکلتے ہیں سینکڑوں فکریں اپنے بچاؤ کی موقع سے نکل بھاگنے

کی پہلے سے سوچ کے اُس کی تدبیر کر لیتے ہیں۔ پہلے فال شگون لیتے ہیں، گیدڑ کے بولنے کا انتظار رہتا ہے پھر کپڑے اوتار کے چٹ لنگوٹ کستے ہیں بدن پر تیل ملتے ہیں توے کی سیاہی تیل میں گھسی ہوئی ہوتی ہے اسی لئے عورتیں تیل تو اپکار کے چور کی حفاظت کا ٹوٹکا کیا کرتی ہیں پھر چھری کمر میں لگا کے پستول ریوالور بھر کے کمر میں باندھ کے ہر طرح مضبوط ہو کے چوری کو نکلتے ہیں، مرزا علی کا یہی حال تھا، مگر اُس کی اور تدبیریں تھیں۔ عمدہ امیرانہ لباس میں اُسنے اپنی رذالت کو چھپایا تھا۔ ریوالور بھی اُس کے بیگ میں تھا مگر سپاہیانہ دفاع کی نہ اس کو جرأت تھی نہ بالفعل ضرورت تھی۔ شاید مغلوب بلی کی طرح کسی وقت جرأت کر بیٹھے، قانونی حفاظت اُس نے ہر طرح سے کر لی تھی، خورشید مرزا کا مختارنامہ اُس کی جیب میں تھا۔ جواہرات مہاجن سے لانے کے لئے جو رقعہ لکھا گیا وہ بھی چالاکی سے وہ مہاجن کی آنکھ بچا کے اٹھا لایا تھا۔ نہیں معلوم کن تدبیروں سے ملک عرب میں جانے کے لئے پروانہ راہداری بھی اُس نے حاصل کر لیا تھا۔ عجب نہیں کہ نکاح کا واقعہ بھی درست ہو جس زمانہ میں بوٹن لکھنؤ میں تھی اور بانس کی سیڑھی تیار ہوئی تھی۔ اُسی زمانہ میں یہ جعلی نکاح ہوا ہو تو کیا تعجب ہے۔

نواب مرزا ایک بیگ فوجداری کے مقدمہ میں ہاتھ ڈالنے سے جھجکتے تھے ممکن ہے کہ بدمعاش صاف نکل جائے اور اُلٹے میں پھنس جاؤں یہ خیال بھی تھا، پولیس اپنی ذمہ داری پر گرفتار کرنے سے انکار کر چکی تھی۔ اِدھر مرزا علی نے کامیابی کے لئے ہر طرح سے مضبوطی کر لی تھی۔ غرضکہ واقعات کی میزان برابر تھی اگرچہ قدرتاً نواب مرزا کا پلہ جھکتا ہوا تھا مگر شبہ مدعیٰ علیہ کے مفید تھا۔ ہرمزی کے خیالات تو اِن باریکیوں تک نہ پہنچے تھے مگر وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ سبب ہے جس سے نواب مرزا نے اس موئے کو چھوڑ دیا۔ بالوں بال بچا جاتا ہے۔ کورا نکلا جاتا ہے۔ اثنائے گفتگو میں بوٹن کے منہ سے نکل گیا تھا ہم ابھی راہ پر جاتے ہیں تم اُلٹی رہ گئی ہو۔

ہرمزی ۔ آخر کہاں جاتی ہو؟

بوٹن ۔ تو یہ کیوں بتائیں، اچھا تم کیا کر سکتی ہو، بتائے دیتے ہیں کعبہ شریف جائیں گے ۔ پرسوں تک مبئی پہنچ کے ٹکٹ لے کے جہاز پر سوار ہو جائیں گے، پھر ہمیں کون پاتا ہے ۔

بمبئی جہاز کعبہ شریف یہ سب بی جمن (شرفو) کی تعلیم تھی ۔

ہرمزی کو نواب مرزا کے آنے کی اُمید لگی ہوئی تھی ۔ چپکے چپکے دعائیں مانگ رہی تھی یا علی شیر نواب مرزا کو لاؤ گھیر ۔۔ اے لو گھنٹی ہو گئی نواب مرزا کا ابتک پتہ نہیں ہے ۔ دوسری گھنٹی بھی ہو گئی، ریل کے چھوٹنے سے پہلے مراد علی نے بوٹن کو گاڑی میں بٹھایا خود بھی گاڑی میں گیا مگر پھر اُتر آیا، ایک کیلے والا ریل کی کھڑکی کے پاس تھا بوٹن نے منہ نکال کے (برقعہ کی جالی منہ پر ہے مگر ہرمزی نے اچھی طرح پہچان لیا) بوٹن نے ایک گود کیلے کی مول لی ۔ مراد علی نے جیب سے روپیہ نکال کے دیا، جلدی پیسے دو گاڑی چھوٹا چاہتی ہے ۔ اب نواب مرزا دکھائی دیے ۔ نواب مرزا کو دیکھ کے گاڑی میں جا بیٹھا ۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی، گارڈ نے کھڑکی زور سے بند کی جو لوگ ریل کے پاس تھے اُن کو ہٹایا، نواب مرزا نے چلتی گاڑی میں چڑھنے کا قصد کیا، گارڈ نے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا ۔ نواب مرزا نے جلد جلد گارڈ سے کچھ باتیں کیں ۔ گارڈ ریل پر چڑھنے کو آگے بڑھا یہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے ۔ آخر ہرمزی نے دیکھا یا خالی شبہ تھا کہ نواب مرزا گارڈ کے ساتھ ہی ساتھ تھے ۔ ہرمزی نے گاڑی میں چڑھتے تو نہیں دیکھا مگر ریل کے چلنے کے بعد بڑی دیر تک نواب مرزا کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی وہ واپس نہیں آئے شاید ریل گاڑی میں جگہ مل گئی ۔

اب ہرمزی کا ٹھہرنا بیکار تھا، ریل کے پھاٹک سے باہر نکلی ایک اِکے پر سوار ہو کے شہر کی طرف روانہ ہوئی ۔ ہرمزی نے زندگی بھر کبھی ایسی جرأت نہ کی تھی اُسکو خود

خوف تعجب تھا کہ یہ میں نے کیا کیا اماں جان بہت خفا ہوں گی۔ بوٹن کو ساتھ لے کے جاتی تو بھی ایک بات تھی، میری وہی مثل ہوئی، کہاں گئی تھی کہیں نہیں، کہاں سے آئی ہوں کہیں سے نہیں۔

ہرمزی گیارہ بجے کے بعد گھر پہنچی، اختری کو خلاف وقت اپنی ماں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ مہرمزی پر زیادہ خفگی نہیں ہوئی۔ پوسٹ کارڈ کا واقعہ ماں سے اب تک چھپایا تھا اس خیال سے کہ وہ ہرگز روادار نہ ہوتیں کہ میں برقعہ اوڑھ کے ریل کے اسٹیشن پر ماری ماری پھروں چولھے میں پڑے بوٹن بھاڑ میں جائے بوٹن تم کو کیا پڑی تھی کہ دوڑی گئیں مگر بات معقول تھی اس لئے زینب بیگم خاموش ہو گئیں۔ ہرمزی کو یہ فکر ہوئی اختری بیگم اسوقت کہاں، شاید اماں کے اکیلے ہونے سے بیٹھی رہیں۔ اب چلی جائیں گی جب آدھی رات سے زیادہ ہوگئی اور اختری نے جانے کا نام نہ لیا، ہرمزی کا تعجب زیادہ بڑھنے لگا آخر حالات کھلے۔

اختری۔ دیکھتی کیا ہو۔ میں تمہارے گھر میں ہمیشہ کے لئے رہنے کو آئی ہوں۔ کیا تم بھی نکال دو گی۔

ہرمزی۔ یہ آپ کا گھر ہے آپکے لائق نہیں مگر یہ نکال دینا کیسا کچھ تو کہئے، آپکو نکال کون سکتا ہے،

اختری۔ آخر اپنے گھر اور پرائے گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آج کو اپنا گھر ہوتا تو کیوں اس طرح ذلت سے نکلتے۔ ڈولی تک نہیں بلانے دی۔ یہ کہہ کے اختری چیخیں مار مار کے رونے لگی، آج معلوم ہوا کہ اماں جان مر گئیں، اور زور سے چلا کے رونے لگی۔ آخر ہرمزی نے گلے سے چمٹایا، قسمیں دے کے رومال منہ سے ہٹایا۔ ہاتھ منہ دھلایا۔ اختری بیگم چپکی ہو کے بیٹھی مگر اب بھی آنسوؤں کا مینہہ برس رہا ہے۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

# باب ۲۱

قہر ہے کنج قفس میں بھی نہ آرام ملا — دشمن جاں ہوئے صیاد کے غمخوار عبث

خورشید مرزا کے کارخانہ کی ابتری ناظرین کو معلوم ہے۔ مصنوعی چچا کا خوف ہمیشہ غالب رہتا ہے بے آبروئی قید ذلت جیل خانہ مہیب شکل بنائے ہر وقت کالے دیو کی طرح منہ کھولے ایک دم میں ہڑپ کر لینے کی دھمکی دے رہا ہے نفس لوامہ ملامت گر ہے کیا اسی لئے خورشید بیگم نے اپنی پیاری اکلوتی لڑکی کا ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا کہ میں اس نابکار مرآد علی کے اغوا سے اُس کے مال لاکھوں روپیہ باپ کا سا مال اپنے صرف میں لاؤں میری نیک نیتی چاہتی تھی کہ میں خود اپنے روپیہ سے اس بن ماں باپ کی بچی کو پرورش کروں یہ نہ ہو سکا تو یہ چاہیئے تھا کہ اُس کے مال کو سانپ بچھو سمجھوں ہاتھ سے نہ چھوؤں، اس نامراد مرآد علی نے کہیں کا نہ رکھا، خود ہی مال پر تصرف کرنے کی صلاح دی اب چچا کا طرفدار بنا ہوا ہے سینکڑوں دلیلوں سے اُس کی جیت میری ہار ثابت کرتا ہے اور پھر یہی مشورہ دئے جاتا ہے کہ زرِ نقد، پرو نوٹ تمسک قبالہ ان سب کو اپنا مال کر لوں کئی دن سے انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں ہیں کسی کروٹ کسی پہلو چین نہیں، دو دن سے حرارت سے سر پھٹا پڑتا ہے۔ آج صبح کو کچھ آپ ہی بکس کی کنجیاں سامنے پڑی تھیں صندوقچہ سامنے دھرا تھا ناخواستہ بکس کو کھولا ہائیں یہ جک بک کیا ہوئی پرامیسری نوٹ تو ہیں صندوقچہ کے اوپر کا خانہ ہٹا کے دیکھا ایک نوٹ نہیں سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گذری تھی مدار بخش نے کہا چنا مل کا منیم آیا ہے، آپ سے ملنا چاہتا ہے" دیوانخانہ میں

بلالیا۔ منیم سلام کر کے بیٹھ گیا۔ مجھکو لالہ نے بھیجا ہے، مختار صاحب جواہرات کا صندوقچہ لالہ سے لے گئے، رسید اپنی دستخطی لکھدی، لالہ نے مجھ سے کہا ہے کہ نواب صاحب کے ہاتھ کی رسید لادو، مراد علی مختار عام ہے مگر لالہ کہتے ہیں خود نواب صاحب کی رسید ہونا چاہئے بھاری معاملہ ہے زمانہ بُرا جا رہا ہے (دل میں) جواہرات کے صندوقچہ کی رسید، منگایا کس نے تھا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں کہا یہ کہہ کے ٹال دیا مختار ابھی آیا نہیں ہے وہ آئے تو رسید بھیجدونگا۔

منیم۔ مگر آج ہی بھیجدیجئے۔

نواب صاحب۔ ہاں تیسرے پہر تک بھیجدوں گا، خاطر جمع رکھیں۔

ابھی تک نواب صاحب خواب خرگوش میں ہیں اب بھی یکایک نہیں خیال میں آیا کہ اتنی بڑی چالاکی مراد علی کی مجال نہیں ہے ابھی قید ہو جائے گا۔ پرامیسری نوٹ کون بھنا سکتا ہے اُس کے فروخت کا مختار کو اختیار نہیں جواہرات کیا منہ کا نوالا ہے کہ کوئی جھپ سے نکل لے گا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ہوش بجا ہوئے نوٹوں کے بیچنے کے لئے جعل ہو سکتا ہے۔ جعلی خورشید مرزا لکھنؤ میں نہ سہی بمبئی کلکتہ میں کسی کو بنا دینا مختار نامہ میں اس اختیار کو جعل سے بڑھا لینا جواہرات کو سرکاری عملداری سے نکل کے بیچ لینا یہ سب ہو سکتا ہے۔ مگر مراد علی سامنے کا چھوکرا ایسی جرأت نہ کریگا بخار چڑھتا آتا ہے۔ چند ہی منٹ کے بعد جیسے کسی نے کان میں پھونک دیا۔ مراد علی سب مال لے کے چلتا ہوا، چک تمک، تمسک نوٹ صندوقچہ سب جا چکا۔ اب تک ہوش نہیں آتا ہوش کیا آتا۔ اب تک یقین نہ تھا جب سب باتوں کا یقین آیا گویا دفعتہً برابر بجلی گری، خورشید مرزا کھڑے ہو گے اندر جانا چاہتے تھے تیورا کے گرے گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ باہر امام علی موجود تھا۔ اُس نے چلا کے اندر خبر کی جعفری بیگم چیل کی طرح پہنچیں، باپ کو بے ہوش پایا، بخار ہے کہ جیسے چنے بھُن رہے ہیں فوراً

پیٹنا شروع کیا۔ ہے ہے ابا جان! ہے ہے ابا جان! ہائے ہے ابا جان کو کیا ہو گیا۔ مثل ہے نزلہ برعضو ضعیف می ریزد۔ اختری سر پکڑے سامنے کھڑی تھی۔ جب سے یہ بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ کیسی بیگم جب سے یہ...... یہ سب اس چڑیل کی بدولت ہوا۔ گھر کو خاک میں ملا دیا۔ جھاڑو پھیر دی۔ اب تک گھر سے نہیں نکلتی، اب کیا مُردے نکال کے جاؤگی اور مُردا تو کر دیا۔ اب اُن میں ہے کیا۔

اختری۔ باجی ماموں جان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس وقت لڑنا مناسب نہیں ہے خدا اُن کو اچھا کر دے پھر جو چاہنا کہنا۔

جعفری۔ چُپ...... تیری باجی کون ایسی تیسی ہے۔ بڑی ماموں جان کی چاہیتی تیرے کارن تو یہ حال ہوا۔ جب سے آئی گھر میں چھوت لگ گئی بھرا پُرا گھر تہس نہس ہو گیا موئی بُھن پیری سبز قدم۔ پہلے مال پر بنی اب جان پر بن گئی۔

"جعفری خورشید مرزا کی بڑی لڑکی تھی اُن کے نہ ہوتے یہی گھر کی بزرگ تھی اگرچہ مسلمانوں کی شریعت سے دونوں بہنیں برابر کی حصہ دار تھیں پھر بھی جعفری بڑی ہونے کی وجہ سے اس گھر کی حاکم تھی۔ اب خورشید مرزا بے ہوش پڑے ہیں گویا مُردہ ہیں۔ جعفری کو حکومت جتانے کا اچھا موقع ہاتھ آیا وہ اختری سے خار کھاتی تھی دل ہی دل میں تاؤ پیچ کھا کے رہ جاتی تھی۔ خورشید مرزا کے ہوتے کسی کی مجال نہ تھی کہ دم مار سکے اب خود جعفری کا راج تھا اُس نے برسوں کی کسر دم بھر میں نکال لی، سچ تو یہ ہے کہ اس حکومت کے ملنے سے ایک طور سے خوش ہوں اس لئے کہ اُس کو اختری سے انتقام لینے کا موقع مل گیا جیسے اکثر جاہل کہا کرتے ہیں کہ سوا گھڑی کی بادشاہت ہو جائے تو جس نے مجھکو ستایا ہے اُس کی بوٹیاں کاٹ کے چیل کوّوں کو کھلادوں۔ ٹھیک یہی حال تھا۔ الف لیلہ میں اس کی مثال ملتی ہے سوتے جاگتے کی کہانی میں خلیفہ ہارون رشید کی خلافت ملنے سے ابوالحسن نے اپنے محلہ کے موذن کو

پڑا کے تشہیر کیا اور شہر سے نکلوا دیا، بس یہی سلوک جعفری نے اختری کے ساتھ کیا۔" اب تجھکو ایک دم کے لئے گھر میں یا نہ رہنے دوں گی۔ یہ کہہ کے ہاتھ پکڑ کے باہر نکالنے چلی۔

نادری۔ باجی خدا کے قہر سے ڈرو کوئی اس طرح بھی کسی کے ساتھ کرتا ہے ابا جان خفا ہوں گے۔

جعفری۔ اور آگ بگولا ہو گئی، تو چپ رہ نہیں تو مارتے مارتے دم تیرا نکال ڈالوں گی۔ پھر اختری کی طرف بڑھی۔

اختری۔ اچھا تو ڈولی بلوا لینے دو۔

جعفری۔ بڑی ڈولی پر چڑھنے والی۔ پرائے گھر میں خیرات کے ٹکڑوں پہ پڑی ہیں ڈولی پر سوار ہو کے جائیں گی۔ خیرات خوری۔

اختری کو کچھ نہ بن پڑا۔ دروازے پر جا کے نوکروں کا منہ پھروا کے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ لی اور ہرمزی کا گھر تھوڑی ہی دور تھا گلی میں سناٹا پڑا تھا، زار وقطار روتی ہوئی ہرمزی کی ماں کے پاس چلی گئی، یہ وہی دن تھا جب ہرمزی پوٹن کی فکر میں ریلوے اسٹیشن گئی ہوئی تھی۔

ترے کوچہ سے ظالم ایسی مجبوری سے ہم نکلے
کہ جیسے کشمکش میں عاشق شیدا کا دم نکلے

ہرمزی کی ماں، اختری کے حالات سے کسی قدر واقف ہو چکی تھیں اختری کو اس دہاڑے سے نکلتے دیکھ کے سخت تاسف کیا۔ یہ بی جعفری کے کرتوت ہیں۔ میں تو پہلے کہتی تھی کہ ایک دن یہ انجام ہونا ہے یہ لڑکی کسی کی نہیں ہے کیسے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں خدا کرے خورشید مرزا اٹھ کھڑے ہوں تو دیکھا بی جعفری کی کیا گت ہوتی ہے۔

اختری۔ وہ خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں میں تو اس گھر میں نہ جاؤں گی، پھر

نزدیک جعفری کا کوئی قصور نہیں ہے یہ میری قسمت ہے اماں کیا سمجھی تھیں جو کچھ انہوں نے میرے لئے کیا میری بھلائی کے لئے کیا اُن کو اس دن کی کیا خبر تھی، یہ تقدیری امور ہیں

جس کو میں دوست بناؤں مرا دشمن ہو جائے
میں اگر موم کو پگھلاؤں تو آہن ہو جائے

خورشید مرزا پر غشی کا عالم دیر تک طاری رہا آخر جعفری نے چیخ چیخ کے کان کے پاس چلا چلا کے ہوشیار کر دیا۔ ہوشیار تو ہوئے مگر بخار بہت تیز ہو گیا تھا۔ اب جو آنکھ کھلی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ پلنگ پر اٹھ بیٹھے کھڑے ہو گئے۔ کپڑے پھاڑنے لگے۔ سرسامی حالت ہو گئی۔ گھر میں عورتیں تھیں یا باہر نوکر چاکر تھے۔ حکیم جعفر علی کو دریافت کیا معلوم ہوا باہر گئے ہوئے ہیں کب گئے ایک ہفتہ ہوا کب آئیں گے معلوم نہیں۔ نواب مرزا اور جعفر علی کی ایک صلاح تھی چپکے چپکے کارروائیاں کرتے تھے کسی کو کانوں کان معلوم نہ تھا کہ کیا کر رہے ہیں۔

خورشید مرزا کی یہ حالت دیکھ کے ڈاکٹر کو بلا بھیجا، ڈاکٹر صاحب نے حال دریافت کیا معلوم ہوا، بخار تھا اور اسی حالت میں غش آگیا تھا۔ ہم لوگوں نے چونکایا۔ ڈاکٹر نے سخت افسوس کیا غش آتے ہی کیوں نہ خبر کی، بیوقوفی سے چونکائے گئے اسی حالت میں نیند آنے کی دوا دینا تھی تاکہ سو جائیں۔ جب آپ ہی آپ ہوشیار ہوتے ادھر بخار بھی اتر جاتا، بہت جلد اچھے ہو جاتے۔ اب حالت نازک ہو گئی سخت سرسام ہے دماغ کی جھلی میں ورم ہو گیا ہے۔ مناسب تدبیریں بتائیں، سر پر برف بندھوائی گئی، دوا پلائی گئی۔ نیند آنے کی دوا دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نواب کے دوست حالت خراب تھی جاہل عورتوں سے تیمارداری مشکل تھی اس لئے فوراً ہسپتال سے ایک ولایتی نرس کو بلا کے بیمار کو سپرد کیا۔

خورشید نے پھر انسانیت کی حال دریافت کرنے کے لئے ایک خدمتگار کو بھیجا۔ بیچاری پردہ دار کہ میاں پڑے ہیں، خورشید مرزا کو تو سرسام تھا مگر جعفری کو یہ دیوانی ہو گئی تھی

اختری پر رہ رہ کے غصہ آتا تھا۔ باپ کی بیماری کا الزام اختری کے سر تھوپا جاتا تھا اُسے حال معلوم نہ تھا۔ نادری دم بخود تھی۔ باپ کو گھڑی گھڑی جا کے دیکھ آتی تھی اور اپنے کمرے میں چپکی بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھی۔ جعفری کو سوائے بک بک جھک جھک رونا پیٹنا چلانا باپ کے کمرے میں گھسی جاتی ہے پھر چونکایا چاہتی ہے۔ نرس نے روکا تو اُس سے لڑنے لگی آخر اُس نے بہت ڈانٹا۔ چلے جانے کی دھمکی دی۔ صاف منہ پر کہدیا کہ اگر تم اپنی بیوقوفی سے علاج نہ کرنے دو گی تو یہ نواب مر جائے گا۔

جعفری۔ خدا نہ کرے ترے منہ میں خاک" وہ تو کہیئے ولایتی نرس اُردو زبان جانتی نہ تھی ورنہ بی جعفری کو بدزبانی کی سزا ملجاتی، وہ یہ سمجھی بیمار باپ کے لیے بڑی بیٹی دعا مانگتی ہے۔"

آخر ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی نوبت آئی، ڈاکٹر صاحب نے بہت سمجھایا کہ علاج ہونے دو تم لوگ علاج میں دخل نہ دو ورنہ افسوس ہو گا۔ آخر جعفری کو نوکروں چاکروں نے سمجھا بجھا کے خاموش کیا، قاعدہ سے علاج ہونے لگا۔ سچ ہے نادان کی دوستی جی کا زیاں، جعفری باپ کی عاشق تھی اُس نے جو کچھ کیا باپ کی محبت سے کیا اگرچہ جس بد اخلاقی سے اُس نے اختری کو نکالا تھا وہ کسی طرح قابل عفو نہ تھا مگر اختری بجائے خود نادم تھی اُس کو بھی خورشید مرزا سے محبت تھی۔ تیمارداری کا اس کو اچھا سلیقہ تھا اگر وہ گھر میں موجود ہوتی خورشید مرزا کے علاج اور تیمارداری میں بڑی مدد ملتی مگر اُس کا کوئی نام نہ لے سکتا تھا، اِدھر وہ خورشید مرزا کے دیکھنے کو تڑپتی تھی مگر دیکھنا کیسا کئی دن ہو گئے کسی نے حال تک نہ کہا۔ کہتا کون، بی جعفری سب پر حاکم تھیں۔ اُن کے مارے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔

خورشید مرزا کو چار دن کے بعد کسی قدر ہوش آیا، سرسام سے خدا نے نجات دی بخار بھی کم ہو گیا مگر انتہا کا ضعف تھا۔ ڈاکٹر کا حکم ہے سوا نرس کے کوئی بیمار کے پاس

نہ جانے پائے ایسا کوئی حال نہ کہا جائے جس سے دل و دماغ کو صدمہ پہنچے بلکہ کوئی
بات نہ کرے نہ اچھی نہ بُری سکون و آرام کی ضرورت ہے نہیں تو بیماری کے پلٹ جانے
کا خوف ہے۔ اگر اب بخار زیادہ ہوا فوراً سرسامی حالت پیدا ہو جائے گی اور اب کی
جانبری مشکل سے ہو گی۔ خورشید مرزا کے ایک قدیم دوست ڈاکٹر عنایت علی بیماری کا
حال سُن کے دیکھنے آئے اُنھوں نے دوا کے بنانے اور پلوانے کا اہتمام اپنے ذمہ
لے لیا۔ لڑکیوں کو پس پردہ بُلا کے بڑے ڈاکٹر کا حکم سمجھا دیا۔ اور اپنی رائے بھی
ظاہر کی دیکھو خدا کے واسطے کسی قسم کا شور و غل گھر میں نہ ہونے پائے۔

جعفری۔ یہ تو بڑی مشکل ہے کہ ہم اپنے باپ کو ایک ولایتی میم کے ہاتھوں میں
چھوڑ دیں خدا جانے اُن کو ضرورت ہو پیاسے ہوں بھوکے ہوں۔ دوسرے غیر مذہب
ایسے وقت میں کیسی بنے۔

ڈاکٹر عنایت علی۔ آپ اپنی محبت کو ذرا ضبط کیجئے خدا نہ کرے اُن کی وہ حالت
اب نہیں ہے جس سے ایسا خیال ہو جو آپنے ظاہر کیا ہے۔ میں بھی تو مسلمان ہوں پس
دوستی اور محبت عقل کے ساتھ ہونا چاہئے۔ جو کچھ بیمار کے حق میں حکیم کی رائے
ہے اُس کی تعمیل دوستی ہے۔

جعفری کے خیالات دُور و دراز تھے اُن کا منشا یہ تھا کہ اس حالت میں میرا
پاس رہنا ضروری ہے، دلی منشا غیر لوگوں کے سامنے زبان سے ادا نہ ہو سکتا تھا۔ وصیت
آخری میں دھیان لگا ہوا تھا۔ ایسا نہ ہو مجھے خبر نہ ہو بابا جان اس حالت میں کوئی
وصیت نامہ لکھدیں، اختری کے نام ثلث جائداد منتقل کر دیں تو زندگی میں بھی اختری
نے خوب لوٹ لوٹ کے کھایا اور مرنے کے بعد بھی تہائی کی حصہ دار بن کے بیٹھیں گی۔
یہ ہم نہیں کہتے کہ جعفری کو باپ کی محبت نہ تھی وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اس علالت کی
حالت میں وہ باپ کی خدمت کر کے ثواب حاصل کرے مگر اسی کے ساتھ ہی وصیت نامہ

اور ثلث جائداد کے نکل جانے کا اندیشہ لگا ہوا تھا، ڈاکٹر عنایت علی کے دفعتہً آجانے اور آپ ہی آپ تیمارداری کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لینے سے اُس کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ عنایت علی کو اختری نے بھیجا ہے۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا تھا کہ اختری کے علاج کے لئے ڈاکٹر عنایت علی کئی مرتبہ آئے تھے۔ جعفری اس وقت گھر کی حاکم تھی مگر اُس کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ باپ کے ایک قدیم دوست کو روک سکے۔

خورشید مرزا اب ہوش میں تھے لیکن اُن کو گھر کے حالات سے اطلاع نہ تھی اُن کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اختری اب اس گھر میں نہیں رہتی نواب کی طبیعت میں بدگمانی کا شائبہ نہ تھا وہ خود دل کے نیک تھے اور سب کو نیک سمجھتے تھے جب اُنکو مراد علی ایسے جعلیہ سے کبھی بدگمانی نہیں ہوئی یہاں تک کہ وہ نوٹ، اور صندوقچہ لیکے فرار ہوگیا۔ تو اپنی بیٹی جعفری کی نسبت کب یہ خیال ہو سکتا تھا کہ میرے بیہوش ہوتے ہی اُس نے اختری کو اس ذلت کے ساتھ گھر سے نکال دیا، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ جعفری اختری سے صاف نہیں ہے دلی رنجشیں ہیں لیکن یہ رنجشیں ایسی ہی ہیں جیسی چار دیواری میں رہنے والی نیک بخت عورتوں میں ہوا کرتی ہیں۔ آپس میں بول چال نہیں ہے ایک دوسرے کو دیکھ کے منہ پھیر لیتا ہے یا کہیں ایک کو بیٹھے کسی سے باتیں کرتے دیکھا وہاں دوسری نہ گئی یا اگر دوسری کسی کے پاس جا بیٹھی تو پہلی منہ بنا کے تیوری چڑھا کے اُٹھ گئی یا اگر ایک کو کسی سے زیادہ باتیں کرتے ملتے جُلتے دیکھا تو خود بات کرنا ملنا جُلنا چھوڑ دیا، یہ تو انتہا کا کمینہ پن تھا کہ ایک پردہ نشین دوسری پردہ نشین کو دن دہاڑے ہاتھ پکڑ کے سر بازار نکال دے کبھی خورشید مرزا کو جعفری سے ایسی بیہودگی کے واقع ہونے کا خیال نہ تھا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر رشک و حسد وہ بلا ہے کہ نوع انسانی کی پہلی ہی نسل میں ایک بھائی (قابیل) نے دوسرے بھائی (ہابیل) کو قتل کر دیا۔

خورشید مرزا بستر علالت پر پڑے ہوئے اس خیال میں ہیں کہ گھر کی حالت دہی ہے جو میری علالت کے پہلے تھی اچھا ہوا کہ خورشید مرزا کو اختری کے نکالے جانے کا حال اُس وقت معلوم ہوا جب وہ اس صدمہ کے برداشت کے قابل ہو گئے تھے۔ اس وقت خورشید مرزا کا بال بال اختری کا ممنون احسان تھا۔ جس گھر سے اختری اس ذلت سے نکال دی گئی تھی۔ وہ گھر اختری کے روپیہ سے نیلام سے چھڑایا گیا تھا وہ موضع جس سے غلہ آتا تھا جو اس گھر میں پکتا تھا۔ جس میں سے دو روٹیاں اختری بھی کھایا کرتی تھی۔ اور اب وہ دو روٹیاں بھی چھین لی گئی تھیں، اختری کا موضع تھا۔ ترکاری، آلو، گوبھی، مٹر کی پھلیاں جو باغ سے آکے اس گھر میں کھانے پکانے میں صرف ہوتی تھیں وہ اختری کا تھا غرضکہ جو کچھ مال دنیا اسباب خورد و نوش عیش و راحت اس گھر میں مہیا تھا وہ اختری کی بدولت تھا جس سے اختری اس بدخلقی کے ساتھ محروم کی گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ جعفری کو یہ حالات معلوم نہ تھے مگر اس کو یہ ضرور معلوم تھا کہ باپ کو اختری سے محبت ہے وہ باپ کی لے پالک سمجھی جاتی ہے۔ باپ کے عزیز کی یا پہلی منگیتر کی لڑکی ہے۔ اگر خدانخواستہ باپ کی آنکھ بند ہو جاتی جعفری کو لازم تھا کہ اختری کو اپنی بہن سمجھتی جعفری اختری کو نکال کے سخت اخلاقی گناہ کی مرتکب ہوئی اور اُس کی پاداش کی مستوجب تھی، وہ باپ کی بھی گناہگار تھی اور خدا کی بھی اس لئے کہ اخلاق خدائی قانون ہے۔ اس مستحکم قانون کی خلاف ورزی کر کے کوئی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اُس قادر مطلق نے اپنے ہر قانون کے ساتھ خواہ وہ جسمانی ہو خواہ روحانی، اُس کی خلاف ورزی کے عذاب کو لازم و ملزوم کر دیا ہے۔ مثلاً دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو چند ساعت آرام لینا بدنی قانون ہے اگر کوئی اس قانون کو توڑنا چاہے اول تو یہ انسان کے امکان سے خارج ہے سولی پر بھی نیند آجاتی ہے۔ اگر بمشکل جاگتا رہا کوئی کام نہ کر سکے گا نیند کا خمار اور کسلمندی موت

کا مزا چکھا دیگی۔

احسان فراموشی اخلاقی گناہ ہے۔ اگر اس کا مرتکب ہوگا۔ نظام معاشرت کے افراد کی نظروں میں ذلیل ہو جائے گا کہیں دست قدرت سے مجرم کو سزا ملتی ہے کبھی خلق خدا کے ذمّہ یہ ناگوار خدمت سپرد ہو جاتی ہے۔ چاہیئے کوئی مجرم صاف چھوٹ جائے کو را نکل جائے مجال کیا ہے۔ تھوڑی دیر تک انتقام سے جعفری کو لطف زیادہ بھی اس وقت جبکہ باپ بے ہوش بظاہر مردہ تھے۔ خود غیض وغضب سے تمام بدن لرز رہا تھا۔ ایک مظلوم پردہ نشین کو ہاتھ پکڑ کے دروازہ کے باہر کر دینے میں جو کچھ لذّت ملی ہے مگر یہ لذّت اُس لذّت کے برابر ہے جو واقعی مجرم جان کے بخشدینے میں ملتی ہے۔ یہ لذّت اختری کے نصیب میں تھی۔

خلیفہ مامون رشید کہا کرتا تھا کہ اگر مجرموں کو معلوم ہو کہ مجھکو عفو میں کیا لذت ملتی ہے اور مجھے اس لذت کی کس قدر حرص ہے تو عجب نہیں ارتکاب جرائم کی جرأتیں بہت بڑھ جائیں۔

# باب ۲۲

جب یہ واقعات، بوٹن کے واقعہ کے بعد، ہرمزی نے دوسرے دن شرفو کے مکان پر جو اس مکان کے پچھواڑے تھا آدمی بھیجکر رحیم بخش کو بلوانا چاہا۔ مکان میں قفل پڑا تھا، رحیم بخش کو معلوم تھا کہ اُس کی اور شرفو کی ضرور تلاش ہوگی۔ اس لئے یہ دونوں روپوش ہوگئے۔ مراد علی کی فراری جس کے بعض حالات خود ہرمزی کی نظر سے گذرے تھے مگر اُس کو گمان غالب تھا کہ نواب مرزا اُس کے تعاقب میں گئے ہیں، خورشید مرزا کی سخت علالت اور اُسی سلسلہ میں اختری کا نکالا جانا یہ سب واقعات ایسے نہ تھے کہ خاموشی اختیار کی جاتی، اور حتی الامکان کوشش نہ کی جاتی۔ ہرمزی نے حکیم جعفر علی کو آگرے کے ایک ہوٹل کے پتہ سے جس کا نام اس کو کسی طرح یاد تھا تار دے دیا تھا اُس کو خیال تھا کہ یہ تار عجب نہیں حکیم صاحب کو مل جائے، واپسی کے وقت یہ تار گوالیر میں حکیم صاحب کو ملا۔ مضمون یہ تھا "لکھنؤ میں آپ کی سخت ضرورت ہے"۔ حکیم صاحب نے واپسی میں بڑی جلدی کی آخر ہفتہ کے دن سرِشام حکیم صاحب لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ رات کی رات گھر میں آرام کیا نمازِ صبح کے بعد خورشید مرزا کے مکان پر گئے۔

حکیم صاحب کو ہرمزی کے تار سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ کوئی جدید واقعہ لکھنؤ میں ہوا ہے۔ خورشید مرزا کے مکان پر نوکروں چاکروں کو مراد علی کے فرار ہو جانے کی اطلاع ہو گئی تھی، یہ لوگ نواب صاحب کی علالت میں اختری کے نکالے جانے اور

جعفری بیگم کے حاکم بن کے بیٹھنے سے سخت ناخوش تھے۔ وہ جعفری کی طرح بیوقوف نہ تھے۔ اختری کی دولت مندی اور نواب صاحب کا اُس کے روپیہ سے مدد لینا اگرچہ تفصیل کے ساتھ نہ جانتے تھے مگر کچھ نہ کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ جعفری کی آنکھوں پر حسد نے پردے ڈال دیئے تھے وہ اس گھر میں اپنے سے زیادہ حکومت کا مستحق کسی کو سمجھتی ہی نہ تھی۔ اختری کے ساتھ جو اُس نے سلوک کیا تھا اُس کا سب کو رنج تھا، اُنکی آنکھیں کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھ رہی تھیں جو بڑی صاحبزادی پر دباؤ ڈالے۔ جب اختری بیگم کو کھڑے کھڑے نکال دیا جن کو نواب صاحب لڑکیوں سے زیادہ چاہتے تھے تو ہم کو نکال دینے کتنی دیر لگتی ہے۔ حکیم صاحب کیا آئے گویا سب کی مُراد آئی۔ سب سے زیادہ نادری کو خوشی ہوئی۔ جو جعفری بیگم سے اس معاملہ میں جلی ہوئی تھی مگر کچھ نہ کر سکتی تھی۔ حکیم صاحب اُس کے منگیتر تھے، نکاح ہونے ہی والا تھا، حکیم صاحب کے آنے سے نادری کا پلہ بھاری ہو گیا۔ حکیم صاحب کے آنے کی اطلاع مدار بخش نے دروازہ پر پُکار کے دی۔ حکیم صاحب آتے ہیں! اس آواز کو سنتے ہی نادری سات پردوں میں جا کے چھُپ گئی۔ جعفری کے منہ پر ہوائیاں چھٹنے لگیں، خوب جانتی تھی کہ حکیم صاحب اختری کے طرفدار ہیں وہ ضرور دریافت کریں گے کہ اختری کو کس نے نکالا؟ کیوں نکالا؟

حکیم صاحب انگنائی میں قدم دھرتے ہی دریافت کیا، کیا اختری بیگم جاگتی ہیں (رحیمن سامنے کھڑی تھی)، فوراً ہمارے آنے کی اطلاع کرو اگر سوتی ہوں تو جگادو رحیمن حکیم صاحب کا یہ حکم سُن کے پہلے تو سکوت کے عالم میں تھوڑی دیر کھڑی رہی۔ حکیم صاحب کے دوبارہ تاکید کرنے کے بعد۔ رحیمن وہ اس گھر میں جی جم ہیں۔

حکیم صاحب۔ (ذرا سخت آواز سے)، کیا اختری بیگم اس گھر میں نہیں ہیں تو کہاں گئیں؟

رحیمن۔ کیا کہا جائے ہم لوگ تابعدار ہیں۔ اتنا کہہ کے چپ ہو رہی۔ اگرچہ

اختری کا نکالا جانا سب کے خلاف تھا۔ خصوصاً رحیمن پر اختری بہت مہربان تھیں۔ چپکے چپکے بہت کچھ یاد کرتی تھیں۔ یہ سب سہی، مگر جعفری بیگم کی شکایت کرے یہ اُس کی مجال نہ تھی۔

حکیم صاحب۔ تو صاف کہو آخر کیا ہوا۔

رحیمن۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ نواب صاحب کی بیماری میں بڑی صاحبزادی سے لڑائی ہوئی۔

حکیم صاحب۔ پھر؟ اختری بیگم خود کہیں چلی گئیں۔ اپنی خوشی سے، اور نواب صاحب نے نہیں روکا۔

رحیمن۔ نواب صاحب کے فرشتوں کو خبر نہیں، اُن کے دشمن بیہوش پڑے تھے۔

حکیم صاحب اور اس حالت میں نواب صاحب کو چھوڑ کے اختری چلی گئیں یہ مجھے نہیں یقین آ سکتا۔

رحیمن۔ (اب مجبور ہو کے کہنا ہی پڑا، نوکری رہے یا جائے ایمان کی بات کیوں چھپائیں) وہ کیا آپ سے گئیں۔

حکیم صاحب۔ تو صاف کہو جعفری بیگم صاحبہ نے نکال دیا۔

رحیمن نے سکوت کیا۔ حکیم صاحب کو معلوم ہو گیا کہ یہی واقعہ ہے۔

حکیم صاحب۔ جعفری بیگم صاحبہ کو ہرگز لازم نہ تھا کہ نواب صاحب علالت میں اختری بیگم کو گھر سے جانے دیں۔

رحیمن۔ تو کیا وہ بیچاری آپ سے گئیں، رحیمن نے چپکے چپکے کل واقعہ حکیم صاحب سے کہدیا۔

حکیم صاحب۔ اس ظلم کے ساتھ دشمن کو بھی گھر سے نہیں نکالتے، نواب صاحب کہاں ہیں۔

اس اثنا میں جعفری بیگم بھی پردہ کے قریب آگئیں، یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ حکیم صاحب کو واقعات معلوم ہو گئے۔ جعفری نے دل میں کہا یہی وقت ہے اب اپنی حکومت اس گھر میں قائم رکھنا ہے تو اس وقت اُس کے اظہار کا اچھا موقعہ ہے جعفری بیگم گویا پورے سامان سے مورچہ بندی کے لئے تیار ہو گئیں۔

جعفری بیگم۔ ہم اپنے حاکم ہیں، اپنے گھر کے مالک ہیں، ہم نے نکالا۔ ہمارے باپ کا ہزاروں روپیہ برباد کیا۔ بھیک مانگنے کی نوبت آگئی۔ روپیہ ایک طرف دشمنوں کی جان کے لالے پڑ گئے، نکالتے نہ تو کیا کرتے۔

حکیم صاحب آپ نے بہت بُرا کیا۔ آپ کہتی ہیں کہ آپ کے والد محتاج ہو گئے بے شک یہی ہوتا، بلکہ اس سے بدتر۔ اختری کی بدولت برسوں سے آپ روٹیاں کھا رہی ہیں۔ گاؤں باغ مکان سب اختری کے روپیہ سے از سرِ نو خریدا گیا ہے نوکر چاکر ماما ئیں سب اختری کے روپیہ سے تنخواہ پاتی ہیں۔

جعفری۔ (بات کاٹ کے) یہ سب جھوٹ!

حکیم صاحب (کو سخت غصہ آیا مگر رشتہ کا خیال کر کے ضبط کیا) میں ایسے الفاظ کے سُننے کے لئے آمادہ نہیں ہوں، جھوٹ سچ کا حال آپ کو خود نواب صاحب سے معلوم ہو گا۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا گھر بھر خود نواب صاحب بھی اختری کے احسانمند ہیں۔ یہ اُس کی شرافت ہے کہ اس ذلت کے ساتھ گھر سے نکالے جانے پر بھی ایک لفظ اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ یہ آپ کا ظرف تھا کہ آپ نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جو اپنا دستِ نگر ہو۔ اُس کے ساتھ بھی زیبا نہیں نہ کہ خود جس کا دستِ نگر اور سرتا سر رہونِ منت ہو۔

جعفری۔ اپنی ڈھٹائی سے جھوٹ جھوٹ کہا کی۔ اب حکیم صاحب نے اُسکی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ جعفری کا جھوٹ جھوٹ محض بے غیرتی سے تھا۔ اُس کا

دل فوراً مان گیا۔ حکیم صاحب نوکروں کی طرف متوجہ تھے روئے سخن گویا اپنے منسوبہ کی طرف تھا۔ نوکر جا کر حکیم صاحب کی بات کو کسی طرح جھوٹ نہ سمجھے تھے جو جو حکیم صاحب کی بات کو سُن رہا تھا اوسکو یقین آتا جاتا تھا۔ اس واقعہ کے بیان ہوتے ہی نوکر مامائیں اصیلیں آج سے اپنے کو اختری کا نوکر سمجھنے لگیں۔

حکیم صاحب۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گھر کو ایسی نیک صاحبزادی رئیس زادی سے پالا پڑا ہے جس کی فیاضی کے آگے قارون کے خزانہ کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے اگر کوئی اور ہو اور ابھی حساب فہمی کی طرف متوجہ ہو جائے اور دنیا کو سچ اور صحیح حالات کا پتہ چل جائے تو شاید منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ مگر اختری کی ریاست میں کوئی شبہ نہیں شاید اُس کی ہمت زبانی شکر گذاری کی بھی پروا نہ کرے۔

جعفری بیگم اب بھی جھوٹ جھوٹ کہے جاتی ہے بس اُس کو یہی ایک لفظ یاد ہے اور اس کی رٹ لگا دی ہے۔

حکیم صاحب میں نے بہت برداشت کی۔ میں ہرگز اپنی نسبت اس لفظ کا سُننا پسند نہیں کرتا، بہتر ہے کہ آپ سکوت کریں۔ کسی کے جھوٹ کہہ دینے سے کوئی سچا جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین لائیں یا نہ لائیں آپکو اپنا اختیار ہے۔ مگر مجھکو یقین ہے کہ یہی زبان جس سے آپ جھوٹ جھوٹ کہہ رہی ہیں اسی زبان سے آپکو سچ سچ کہنا پڑے گا۔ اور اگر اس لفظ کے زبان پر نہ لانے کی آپ قسم کھالیں گی تو آپ کا دل خود آپ کو جھوٹا بنا دے گا۔ اب میں نواب صاحب کے پاس جاتا ہوں۔

رحیمن۔ ڈاکٹر کی مناہی ہے۔ کوئی نہیں جانے پاتا اور میم صاحب بھی منع کرتی ہیں۔

حکیم صاحب۔ تو کیا ولایتی نرس تیمارداری پر مقرر ہے یہ بہت خوب ہوا۔

رحیمن۔ حکیموں کے جلانے کی منا ہی نہیں ہے۔
اس کے بعد حکیم صاحب بیمار کے کمرے کے پاس گئے نرس سے اخلاقاً اجازت لی، نرس حکیم صاحب کے پیشہ طبابت کے لحاظ سے بالکل معترض نہ ہوئی، بلکہ یہ کہا۔
اب نواب صاحب اچھا ہے۔ زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ہے۔
حکیم صاحب۔ مسکرا کے میں خود بھی دیکھ سکوں گا۔
نرس۔ معافی مانگ کے خود علیحدہ ہو گئی۔
نواب خورشید مرزا اور حکیم جعفر علی کی دو دو باتیں:۔
حکیم جعفر علی جب خورشید مرزا کے کمرے میں داخل ہوئے تو جعفری پیچھے پیچھے چلی گئی، سنوں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ نرس یہ سمجھی تھی کہ یہ حکیم ہیں بیمار کو دیکھ کے شاید کچھ حالات مریض کے متعلق دریافت کریں، مجھکو کچھ ہدایتیں کریں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں بیمار کے پاس حاضر رہوں، جب تک مرض کے باب میں گفتگو ہوا کی، نرس حاضر رہی جب اس کو معلوم ہوا کہ اب پرائیویٹ یعنی نج کی باتیں ہیں فوراً کمرے کے باہر چلی گئی۔ یہاں اس نے جعفری بیگم کو بیٹھے دیکھا اور سمجھ لیا کہ یہ استراق سماعت یعنی کسی کی راز کی باتیں چھپ کے سننے کے لئے بیٹھی ہیں اس نے ناک بھوں چڑھائی سخت نفرت کی نظر سے جعفری کو دیکھا مگر جعفری ایسی اخلاقی باریکیاں کب سمجھتی تھیں۔
خورشید مرزا ایک ڈھیلا کرتا پہنے سر سے ناخن پا تک چادر اوڑھے آرام کرسی پر بیٹھے ہیں، حکیم صاحب کو دیکھتے ہی اولاً تعظیم کے لئے اٹھنے کا قصد کیا۔ حکیم صاحب نے اپنے سر کی قسم دے کے اٹھنے سے روکا خود ایک کرسی پہ جو سامنے رکھی تھی جلدی سے بیٹھ گئے۔

خورشید مرزا۔ حکیم صاحب آج مہینوں کے بعد آپ کو دیکھا۔ خدا جانے آپ کہاں تشریف لے گئے تھے۔ مجھ پہ عجیب حادثے گذر گئے، آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔

حکیم صاحب۔ ہاں بعض حالات مجھکو معلوم ہوئے ابھی تک اپنا تعلق اختری کے معاملات سے ظاہر نہیں کیا، مگر آپ تو بہت نقیح ہو گئے ہیں۔ نبض دیکھوں۔

خورشید مرزا۔ نبض دکھا کے، آپ بہت اچھا دیکھتے ہیں عمر دوبارہ ہوئی۔

حکیم صاحب مگر اب ماشاءاللہ نبض میں حرارت مطلق نہیں ہے۔ ضعف بے حد ہے۔ مقویات کے استعمال سے بہت جلد طاقت عود کر آئے گی، اگرچہ مجھ کو افسوس ہے کہ میں ضرورت کے وقت کیوں نہ موجود ہوا۔ مگر میں بھی آپ ہی کے کام سے گیا تھا اور خدا کے فضل سے پوری کامیابی ہوئی۔ یہ چچا کا واقعہ بالکل بے اصل ثابت ہوا۔

خورشید مرزا۔ الحمدللہ، مگر وہ مردود فرار ہو گیا۔ جواہرات کا صندوقچہ نوٹ بک چک سب غائب ہے۔

حکیم صاحب۔ خیر اُس کا تعاقب ہو رہا ہے کہاں جائے گا۔ آپ خاطر جمع رکھئے۔ اس کے بعد نواب مرزا صاحب کی صفت بیان کی، اپنی کل کارگذاری کو بھی نواب مرزا کی ذات سے منسوب کیا۔ یہ وہی بات ہے اختری بیگم کی خوش قسمتی سے، مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ سے کیا ہونا تھا کس قدر صاحب ہمت جواں مرد ہے۔

خورشید مرزا۔ ہاں ایسے بھی خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں، ایک ہم ہیں کہ ہم نے اپنی حماقتوں سے سب مٹا کے رکھدیا۔

حکیم صاحب۔ یہ آپ ہی کی نیک نیتی کا نتیجہ ہے کہ بغیر آپ کی درخواست کے ایسا کارگذار شخص آپ کا کام کر رہا ہے جسکی آپ کو خبر بھی نہیں۔

خورشید مرزا۔ یہ سب آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور آپ نے کب مجھ سے کہہ کے کام کیا، خدا نے آپ کے دل میں نیکی ڈال دی، ورنہ کون کس کے لئے محنت گوارا کرتا ہے۔ آپ کا یہ سفر کچھ کم تھا۔

حکیم صاحب - اختری کو پہلے ہی مرزا علی سے عقبن کا اندیشہ تھا آپ بوجہ اپنی جبلی اخلاق کے اُس سے بدگمان نہ ہوئے ورنہ وہ کسی وقت اور کسی حالت میں قابل اعتماد نہ تھا - اختری کو بہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ آپ کو فریب دے رہا ہے مگر اُس نے آپ کے لحاظ سے آپ سے کچھ نہیں کہا لیکن نواب مرزا کو اور مجھ کو اس کام پر متعین کیا۔

خورشید مرزا - کیا کہوں میں اختری سے کس قدر شرمندہ ہوں آنکھ چار کرنے کو جی نہیں چاہتا، کاش میں پہلے ہی سے آپ کو ہر کام میں شریک رکھتا - مگر خیر اب تو جو ہونا وہ ہوا - تلافیٔ مافات امکان سے خارج ہے۔

حکیم صاحب - (دل میں) شرمندگی بیجا نہیں ہے اُس غریب کو اپنے بھولے پن سے جس کو حماقت بھی کہتے ہیں ڈبو ہی دیا ہوتا، تلافیٔ مافات بے شک امکان سے خارج ہے۔

خورشید مرزا - اگر اختری کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہو تو یہ میری سزا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علالت کے زمانے میں وہ میرے قریب تک نہیں آئی - مزاج پرسی تک نہیں کی۔ واقعی میں اسی قابل ہوں۔

حکیم صاحب - کیا واقعی آپ کو اختری کی نسبت ایسی بدگمانی ہے کہ وہ اس مکان میں ہوتی اور آپ کے دیکھنے کو نہ آتی۔

خورشید مرزا - "یہ آپ نے کیا کہا، اس مکان میں ہوتی" اس کے بعد بڑی حیرت سے باآواز بلند - تو کیا اختری اس مکان میں نہیں ہے؟ کہاں گئی؟ کیا ہوا؟

حکیم صاحب - وہ جہاں کہیں ہے محفوظ ہے خاطر جمع رکھیے۔

خورشید مرزا - مگر میری سمجھ میں نہیں آتا - پھر تھوڑی دیر سکوت کر کے دل میں کچھ سمجھ کے، اختری نے میری ولایت سے خوب فائدہ اٹھایا - ہاں میری ناعاقبت اندیشی کا یہی انجام ہونا تھا۔

حکیم صاحب - وہ جو کچھ ہوا ہو مگر یہ باور کیجئے کہ اختریؔ اس مکان سے بالکل بے بس اور مجبور ہو کے گئی، اس لئے کہ جسدن آپ علیل ہوئے تھے، جعفریؔ بیگم صاحبہ کی مصلحت اس کی مقتضی ہوئی کہ وہ اختریؔ کو آپ کے مکان سے نکال دیں اور وہ جائے امن کے تلاش پر مجبور ہو - اَب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اختریؔ کا کیا بس تھا - یہاں تک سُنا گیا ہے کہ اتنی دیر مہلت نہ دی کہ ڈولی منگالے۔

خورشید مرزا - یہ آپ کیا فرماتے ہیں یعنی ایک پردہ نشین کم سن لڑکی دن دہاڑے سر بازار نکال دی گئی۔

حکیم صاحب - قابل حیرت ہے مگر بعینہٖ یہی ہوا جو میں عرض کرتا ہوں۔

خورشید مرزا - غصّہ کے مارے کانپ رہے تھے - یہ جعفریؔ کی کارستانی ہی نادری نے بھی کوئی مدد نہ کی مجھے نادریؔ سے تعجب ہے۔

حکیم صاحب - (اپنی منسوبہ نام شرم سے باپ کے سامنے نہ لے سکے) جعفریؔ بیگم صاحب بزرگ خاندان بن کے پوری قابض ہو گئی تھیں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

خورشید مرزا - یہ جبر یہ ظلم - حکیم صاحب یاد رکھئے میں زندگی بھر جعفریؔ سے صاف نہ ہونگا - اس نے مجھکو روحانی صدمہ پہنچایا - اچھا اَب یہ بھی بتائیے کہ وہ غریب اس بے سرو سامانی سے آخر گئی کہاں؟

حکیم صاحب - سُنا گیا ہے کہ باہر نوکروں کا منہ بند کرا کے، سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کے زینب بیگم کے مکان پر چلی گئی - اور اب تک وہیں ہے۔

خورشید مرزا - یہ بھی غنیمت ہوا - اتفاق سے زینب بیگم کا مکان قریب تھا ورنہ خدا جانے کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی - حکیم صاحب انصافاً کہئے ان کم بختوں کو معلوم ہے کہ میں اختریؔ کو مثل بیٹیوں کے سمجھتا ہوں اگر کسی نیک بخت سے عقد کر لوں جیسا کہ

اکثر احباب نے مجھ کو مشورہ دیا اور میری آنکھ بند ہو جائے تو یہ لڑکیاں کھڑے کھڑے اس کو نکال دیں، واہ کیا شہر کے لوگ کہیں گے خورشید مرزا کی منکوحہ بازار میں بھیک مانگتی پھرتی ہے۔

حکیم صاحب۔ آثار تو ایسے ہی ہیں، مجھکو اختری کی بے عزتی کا اتنا ہی صدمہ ہے جس طرح اپنی حقیقی بہن کی ذلت سے ہوتا۔

خورشید مرزا۔ ہر شریف کو ایسا ہی خیال چاہیے، مگر ان کم بختوں کی غیرت کو کیا ہوا۔

حکیم صاحب۔ زینب بیگم کا مکان بہت ہی مختصر ہے مگر جہاں تک اُن غریبوں سے ہو سکا اُنھوں نے اختری کو تکلیف نہیں ہونے دی۔

خورشید مرزا۔ اُن کی شرافت اور نیک بختی میں کوئی شک نہیں ہے مگر وہ مکان بہت ہی تنگ و تاریک ہے۔ وائے قسمت نواب خورشید بیگم کی اکلوتی نازوں کی پلی لڑکی کی سکونت کے لیے ایسا مکان، اور ہم اس محل میں آرام سے بیٹھے ہوں جو اُسی کے روپیہ سے خریدا گیا ہے۔

جعفری بیگم چپکی بیٹھی سُن رہی ہیں اور شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُتار رہی ہیں۔ اب تو شاید جعفری بیگم صاحبہ کو جھوٹ کہنے کی جراءت نہ ہو جب اپنے باواجان کی زبان سے اختری کی مقدرت کا حال سُن لیا۔ اب اگر جرأت ہو تو اپنے باپ کو جھوٹا بنائیں یہ بھی ان کی سعادت مندی سے بعید نہیں، حسد ایسی ہی بُری بلا ہے۔

خورشید مرزا بہت برہم تھے۔ کئی مرتبہ سخت الفاظ جعفری کے باب میں زبان پر لائے جو کبھی خورشید مرزا ایسے نرد بار نیک طینت آدمی کی زبان سے کبھی کسی نے نہیں سُنے تھے۔ تھوڑی دیر تک یہی حالت غیظ و غضب کی طاری رہی پھر حکیم صاحب سے مخاطب ہو کے، حکیم صاحب مجھے ایکدم سکے لئے اختری کا اس مکان سے علٰحدہ رہنا

گوارا نہیں ہے۔ آپ فوراً سوار کرلائیے۔ میں خود اس سے معذرت کروں گا۔

حکیم صاحب۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں ابھی جاتا ہوں مگر۔۔۔۔۔۔

خورشید مرزا۔ مگر اس گھر میں واپس لانے کی رائے نہیں ہے۔

حکیم صاحب۔ جی ہاں میری عقل ناقص میں تو یہی آتا ہے کہ اس باب میں اختری کی خوشی کو مقدم رکھا جائے اس کے بعد مراد علی کے مقدمہ میں جو آپ کی ہدایت ہو اُس پر عمل کیا جائے گا۔

خورشید مرزا۔ مجھے اپنی رائے پر اب کچھ اعتماد نہیں رہا اب آپ اپنی رائے سے کام کیجئے۔ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو لیجئے۔ میرا اختری کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اُس سے معذرت ضرور ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔

حکیم صاحب۔ مناسب ہے میں اختری کے پاس جاتا ہوں۔ اجازت ہے۔

خورشید مرزا۔ بہتر ہے۔

جعفری نے جو سُنا کہ حکیم صاحب آتے ہیں فوراً جلد جلد قدم بڑھا کے اپنے کمرے میں آبیٹھی۔ حکیم صاحب کو بھی پاؤں کی آہٹ سے معلوم ہو گیا کہ خورشید مرزا کی اور میری باتیں کوئی کان لگائے سُن رہا تھا مگر حکیم صاحب نے اب جعفری سے ہمکلام ہونا مناسب نہ جانا۔ حکیم صاحب سیدھے زینب بیگم کے مکان پر گئے۔

یہ ہم ناظرین سے کہنا بھول گئے تھے کہ حکیم صاحب کو جب اختری کا اس مکان میں آنا معلوم ہوا تھا تو خورشید مرزا صاحب سے ملنے کے پہلے وہ یہاں ہو کے گئے تھے۔ اب دوسری مرتبہ خورشید مرزا کا پیام لے کے جاتے ہیں۔ اختری کو اس وقت خورشید مرزا کی حالت معلوم ہوئی۔ مزاج کے رو بصحت ہونے سے بہت اطمینان ہوا یہاں بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ رحیم بخش، شرفو، بوٹن۔ یہ سب کے حالات بیان

کرئے گئے اگرچہ ہرمزی کا ریل پر جانا چھپایا گیا۔ مگر حکیم صاحب کچھ سمجھ گئے مگر خود حکیم صاحب نے بھی اس واقعہ کے صاف صاف بیان ہونے پر زور نہیں دیا۔ اس لئے کہ اس میں ہرمزی اور زینب بیگم کی کسی قدر سُبکی ہوتی تھی۔ ختم کلام اس طرح ہوا کہ مراد علی اور بوٹن کو گاڑی میں بیٹھے دیکھنے والے نے بچشم خود دیکھا کہ نواب مرزا گاڑی کے پاس سے ہٹا دیے گئے مگر وہ گارڈ کے پیچھے پیچھے چلے گئے تھے۔ پھر پلٹ کے نہیں آئے۔ غالباً ساتھ ہی گئے۔ حکیم صاحب نے بھی کہا یقیناً ساتھ گئے۔ مگر وہ عجب نہیں بمبئی یا کراچی میں ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہاں ہیں، میں فوراً روانہ ہونے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ مجھے اب کراچی جانا چاہیے یا بمبئی۔ نواب مرزا نے اپنے گھر پر اطلاع دی ہوگی اب رات کے نو بجے ہیں کل انشاءاللہ جاؤں گا۔ اس کے بعد اختری کے جانے کے باب میں مشورہ ہوا۔ خورشید مرزا بے چین ہیں۔

اختری۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اس میں ماموں جان کا کیا قصور ہے اور میں تو کہتی ہوں کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ جعفری بیگم اپنے خیال کے موافق اپنے باپ کی خیر خواہی کی، کیا برائی کی۔

زینت بیگم۔ خاک خیر خواہی کی۔ ہم نے مانا خیر خواہی کی مگر اس طرح گھر سے مجبور کر کے نکال لینے کو کیا کہا جائے۔

حکیم صاحب۔ درست ہے اور یہ بھی خیال فرمائیے کہ باپ نے جسکو پرورش کیا ہو اپنے گھر میں لا کے رکھا ہو اُس کو نکالنا باپ کو بے وقوف سمجھنا اپنی عقل پر بھروسا کر لینا اس قصور کو تو کوئی بھی عقلاً اور انصافاً معاف نہیں کر سکتا کہ ایک پردہ نشین لڑکی کو دن دھاڑے سر بازار نکال دیا جائے یہ بہت بڑا کیا۔

اختری۔ میں کل ماموں جان کو دیکھنے جاؤں گی، رات کے وقت بیمار کو نہیں پوچھتے نہیں تو ابھی جاتی، میرا جی خود اُن کے دیکھنے کو تڑپ رہا ہے۔

حکیم صاحب۔ شرعاً تو یہ کوئی بات نہیں ہے کہ بیمار کی عیادت کے لئے رات کو نہ جانا چاہیئے مگر خیر بہتر ہے کل جائے گا۔

اختری۔ جعفری بیگم کے خلاف ہوگا۔

حکیم صاحب۔ جب تک خورشید مرزا بے ہوش رہے جعفری حاکم وقت تھیں اب اُن کی دوپہر کی سلطنت کو زوال آگیا۔ اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔ حکیم صاحب رخصت ہوگئے۔

# باب ۲۳

نواب مرزا گارڈ سے اجازت لے کر پچھلی گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔ اُناؤ کے دوسرے اسٹیشن پر پہنچ کے اُنھوں نے بمبئی کا ٹکٹ لیا، دوسری گارڈی گاڑی میں جا کے چور کی گرفتاری کے نیچے چلے گئے تھے مگر خود چوپ بنے ہوئے تھے، اس لیے کہ ان کو خوف تھا کہ مراد علی نے جھلکی دیکھ لی تو راستہ سے اُتر جائے گا پھر پتہ ملنا دشوار ہو گا۔ اس لیے گاڑی سے ایک دم کے لیے نہ اُترتے تھے۔ تھرڈ گیرج تھی لیکن گاڑی بدلنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ کسی قسم کا سامان سفر ساتھ نہ تھا نہ بستر نہ لوٹا نہ حقہ مگر روپیہ پاس تھا۔ راستہ میں کہیں کسی مسافر سے کہیں ریل کے قلی سے کچھ کھانے کو منگا لیا بھشتی کے تام لوٹ سے پانی پی لیا۔ کسی کے لوٹہ سے پانی پی لیا۔ ایک مسافر کے پاس ایک دری زائد تھی اُس سے منت کر کے دری خرید لی۔ غرضکہ سفر کے تمام ہوتے ہوتے جو سامان بہت ضروری تھا مہیا کر لیا۔

گاڑی کی روانگی کے بعد مراد علی کے جان میں جان آئی۔ اب یہ سنبھل کے بیٹھا بوٹن کو تسلی دیتا جاتا ہے۔ بہلاتا جاتا ہے روپیہ بہت سا پاس تھا۔ گاڑی رزرو تھی راستہ میں جو سودے والا ملا وہ بلا لیا گیا۔ ترکاری میوہ کھلونے کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بوٹن کی خاطرداری کے لیے خرید نہ کی ہو۔ نواب مرزا یہ سب کرشمے دیکھ رہے تھے کئی مرتبہ مراد علی نواب مرزا کی گاڑی کے پاس نکلا، اُن کی نگاہیں اُسی طرف لگی رہتی تھیں جب اُس کو آتے دیکھا کسی مسافر کی آڑ میں ہو گئے۔ ان کے ہمراہی مسافروں

ہیں ایک بمبئی کے سیٹھ تھے۔ اُن سے بہت خلا ملا بڑھالیا جس مطلب کے لیے جاتے تھے وہ مطلب بھی بیان کر دیا۔ کیوں کہ یہاں رازداری کا کوئی محل نہ تھا۔ سیٹھ موسیٰ بھائی کو حور کی صورت بھی دکھا دی، سیٹھ جی نے اپنے مکان کا پتہ دیا اپنے مکان پر ٹھہرنے کو کہا انھوں نے معذرت کی کہ میں تو اس مردود کے ساتھ ساتھ ہوں جہاں یہ ٹھہرے گا وہیں میں بھی ٹھہروں گا۔ ہاں ضرورت کے وقت آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔ موسیٰ بھائی نے ہر طرح مدد دینے کا وعدہ کیا، تیسرے دن گاڑی قریب شام بمبئی پہنچی۔

مرادعلی گاڑی سے اُترا بوٹن کو اُتارا اسباب قلیوں نے اُتارا، اب قلیوں سے دریافت کر رہے ہیں، یہاں قریب کوئی ہوٹل ہے۔ یہ قلیوں سے باتیں کر رہے تھے اور نواب مرزا دو قدم کے فاصلہ پر مسافروں کی آڑ میں جھکے کھڑے ہیں، اس طرح کہ جب چاہیں اُس کا ہاتھ پکڑ لیں۔

مرادعلی نے راستہ میں دریافت کر لیا تھا کہ ایک جہاز دوسرے تیسرے چھوٹا کرتا ہے۔ چاہتا تھا کہ فوراً اُسی جہاز کا ٹکٹ لے کے کراچی روانہ ہو جائے پھر وہاں سے بغداد یا عدن جس طرف کا جانے والا جہاز ہوگا سوار ہو جائیں گے۔

نواب مرزا قریب ہی کھڑے ہیں مگر اب بھی پس و پیش کرتے ہیں۔ بوٹن کو ساتھ دیکھ کے خیال آیا کہ یہ بدمعاش اس غریب نوجوان عورت کو کہاں سے بھگا لایا ہے اس کم بخت کی زندگی خراب کی۔ کیا کیا اُمیدیں دلا کے لایا ہوگا، اب تھوڑی دیر میں اس کی تمام آرزوئیں خاک میں ملجائیں گی۔ اُن کو خیال یہ ہوا کہ اب بھی اگر با آشتی دوستی کام نکل سکے تو اس عورت کی خاطر سے اس کو جیل خانہ سے بچا دینا چاہیے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر اس کے سامنے اس کو گرفتار کروں گا رونا پیٹنا شروع کرے گی۔ جہاں تک ممکن ہو مرادعلی سے پہلے علیحدہ گفتگو کر کے معاملہ کو ختم کر لینا چاہیے۔

تاکہ مکروہ صورت نہ پیش آئے، بوٹن کی صورت بھی اُنھوں نے دیکھ لی تھی فوراً ہی اپنی لڑکی کا خیال آیا دل نے کہا یہ بھی کسی شریف کی لڑکی معلوم ہوتی ہے خدا جانے کس طرح اس موذی کے چنگل میں پھنس گئی ہے خیر اب جو ہوا ہوا اب بھی اس بدنصیب کا پردہ ڈھکا رہے تو بہتر ہے اس کی گرفتاری کے بعد اس عورت کے بارے میں تحقیقات ہوگی، باپ کو خبر کی جائے گی ناحق ایک شریف کی رُسوائی ہوگی۔ میں تو کوشش کرونگا آگے اس کی تقدیر، اگر آشتی و نرمی سے کام نہ نکلے گا پھر مجبوراً سختی کرنا ہی پڑے گی۔ نواب مرزا اس کشمکش و پیچ میں کھڑے تھے، آخر مرآد علی اُسی ہوٹل کی طرف روانہ ہوا جس کا قلی نے پتہ دیا تھا۔ بوٹن اور یہ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے اسباب رکھا گیا اسی عرصہ میں نواب مرزا نے دوسری گاڑی پر بیٹھ کے اسی کے پیچھے اپنی گاڑی کو لگایا مرآد علی نے اس ہوٹل کے ایک کمرہ میں دوسری منزل پر بوٹن کو اُتارا اور خود جہاز کی فکر میں چلنے کا قصد کیا، بوٹن نے کہا دیر نہ لگانا میں اکیلی ڈرتی ہوں،

مرآد علی ۔ اس طرح گھبراؤ گی تو کاہے کو کام چلے گا۔

بوٹن ۔ اچھا جاؤ میں بیٹھی ہوں۔

مرآد علی کمرہ کا دروازہ بند کر کے زینہ سے اُتر رہا تھا آدھی سیڑھیوں تک پہنچا تھا کہ نواب مرزا سے سامنا ہوا یہ اوپر چڑھ رہے تھے، نواب مرزا کا سامنا کیا ملک الموت کا سامنا تھا۔ مرآد علی کی تمام کوشش بیکار ہوئی اس ناامیدی کے عالم میں وہ نواب مرزا سے لپٹ پڑا، ظالم کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا، اچھا تو میں بھی تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ یہ کہہ کے دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں ہوٹل کا خدمت گار جو کمرہ دکھانے کو نواب مرزا کے ساتھ آیا تھا اُس نے ہاں ہاں کر کے بیچ بچاؤ کیا۔ نواب مرزا کا سن مرآد علی سے زیادہ تھا لیکن نہ یہ قوت میں کم تھے نہ ہمت میں مرآد علی کے معاملہ میں ان کو واجبی رعایت مدنظر تھی اس کے اس مغلوب الغضب ہو جانے

سے بھی اُن کو غصہ نہیں آیا، ہوٹل کے خدمت گار کو یہ کہہ کے اُنھوں نے ٹال دیا کوئی خوف کی بات نہیں یہ نقال ہے اس وقت ٹھگ کی نقل مجھکو دکھاتا تھا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ وہ تو چلا گیا مگر کچھ تھوڑا شور ہو چکا تھا۔ بوٹن کے کان اسی طرف لگے تھے۔ وہ گھبرا کے زینہ پر گئی۔ مگر جب وہ آئی تو یہ دونوں علحدہ ہو گئے تھے۔

بوٹن کا نکاح یا مصنوعی شادی جو کچھ ہوا ہو خفیہ طریقہ سے ہوئی تھی۔ پھر نیز تو اُس کو بھگا کے لائی تھی ماں باپ کو اطلاع نہ تھی۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر نواب مرزا کو دیکھ چکی تھی۔ مراد علی کی ہر حرکت سے اُس کا خوف زدہ ہونا بھی اُس سے چھپا نہ رہا تھا، یہاں نواب مرزا کو پھر وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے پہلے ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو یہ آوازیں اُس کے کانوں میں گئیں، جن نگاہوں سے نواب مرزا اور مراد علی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے یہ آثار ایسے نہ تھے کہ بوٹن سے مراد علی کی حالت پوشیدہ رہ سکتی بوٹن ہائیں یہ کیا ہوا؟ مراد علی، جاؤ تم جاؤ کمرے میں جا کے بیٹھو تم کیوں چلی آئیں۔ بوٹن ایک ضدی عورت تھی ایسے پھسلانے میں کب آتی ہے۔ میں تو اکیلی نہ جاؤں گی۔

نواب مرزا نے پھر انسانیت کا برتاؤ کیا وہ بوٹن سے مخاطب ہوئے۔ ہم دونوں آپ کے کمرہ میں چلتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ سر راہ کوئی بات نہ ہو۔ یہ کہہ کے نواب مرزا بڑھے مراد علی کو بھی مجبوراً جانا ہی پڑا۔ کمرے میں پہنچکر دروازہ بند کر کے دونوں آمنے سامنے بیٹھے، بوٹن کوچ پر کنارے بیٹھ گئی۔

مراد علی۔ آخر آپ کا مطلب کیا ہے۔؟

نواب مرزا۔ صرف دو دو باتیں۔

مراد علی دلے بوٹن کو چھوٹے کمرے میں جو اس بڑے کمرے سے متصل تھا لیجا کے بٹھا دیا۔ ہم کو ان باتوں سے کیا غرض ہے۔

بوٹن۔ دبچپنے سے کسی کی حکومت ماننے والی نہ تھی، جب ہم نے تمہارا ساتھ دیا تو ہم کو تمہارے ہر کام سے غرض ہے۔ دروازہ کے قریب بیٹھ گئی مراد علی کسی طرح اس گفتگو کے سُننے سے نہ روک سکا، غریب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا باران جاری تھا۔ ایک میز کمرے کے بیچوں بیچ بچھی تھی۔ دو کرسیوں پر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

نواب مرزا۔ اول تو یہ بتاؤ کہ اس طرح گھبرا کے لکھنؤ سے تمہارے بھاگنے کی کیا وجہ ہے۔ تمہارا چال چلن ضرور مشتبہ ہے۔

مراد علی۔ کہے جائیے جو کچھ کہنا ہے سب کہہ لیجئے تو میں جواب دوں گا۔

نواب مرزا۔ سہولت تو اس میں تھی کہ ہر بات کا جواب ملتا جاتا۔ مگر خیر یوں ہی سہی۔

بوٹن۔ مراد علی کو اندر بلایا۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ سانچ کو کیا آنچ۔

مراد علی۔ تو کیا تم کو بھی میری طرف سے کچھ شک پیدا ہوا۔

بوٹن۔ شک ہو یا نہ ہو اب تو میں تمہارے ساتھ ہوں جو تقدیر دکھائے دیکھوں گی۔

نواب مرزا۔ یہاں آئیے۔ تھوڑی دیر میں میری باتوں کا جواب مل جائے میں چلا جاؤں پھر آپ دونوں میاں بیوی آرام سے بیٹھیے۔" یہ بوٹن کی تسکین کے لئے کہا تھا۔

بوٹن سمجھ گئی تھی کہ جو شخص لکھنؤ سے یہاں تک ساتھ ہی ساتھ آیا ہے وہ بہت جلد ٹلنے والا نہیں ہے، ضرور سنگین مقدمہ ہے۔

نواب مرزا۔ دمراد علی سامنے موجود ہے، میں خوب جانتا ہوں کہ خورشید مرزا ایک بھولے رئیس کو تم نے خوب شیشہ میں اُتارا۔ جب وہ تمہارے قابو میں آگئے، تو اختری کا تمام مال تم لے کے چلتے ہوئے۔ اگر تم کھرے ہو تو دو دن کے لئے لکھنؤ چلے چلو۔ اخراجات کا میں ذمہ دار ہوں۔ خورشید مرزا صاحب کو حساب سمجھا کے چلے آؤ۔ پھر تم کو

اختیار ہے جہاں جی چاہے جاؤ۔

مراد علی۔ مگر یہ تکلیف میں کیوں گوارا کروں، میں لکھنؤ نہیں جاؤنگا، آپ کیا کر سکتے ہیں، آپ کو فقط اشتباہ ہے شبہ پر کوئی کارروائی نہیں چل سکتی۔ مقدمہ کے وجوہ سے آپ بے علم ہیں۔ جو آپ کا خیال ہے وہ بالکل غلط ہے۔

نواب مرزا۔ لکھنؤ تو آپ کو چلنا ہی ہوگا۔

مراد علی۔ وارنٹ گرفتاری دکھائیے۔ یوں تو آپ نہیں لیجا سکتے۔

نواب مرزا۔ تو آپ نہ جائیں گے۔؟

مراد علی۔ ہاں مجھکو لکھنؤ چلنے سے انکار ہے اور اس جرم سے بھی۔

نواب مرزا۔ میں اس نیک بخت کی خاطر سے تمہارے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کرتا ہوں ورنہ یہ قانون دانی آپ کی دھری رہ جاتی۔ مجھکو خوب معلوم ہے کہ اگر میں پولیس میں ابھی خبر کرتا ہوں کہ مال مسروقہ اُس کے پاس ہے تو ابھی تم گرفتار ہو سکتے ہو، چوروں کی طرح ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی، مگر مجھے تمہارے بے آبرو کرنے سے کیا نفع اور خصوصاً ایک شریف زادی کی زندگی برباد کرنے سے کیا حاصل بشرطیکہ اختری بیگم کو نقصان نہ پہنچے۔ آپ کے اس انکار سے کیا ہوتا ہے مال مسروقہ آپ کے پاس موجود ہے۔

مراد علی۔ مقدمہ اس قدر آسان نہیں ہے۔ ثبوت لائیے۔

نواب مرزا۔ مقدمہ میں کوئی دشواری نہیں، اور ثبوت بھی موجود ہے۔ تم پندرہ روپیہ ماہوار کے نوکر تھے، لاکھوں کی رقم کا تمہارے پاس سے برآمد ہونا ہی کیا کم ثبوت ہے۔ تم کو نشان دہی کرنا ہوگی کہ یہ رقم کثیر اور جواہرات تم کہاں سے لائے۔

مراد علی۔ (بہت دلیر ہو کے) جب اس قدر آسان ہے تو آپ دیر کیوں کرتے ہیں۔

کہنے تو کہدیا کہ اور معلوم ہوا کہ نواب مرزا کرسی سے اُٹھتے ہیں، مراد علی پر سخت خوف غالب تھا، چور کا دل کتنا، کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نواب مرزا کچھ سوچ کر پھر بیٹھ گئے۔

نواب مرزا۔ بعض وجوہ سے بلا دست اندازی پولیس میں تم کو لکھنؤ واپس لیجانا پسند کرتا ہوں۔ اچھا جلد کہو چلو گے یا نہیں؟

مراد علی۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ نجات کی تدبیریں سوچ رہا تھا، نواب مرزا کی تاخیر سے کسی قدر جرأت بڑھ گئی تھی۔ میں آج کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے مہلت دیجئے، کل غور کر کے جواب دوں گا۔ کل صبح کو صاف جواب دونگا۔

نواب مرزا۔ مجھکو بہلاتے ہو (زور سے ایک قہقہہ مار کے) " بازی بازی بریش بابا ہم بازی " میں تم سا جعلیہ نہیں ہوں اور شاید قانون بھی تم زیادہ جانتے ہو۔ بہر صورت عقل فساد تمہاری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا بیوقوف بھی نہیں ہوں کہ تم کو کورا چھوڑ دوں۔ کل تک تم سمندر میں بمبئی سے کوسوں دور نکل جاؤ گے، پھر تمہیں کون پا سکتا ہے۔ اچھا تو میں حلف نامہ دے کے تم کو فوراً گرفتار کرائے دیتا ہوں۔ تم برٹش انڈیا سے باہر جانا چاہتے ہو۔ سمجھے قانون۔ فوجداری نہ سہی دیوانی سہی ہر طرح مطلب ایک ہی ہے۔

مراد علی۔ ذرا خوش ہو کے۔ خورشید مرزا کا یا اختری کا مختار نامہ دکھائیے مدعی سُست۔ گواہ چُست۔

نواب مرزا۔ مختار نامہ تار پر دو گھنٹہ میں آتا ہے۔ خلاصہ زیادہ باتوں میں وقت نہ ٹالو فوراً میری شرطیں منظور کرو۔ یا جواب صاف دو۔ بس بہت رعایت کی اب آگے فرض کی بجا آوری ہے۔

مراد علی۔ جواب دینا چاہتا تھا۔ سخت سے سخت جواب، مایوسی کا عالم تھا مگر بوٹن دروازہ کھول کے اسی کمرہ میں چلی آئی تھی۔ چیخ کے رو رہی تھی، نواب مرزا کو مراد علی کی ذرا سی رعایت منظور نہ تھی مگر ایک بے بس نوجوان شریف کی لڑکی پر ترس آجاتا تھا۔ آخر نواب مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھ کے مراد علی کا بیگ قبضہ میں

کرلیا۔ بہتر ہے تو یہ بیگ میرے قبضہ میں رہے گا۔ اَب آپ جب چاہیں جواب دیں۔

مرآد علی۔ بیگ ہاتھ سے رکھ دیجئے، آپ زبردستی کرتے ہیں۔

نواب مرزا۔ ہاں زبردستی آپ پولیس میں خبر کیجئے میں سمجھ لوں گا۔ بہتر ہے آپ اپنے ہاتھوں خود ہتھکڑیاں پہنئے میں تو بچا رہا تھا۔

مرآد علی۔ اچھا بیگ لے جائیے مگر کنجی میرے پاس رہے گی، کنجی بیگ کے قفل میں لگی تھی۔ ہاتھ بڑھا کے مرآد علی نے کنجی پھرا کے قفل بند کر دیا اور کنجی اپنے جیب میں ڈال لی۔

نواب مرزا خود اُس بیگ کو کھولنا نہیں چاہتے تھے نہ اپنے پاس کنجی رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اچھا نواب آپکو تین گھنٹہ کی مُہلت ہے۔ اب میں رُخصت ہوتا ہوں۔

مرآد علی۔ نواب میں آزاد ہوں کچھ آپ سے اطلاع کی ضرورت نہیں ہے، جہاں چاہوں چلا جاؤں۔

مگر یہ صرف نواب مرزا کو بہکانے کے لئے کہا تھا۔

نواب مرزا اپنے خاص کمرے میں چلے آئے۔ ہوٹل کے آدمی سے کھانا منگا کے کھایا، تھوڑی دیر پلنگ پر لیٹے رہے۔ مرآد علی اور بوٹن کمرے میں ایک ساتھ ہی ہیں یہ بوٹن نے سب باتیں کانوں سے سُنیں اور واقعات آنکھ سے دیکھے، اس کو مرآد علی کی پُوری حقیقت معلوم ہو گئی۔ اَب اس کم سن لڑکی نے تیور بدلے۔

تم نے مجھ سے دغا کی۔

مرآد علی۔ اَب تو تم کو سب معلوم ہی ہو گیا۔ میں تمہاری نظر میں بھی بےحد رہ بن گیا۔

بوٹن۔ مگر تم نے مجھ سے دغا کی۔ اب تک مجھ سے کہا کیوں نہیں۔

مرآد علی سمجھا کہ بوٹن میرے ساتھ جرم میں شرکت کرنے کو موجود تھی۔ یہ بات نہ تھی بوٹن جو کچھ ہو اُس کا دل بے ایمان نہ تھا۔ اُس نے کہا تو یہ کہا۔

میں اور سب طرح تمہارا ساتھ دینے کو حاضر ہوں مگر چوری کی شریک نہیں ہوں۔ اختری کو میں جانتی ہوں بڑی نیک بی بی ہے اُس کا مال میں بیٹھ کے کھاؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

مراد علی۔ خیر اب اسے جانے دو۔ جو ہوا ہوا، اس سے نجات کی فکر ہونا چاہیئے۔

بوٹن۔ بس نجات اسی طرح ہے کہ اختری بیگم کا سب مال اُن کو پھیر دیا جائے۔ اس میں تمہارا بھی کچھ ہے؟

مرآد علی۔ میرا کیا ہے۔ چچا کے ترکہ میں ایک ہزار روپیہ مجھکو ملے ہیں وہ بھی اُسی بیگ میں ہیں۔

بوٹن۔ بہت خوش ہو کے۔ ایک ہزار! بس وہ ہمارے لیئے کافی ہے زندہ ہیں تو محنت مزدوری کرکے بہت کچھ پیدا کر لیں گے۔ حرام کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ جلدی واپس کردو اور جہاں جانا چاہتے ہو چلو میں ساتھ ہوں۔

مرآد علی۔ ایک ہزار روپیہ تو وہ کئی دن کا ہے۔ سفر خرچ کے لیئے بھی کافی نہ ہوگا۔

مرآد علی کا ارادہ مکہ معظمہ جانے کا نہ تھا اُس نے بوٹن کو دھوکا دیا تھا وہ چاہتا تھا کہ نئی دنیا کو جانا چاہیئے وہاں کون میرا پیچھا کرے گا، وہیں جواہرات بھی بک جائیں گے۔ اور نوٹوں کا بھی معاملہ کسی نہ کسی طرح کر لوں گا۔ خوب فراغت سے زندگی بسر کرونگا۔

بوٹن کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ سفر میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ سفر خرچ ہم اُن سے لیں گے جو اختری کی طرف سے آئے ہیں۔ بیچارے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

مرآد علی۔ تم نواب مرزا کو نہیں جانتیں وہ ایک حبہ دینے والا نہیں ہے۔
بوٹن۔ یہ میرا ذمہ میں (نواب مرزا نام ہے) ان سے خرچ دلوا دوں گی۔
مرآد علی یوں تو کچھ نہیں سکتا۔
بوٹن۔ اور یہ ہزار روپیہ بھی اُسی بیگ میں ہیں۔" اس کا صاف جواب مراد علی نے نہیں دیا۔

مرآد علی۔ سب اُنھیں کے پاس سمجھو۔
بوٹن۔ تمہارا جو کچھ ہے سب مل جائے گا بلکہ کچھ اور بھی۔
وہ دن گذرا، رات گذری، صبح سویرے نواب مرزا مرآد علی کے پاس گئے وہ زینہ سے اُتر رہا تھا۔ نواب مرزا نے جواب مانگا۔
مرآد علی۔ جلدی کیا ہے مال آپ کے پاس ہے گھر میں طبیعت علیل ہو گئی ہے سفر ملتوی ہے جواب آپکی مرضی کے موافق ہوگا۔ ذرا اور ٹھہر جائیے۔
نواب مرزا خوب جانتے تھے کہ مرآد علی وقت گذاری کر رہا ہے مگر سخت کارروائی منظور نہ تھی۔ چاہتے تھے کہ بآسانی کام نکل جائے۔" ہم لعل بدست آید و ہم یار نرنجد" بوٹن، مراد علی کے لئے سپر کا کام دے رہی تھی،۔
نواب مرزا کو کچھ ایسا اس کا خیال پیدا ہو گیا تھا کہ پولیس کی کارروائی سے یہ بچاتے تھے اگرچہ مصمم ارادہ تھا کہ جب کچھ نہ ہوگا تو پھر مجبوراً گرفتار کرانا پڑے گا بوٹن کی نسبت یہ خیال تھا کہ:۔
یہ اس مردود کے بہکانے سے گھر سے نکل آئی ہے۔ بدنصیب والدین پر جو گذرنا تھی گذر گئی اب اگر یہ گھر میں واپس جائے بھی اور بالفرض والدین رکھ بھی لیں تو بھی بہت بُری زندگی ہوگی عزیز اقارب بُری نظروں سے دیکھتے رہیں گے عقد ہو نہ سکے گا مجھے یقین نہیں مگر شاید نکاح ہو گیا ہو۔ اس صورت میں اور خرابی ہے یہ بدمعاش جیل خانہ

میں بھیجد یا جائیگا۔ میعاد پانچ چھ برس سے کم نہ ہوگی، خورشید مرزا کا مختار تھا خیانت مجرمانہ ہے سات برس کی میعاد یہ بدنصیب کیونکر بسر اوقات کرے گی۔ اگر ماں باپ نے نہ قبول کیا، جوان جہان ہے، ناک نقشہ بھی اچھا ہے ضرور شکم پروری کے لئے بدکاری پر مجبور ہوگی اگر اس کا جی نہ بھی چاہے بدمعاش کب چھوڑیں گے اس کا انجام بخیر نہ ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کو اس مردود سے اُلفت ہے وہ بھی بہ ظاہر فریفتہ ہے اگرچہ ایسے بدمعاشوں کے قول و فعل کا اعتبار نہیں مگر نام تو شوہر کا ہے اب جو ہوا وہ ہوا اس عورت کا اسی کے پاس رہنا اس کے حق میں مناسب ہے اور کوئی اس کا ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر مرآد علی سزایاب نہ ہوا شاید کسی طرح کوئی صورت معاش کی نکل آئے خدا رازق ہے، آدمی کارکردہ ہوشیار ہے۔ بہرصورت مجھکو صبر کرنا چاہیئے، مگر ہوشیار رہنا چاہیئے۔

---

# باب ۲۴

برسات کے دن گذر چکے ہیں مگر اب بھی ہفتہ میں دو ایک مرتبہ بارش ہو جاتی ہے۔ بہت خوش آیند خنکی ہے۔ درختوں کے سبز سبز پتے مینہ سے دھل گئے ہیں، بار بار نظر پڑتی ہے۔ ہوٹل کے سامنے ایک مختصر پارک ہے۔ سامنے ہوٹل کی عمارت عالی شان چار پانچ منزلہ مکان متعدد کمرے۔ سبز سبز بیل زمین سے جو چڑھنا شروع ہوئی ہے اوپر تک چلی گئی ہے رو کار کا اکثر حصہ بیلوں سے پوشیدہ ہے۔ محراب دار دروں میں پھولوں کے چوبی ناندے (گملے) لٹکے ہوئے ہیں، پارک کے بیچوں بیچ میں ایک وسیع حوض میں فوارہ پانی کی سطح سے بہت اونچا ہو کے چاروں طرف گولائی کے ساتھ پھیل کے حوض کی سطح پر گرتا ہے فوارے کے گرنے سے پانی کے سطح پر عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ جلدی جلدی حباب بنتے اور بگڑتے ہیں۔ فوارے سے تھوڑے سے فاصلہ پر برقی لیمپ کا ستون سبز رنگا ہوا بہت بڑی سفید چینی کے رنگ کا گلوب چڑھا ہوا ستون پر بھی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہوٹل کے پھاٹک میں کیسی خوبصورت مصر کی بنی ہوئی قندیل آویزاں ہے۔ وہ سامنے عظیم الشان ریلوے اسٹیشن کی عمارت ریلوں کی آمد و رفت اسٹیشن کی چہل پہل غرض کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہوٹل کے پھاٹک سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ پر ایک بنچ پڑی ہے نواب مرزا یہاں بیٹھے ہوئے اس منظر کی سیر کر رہے ہیں، ایک مصور کے لئے ایسے منظر کو دیکھ کے بغیر تصویر اُتارے کب رہا جاتا۔ پنسل اور کاغذ ہاتھ میں نقشہ کھینچ رہے

ہیں۔ اس اثناء میں یہ خیال آیا کہ زینہ خالی خولی اچھا نہ معلوم ہوگا اگر کسی کی بھولی بھالی صورت زینہ سے نیچے اُترتے ہوئے نقشہ میں دکھائی جاتی تو بہت ہی عمدہ نقشہ بنتا۔ اتنے میں اُنھوں نے دیکھا مرادعلی کی زوجہ اُسی موقع پر اُترتی چلی آتی ہے اُنھوں نے فوراً اسکیچ لیا۔ مصور کو ایک نظر کسی کی صورت دیکھ لینا کافی ہے۔ اب یہ خیال کہ ایک پردہ کی صورت ایسی تصویر میں کیوں کر دکھائی جائے جس پر ہزاروں نظریں پڑیں گی، نواب مرزا نے اپنے دل کو اس طرح سمجھایا کہ ایک فرضی تصویر میں اگر کسی پردہ نشین کا ناک نقشہ مل جائے تو یہ اُس کی تصویر نہیں ہے۔ یہ گھڑی گھڑی ہوٹل کی عمارت کو نظر اُٹھا کے دیکھتے جاتے تھے اور پنسلی کام میں مصروف تھے اُنھوں نے دیکھا کہ وہ برقع پوش زینہ سے اُتر کے اسی طرف آرہی ہے۔

بوٹن۔ (نے آکے بہت ادب سے تسلیم کی) میں آپ سے ایک التجا لے کے آئی ہوں۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔

نواب مرزا۔ کیا تم اپنے شوہر کا پیام لے کے آئی ہو۔

بوٹن۔ نہیں میں کسی کی طرف سے نہیں آئی ہوں۔ خود کچھ کہنا چاہتی ہوں

نواب مرزا۔ بہت خوش ہو کے۔ بے تکلف کہو۔

بوٹن۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ میں کل سے آپ کی انسانیت اور شرافت آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ کیا کوئی مروت کر سکتا ہے۔

صورت ملاقات کی یہ ہے کہ نواب مرزا بنچ پر بیٹھے ہیں اور بوٹن نیچے زمین پر اُن کے روبرو گھاس پر بیٹھ گئی ہے۔ نواب مرزا نے پنسل نوٹ بک ہاتھ سے رکھ دیا ہمہ تن متوجہ ہو کے سر جھکائے سُن رہے ہیں۔

بوٹن۔ وہ تو مرد ہیں اور میں عورت ذات آپ کے آگے کیا جھوٹ کہوں گی۔ میرے اعمال ایسے نہیں ہیں جو کچھ اور کہہ سکوں۔

نواب مرزا۔ کیوں؟ جب تمہارا نکاح اس شخص کے ساتھ ہو چکا ہے تو پھر کیا عیب ہے۔

بوٹن۔ نکاح ضرور ہے مگر بغیر ماں باپ کی منظوری کے ان سے چھپا کے۔ کیا کہوں میری سمجھ پہ کیا پتھر پڑ گئے تھے۔

نواب مرزا۔ خیر نکاح ہے خواہ کسی طرح ہو اب مطلب کی بات کہو۔

بوٹن۔ میں چوری کے مال سے کھانا نہیں چاہتی شوہر مردار اور پھر چوری بھی کس کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اتنا کہہ کے بوٹن رک گئی۔ اختری کا نام زبان پر آ کے رہ گیا۔

نواب مرزا۔ ہاں ہاں، کہو کہو۔ کس کی چوری؟ بے شک تم جس کا مال ہے اسکو جانتی ہو۔

بوٹن۔ جی نہیں میں کیا جانوں۔

نواب مرزا۔ تو پھر آپ نے میرے پاس آنے کی ناحق تکلیف اٹھائی میں صاف آدمی ہوں اور صفائی پسند کرتا ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو صاف صاف سب کہنا ہوگا۔

نواب مرزا کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس بدنصیب کم سن لڑکی کے ماں باپ کو میں کچھ تسلی دے سکوں یہ نیکی کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

بوٹن۔ میں خوب جانتی ہوں کہ یہ اختری بی بی کا مال ہے۔ ایسی نیک آدمی وہ تو فرشتہ ہیں ان کی چوری کر کے کوئی فلاح نہیں پا سکتا۔

نواب مرزا۔ تم اختری بیگم کو کیوں کر جانتی ہو؟

بوٹن۔ اب اسکو چھوڑ دیجئے۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔

نواب مرزا۔ حال تو ذرا ذرا سا تم کو بتانا ہوگا۔ آخر میں بھی تو سنوں تم کس کی لڑکی ہو کیونکر اس بدمعاش کے پھندے میں پھنسی۔ اب تمہارا کیا انجام ہونا ہے۔

بوٹن۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہوا جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں کا کیا ڈر جو کیا وہ بے شک بُرا کیا۔ مگر اب چھوڑ دینا کیسا۔ اب چور ہو جواری ہو شرابی ہو جو کچھ ہو میں نباہ دوں گی۔ میری قسمت کا یہی لکھا تھا۔

نواب مرزا۔ شاباش بھلے آدمیوں کی لڑکیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔ مگر کاش اُس کم بخت کو اس کی شرم ہو۔" غرض بوٹن کو اپنی سرگذشت نواب مرزا سے کہنا پڑی جس کو ناظرین خوب جانتے ہیں دوہرانے سے کیا حاصل"۔

نواب مرزا۔ تو اب کیا چاہتی ہو۔

بوٹن۔ مجھ پر رحم کر کے قید سے بچا دیجئے۔ میر صاحب اگر آپ نے میری فریاد نہ سُنی تو پھر یہ سمجھ لیجئے گویا میری ساری زندگی آپنے خاک میں ملا دی۔ سزا کاٹنے کے بعد پھر کوئی پاس کھڑے ہونے کا روادار نہ ہوگا۔ بھیک بھی مانگے نہ ملے گی۔ دوسرے یہ شخص بُرا ہے اور بد تر ہو جائے گا۔ پھر عمر بھر سوائے چوری کے اور کوئی پیشہ کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ میری مٹی پلید ہو گی۔ یہ کہہ کے بوٹن نے چیخیں مار کے رونا شروع کر دیا۔

نواب مرزا۔ سخت متاثر ہوئے۔ اچھا تو رؤو نہیں میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے، نواب مرزا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اچھا مال سے مجھ کو کام ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔ جاؤ میں کچھ نہ کروں گا پہلے سے میرا یہی خیال تھا مگر اُس کے انکار اور سرکشی سے کبھی کبھی خیال آتا تھا۔۔۔۔۔

بوٹن۔ نہیں میر صاحب آپ اپنی طرف دیکھئے۔

نواب مرزا۔ دیکھو کل کا واقعہ ہے میرا گلا گھونٹے دیتا تھا۔ ہوٹل کا آدمی غل مچانے کو تھا میں سانے بہانہ کر کے ٹال دیا، ورنہ کل ہی گرفتار ہو گیا تھا۔

بوٹن۔ میر صاحب آپ اصل سادات ہیں اور میں سیدوں کی لونڈی ہوں،

عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی اور تو مجھہ سے کیا ہو سکتا ہے دعائیں دیا کرونگی۔

نواب مرزا۔ اچھا تو اور جو کچھہ کہنا ہو کہو۔

بوٹن۔ ہمارے ہزار روپیہ ذاتی بھی اُس میں ہیں۔

نواب مرزا۔ وہ واپس دیئے جایئں گے۔

بوٹن۔ مگر ہزار روپیہ سے کیا ہوتا ہے۔ پردیس جانا ہے کچھ آپ اور مدد کیجئے۔

نواب مرزا۔ اچھا ہزار وہ اور ایک ہزار روپیہ میں اور دوں گا، اوّل تو اختری معاف کر دیں گی۔ اور اگر نہ معاف کریں تو میں خود اپنے پاس سے قسطیں ادا کر کے ادا کر دوں گا۔ تم خاطر جمع رکھو۔ بس اتنا مجھ سے ہو سکتا ہے۔

بوٹن۔ خدا آپ کو جیتا رکھے بس اور کیا چاہیئے۔

نواب مرزا۔ لیکن اتنا سمجھا دو کہ اس بیگ سے علیحدہ اور جو کچھہ اختری یا خورشید مرزا کا کوئی کاغذ یا روپیہ یا جواہر غرض جو کچھہ ہو واپس دے کے حساب پاک کر دینا ہو گا۔

بوٹن۔ میں ذمہ دار ہوں سوائے اس دو ہزار کے اور کچھہ نہ لیا جائے گا۔

نواب مرزا۔ اچھا تو اب جاؤ۔ خاطر جمع رکھو۔ میں کچھ نہیں کرنے کا۔ یہ سب تمہاری خاطر سے۔

بوٹن۔ تسلیم کر کے دعایئں دیتی ہوئی ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔

نواب مرزا۔ اُس کی ایمان داری اور وفاداری سے بہت خوش ہوئے۔ بے شک شریف کی اولاد ہے۔ ایسی دِل کی نیک با مروت اس بد معاش کی تقدیر میں تھی۔ اس حساب سے تو بڑا خوش قسمت ہے مگر اس کی تقدیر پھوٹ گئی۔ کس قدر اپنی قسمت پر قانع ہے عمر بھر اس بد معاش بے ایمان چور کا ساتھ دینے

کو موجود ہے صرف اس لئے کہ اُس کا ساتھ ہو گیا ہے گو کسی طور سے ہو شوہر کا نام تو ہو گیا۔

بوٹن کو بجائے خود اطمینان ہو گیا تھا۔ اُس نے مرآد علی سے کچھ نہیں کہا اُس کو یقین تھا کہ آج رات گویا کل صبح کو میر صاحب سے اور مرآد علی سے گفتگو ہو کے معاملہ طے ہو جائے گا۔ وہ چاہتی کہ کہیں جلد یہ جھگڑا چُکے۔ شام ہوئی قریب آٹھ نو بجے کے درمیان کھانا کھایا باتیں کیں۔ یہ باتیں جہاز کے متعلق تھیں۔

بوٹن۔ مجھے تو سمندر کے نام سے بخار چڑھتا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

مرآد علی سفر کی خوبیاں جہاز کے سفر کی سیریں نئی نئی چیزوں کا دیکھنا، جہاز کا چلنا، لنگر ڈالن جو کچھ اُس نے سُنا سُنایا تھا اُس کو اس طرح سے بیان کر رہا تھا جس سے بوٹن کا خوف دُور رہے۔ شوق بڑھے۔

باتیں کرتے رات زیادہ ہو گئی دونوں سو رہے۔ صبح سویرے وہ ہوٹل سے سے نکل کے غائب ہو گیا۔ نو بجے دس بجے دوپہر ہو گئی ابھی تک کہیں پتہ نہیں کبھی کبھی بوٹن کو خیال ہوتا تھا کہ کہیں مجھ کو یہیں چھوڑ کے چلا تو نہیں گیا۔ جب سے اُسکا چور ہونا بوٹن پر ثابت ہو گیا تھا بھروسہ نہ رہا تھا یہ بھی اُس کی جرأت تھی کہ وہ ساتھ دینے پر آمادہ تھی۔ اُس کو مر جانا قبول تھا مگر وطن کو واپس جا کے ماں باپ کو صورت دکھانا ہمجولیوں سے آنکھ چار کرنا کسی طرح گوارہ نہ تھا۔ آخر سر شام مرآد علی آیا۔ گاڑی لیتا آیا اور آتے ہی جلدی کرنے لگا، لے اُٹھو سوار ہو، بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اُٹھو جلدی اُٹھو۔ ایک دم کی مہلت نہیں ہے۔ یہ جلدی، یہ گھبراہٹ بوٹن کی اُمید کے بالکل خلاف تھی۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیا ہوتا ہے معاملہ طے ہوا یا نہیں۔؟

بوٹن۔ آخر کہاں لئے چلتے ہو کچھ کہو تو سہی۔

مرآد علی۔ کہدیا کہ اُٹھو اس وقت فضول باتوں کا موقعہ نہیں ہے۔ جہاز کا لنگر

اُٹھنے کو ہے۔

نواب مرزا سے کیا ٹھہری؟ یہ سوال اُس کی زبان پر بار بار آیا مگر مرادعلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوائے اس کے کہ جلدی اٹھو چلو۔ گویا اُسے کوئی بات آتی ہی نہ تھی۔ مرد ہر طرح سے عورت پر قوی ہے۔ عورت ہر صورت سے محکوم ہے۔ بوٹن مرادعلی کے قابو میں تھی۔ عمر بھر ساتھ دینے کا قصد کر لیا تھا۔ غیر ملک میں جہاں کوئی اُس کا ساتھی نہ تھا۔ نواب مرزا نے اس سے سب کچھ کہا مگر یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ تو مرادعلی کو چھوڑ دے۔ بلکہ وہ اپنے نزدیک بوٹن کے حق میں یہی مناسب سمجھے ہوئے تھے کہ وہ مرادعلی کا ساتھ دے۔ سوائے مرادعلی کے اب اُس کا کہیں گزارہ نہیں ہے۔ آخر بوٹن کو کچھ نہ بن پڑا۔ اسباب گاڑی پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی برقعہ اوڑھ کے ساتھ ہو گئی۔ مرادعلی نے مارے جلدی کے اُس گود میں اٹھا کے گاڑی میں بٹھا دیا۔ گاڑی والے سے کہا چلو، راستہ میں گاڑی والے سے بار بار جلد چلنے کی تاکید ہو رہی تھی۔ چلو! چلو!

گاڑی بندرگاہ پہ پہنچ گئی۔ بوٹن کا ہاتھ میں ہاتھ مرادعلی جلد جلد قدم بڑھائے چلا جاتا ہے۔ راستہ میں کہیں موٹے موٹے رسے لپٹے ہوئے پڑے ہیں، گٹھڑیوں اور صندوقوں کا جابجا انبار ہے۔ مختلف ملکوں کے مسافر مرد عورت بچے، ہاتھی، گھوڑے بھیڑیاں، دُنبے، بکرے، بکریاں، گائے بیل، جہاز پر بار کرنے کے لئے بھاگا بھاگ کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ہاتھی کے پیٹ سے زنجیر لپیٹی گئی۔ بڑے بڑے کانٹے لگائے گئے۔ کرین (بوجھ چڑھانے کی کل) اُٹھی ہاتھی چند منٹ میں جہاز پر تھا غرض ایک ایسا عجیب و غریب منظر تھا جو بوٹن نے ہرگز نہ دیکھا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس تماشہ سے لطف اُٹھانا اس کی قسمت میں نہ تھا وہ حیران تھی کہ جہاز پر آنے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ سمندر کو دیکھ کے اُس کو جھُرجھُری سی معلوم ہوئی جیسے بخار چڑھتا ہے

مگر کیا کر سکتی تھی، مراد علی اس کو دبوچے ہوئے تھا۔ چھوٹی کشتیاں کنارہ پر آکے لگ گئی جاتی تھیں اُس پر مسافر سوار ہو جاتے تھے، جہاز کنارے سے فاصلہ پر تھا۔ کشتی جہاز کے نیچے جا کے ٹھہری۔ یہاں سیڑھیوں کے ذریعہ سے اوپر چڑھنا ہوتا تھا۔ بوٹن نے دونوں آنکھیں بند کرلی تھیں، مراد علی سے منت کر رہی تھی۔ اللہ تم ہمیں چڑھا دینا ہم سے نہ چڑھا جائے گا۔ مراد علی دلاسا دے رہا ہے، کشتی کے انتظار میں تھا۔ ایک ایک سیکنڈ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ آخر کشتی آہی گئی، مراد علی نے بوٹن کی ٹوکری جس میں کھانے کا سامان تھا ملاح کو دیا۔ ملاح مسافروں کو کشتی میں چڑھاتا جاتا تھا۔ اب بوٹن کی باری تھی۔ اتنے میں چند شخص اس موقعہ پر آگئے اور ایک نے ملاح کو روکا۔ بوٹن نے پلٹ کے دیکھا " وہ جس نے ملاح کو روکا تھا" اس شخص کو تو میں کچھ پہچانتی ہوں کچھ ایسی گھبرائی ہوئی تھی کہ فوراً خیال نہیں آیا۔ ہوٹل کا آدمی تھا، وہی جس نے نواب مرزا اور مراد علی میں بیچ بچاؤ کیا تھا۔ ابھی بوٹن کا خیال اس شخص کی شناخت میں مصروف تھا کہ اور ایک شخص سپاہیانہ لباس بہت گراں ڈیل سُرخ پگڑی نیلا کوٹ و پتلون مراد علی کے شانہ پہ ہاتھ ڈال کے ذرا ادھر تکلیف کیجئے۔ آپ کو تھانہ پر چلنا ہوگا۔

مُراد علی۔ یہ میں کیوں روکا جاتا ہوں۔؟

افسر پلیس۔ بڑا سنگین جُرم ہے۔ ہتکڑیاں ڈال کے، قتلِ انساں۔

مراد علی۔ قتلِ انسان! غضب ہے! میں نے کِس کو قتل کیا۔

ہوٹل کا ملازم۔ وہی جن کا کل تم زینہ پر گلا گھونٹ رہے تھے۔

مراد علی۔ وہ تو تم کو معلوم ہو گیا تھا کہ محض مذاق ہے۔

افسر پُلیس۔ وہ مذاق تھا۔ تو یہ واقعہ ہے۔ بس خاموش! اور ایک سپاہی کی طرف دیکھ کے گلا گھوٹنا بھی کوئی مذاق ہوتا ہے۔

سپاہی۔ لکھنؤ میں ایسا ہی مذاق ہوتا ہوگا — ورنہ تو کہیں نہ دیکھا نہ سُنا۔

بوٹن کو غش آگیا۔

# باب ۲۵

نواب مرزا اور موسیٰ بھائی سے ریل میں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے پتہ اپنی پاکٹ بک میں لکھ لیا تھا۔ فوراً دو تار دیئے ایک تار ان کی زوجہ کے پتہ سے سعادت گنج، دوسرا تار خورشید مرزا کو معرفت لکھنؤ کے پتہ سے دونوں تار پہنچ گئے تار کا مضمون یہ تھا۔

"نواب مرزا مصور ساکن لکھنؤ پارسی ہوٹل میں سخت زخمی ہوئے۔ پولیس اسپتال میں ہیں، مراد علی گرفتار ہے۔

اختری۔ ہائے، میری خیرخواہی میں غریب کا یہ حال ہوا، اُن کے بیوی بچے میری جان کو کوسیں گے۔ خدا جانے نواب مرزا کے گھر میں بھی اطلاع ہوئی یا نہیں حکیم جعفر علی صاحب کو بلانا چاہیئے، حکیم جعفر علی ابھی دو دن ہوئے سفر سے آئے ہیں۔ کس منہ سے کہوں کہ آپ بمبئی جائیے، ماموں جان ابھی تک بیماری سے ناطاقت ہو رہے ہیں۔ اتنے میں حکیم جعفر علی آ گئے، تار کا مضمون سُن کے سخت پریشان ہوئے۔ اس مردود مراد علی نے یہ کیا کیا؟۔

ہرمزی اور اُن کی ماں:۔ دیکھئے اُس چھوکری (بوٹن) پر کیا بنی ہوگی، وہ تو گرفتار ہے یہ بمبئی کی گلیوں میں بھیک مانگتی پھرتی ہوگی۔

حکیم جعفر علی۔ کیا کہوں بہن ہرمزی کا اس موقعہ پر جانا ضروری ہے۔ ماموں جان ضرور جائیں گے۔ مگر سب سے پہلے نواب مرزا کی بیوی کو خبر کرنا چاہیئے۔ کس منہ

سے کہوں گا اس لئے کہ وہ جانتی ہیں کہ میری اور اُن کی رائے تھی۔ اب میرا بھی نام ہوگا کہ میں نے بھیجا تھا۔

اختری۔ نہیں میں نواب مرزا صاحب کی بیوی کو خوب جانتی ہوں۔ اُن عورتوں میں نہیں ہیں جو جھوٹا الزام کسی پر رکھیں۔ آپ فوراً خبر کیجئے بہن ہرمزی کو اور اُن کو ہمراہ لئے جائیے۔

حکیم جعفر علی۔ اچھا تو اب دیر نہ کرنا چاہئے پہلے میں امو جان کے پاس جاتا ہوں۔ پھر نواب مرزا کے گھر جاؤں گا۔

خورشید مرزا سے اور حکیم جعفر علی سے چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد بمبئی کے سفر کا تہیہ ہو گیا۔ ہرمزی کا جانا بھی ضرور سمجھا گیا، نواب مرزا کے مکان پر امام علی ملازم کو بھیجا۔

خورشید مرزا اور حکیم جعفر علی ابھی باتیں کر رہے تھے کہ امام علی پلٹ کے آ گیا۔

امام علی۔ نواب مرزا صاحب کے گھر میں کل شام ہی کو بمبئی سوار ہو گئیں۔ میں نے گھر میں جا کے دیکھا ایک بڑھیا ماما ہے اور دونوں بچے کیسے بلک بلک کے رو رہے ہیں۔

خورشید مرزا۔ تو کیا بچوں کو چھوڑ گئیں۔

جعفر علی۔ کیا کرتیں بچوں کو پردیس میں کہاں لئے پھرتیں دوسرے شاید روپیہ بھی نہ ہو۔

خورشید مرزا۔ تو یہاں کہلا بھیجا ہوتا۔

جعفر علی۔ وہ لوگ اس منش کے نہیں ہیں۔

خورشید مرزا۔ ہم کو تو اعانت کرنا چاہئے۔

جعفر علی۔ ممکن ہو تو بچوں کو بلوا لیجئے۔

نادری اور اختری دونوں سوار ہو کے گئیں دونوں بچّوں کو بہلا کے ساتھ لائیں۔ یہاں آ کے ذرا بہل گئے۔

خورشید مرزا۔ نواب مرزا صاحب کی بیوی نے بڑی جلدی کی۔ ہرمزی کو اُنھیں کے ساتھ کر دیتے۔ خیر اب میں لیتا جاؤں گا۔

جعفر علی صاحب اپنے گھر گئے جلد جلد سفر کا سامان کیا۔

اختری نے خود بھی ہمراہ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر بعض مصلحتوں سے اُن کا جانا ملتوی رہا۔

یہ لوگ بمبئی کو روانہ ہو چکے ہرمزی زنانہ گاڑی میں ساتھ گئیں۔ چادر بیچ کر کے باہر نکلنے میں اُن کو بالکل تکلف نہ تھا۔ زینب بیگم کی لڑکی اُن کے لیے ایک برکت تھی۔ ہزار بیٹے صدقے کیے تھے اس دنیا میں سوائے ماں کی اطاعت اور خدمت گذاری کے اُن کو نہ کسی بات کا شوق تھا نہ حوصلہ اتنی زندگی سخت عُسرت میں بسر ہوئی تھی خود تکلیفیں اٹھائیں مگر ماں کا دل کبھی میلا نہ ہونے دیا۔ عین جوانی میں بڑھیوں کا سا مزاج تھا جو کچھ ماں سے بچا کھچا وہ آپ کھا لیا۔ گزی گاڑھا پہن لیا۔ مگر صاف ستھرے کپڑے سیدھی سیدھی کنگھی، سادہ لباس، غوطہ طہارت نماز روزہ پڑھنے لکھنے کا شوق اختری کے ساتھ سے اُن کو بہت فائدہ پہنچا اختری کو بھی پڑھنے سے شوق تھا جس کتاب کی ضرورت ہوتی فوراً منگائی جاتی دو ایک اخبار بھی آتے تھے جس کتاب کا اشتہار نظر پڑا اور مفید مطلب سمجھی گئی اختری نے فرمائش کا کارڈ بھیج دیا اور ویلو چلے آتے ہیں۔ بخلاف اِن دونوں کے نادری اور جعفری کے پڑھنے لکھنے سے کچھ کام نہ تھا۔ نادری کو قصہ کہانی کی کتابوں کے سوا اور کسی قسم کے مطالعہ سے شوق نہ تھا۔ جعفری کے نزدیک یہ بھی فضول تھا۔

جعفری کا مزاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا، جس گھر کو وہ اپنے باپ کا گھر سمجھے ہوئے

تھی اب اُس کو معلوم ہوا کہ اختری کے ہاتھ بکا ہوا ہے۔ باپ (خورشید مرزا) کے پاس سوائے پنشن اور وثیقہ کے کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے۔ باغ سے میوہ گاؤں سے غلہ اَب بھی آئے جاتا ہے مگر وہ اَب اُس کے باپ کا مال نہیں ہے۔ اختری کا ہے۔ اختری نے اپنی سیر چشمی اور فیاضی سے کبھی اِن چیزوں کو آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا گویا اُس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر جعفری غیر کا مال سمجھ کے ایک دانہ کسی کو ہاتھ اٹھا کے نہ دیتی تھی۔ خانہ داری کا انتظام اناج تول کے دینا، کھانا پکانا اُسی کے ذمہ تھا۔ کھانا پکنے سے پہلے وہ اختری کے پاس پکانے والی کو بھیج کے پچھواتی تھی کیا پکایا جائے گا۔ اختری کو اس غربت سے بھی مَلال ہوتا تھا۔ وہ لاکھ چاہتی تھی کہ جعفری اس کے ساتھ میل کرلے مگر وہ کسی طرح ملنے والی نہ تھی۔

ابھی تک اختری سے اُس دِن کے بعد جب سے وہ گھر سے نکالی گئی تھی سامنا نہ ہوا تھا۔ آخر خورشید مرزا کے بمبئی روانہ ہونے کے بعد زینب بیگم نے اختری کو جعفری سے گلے ملوا دیا۔ اختری خود ہی جُھک ملی۔ اُلٹی معذرت کی۔

اختری۔ ماموں جان کے بعد میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں، آپ کھائیے پکوائیے مجھکو بھی جس طرح ہاتھ اُٹھا کے دیتی تھیں دیجیے۔ اپنی چھوٹی سمجھئے چھوٹی بہن نہ سمجھیے لونڈی سمجھیے۔ مجھے زندگی بھر عذر نہ ہوگا، کیا کہنا اختری کا۔

جعفری۔ بس بس۔ آپ کی خوبیوں میں کوئی شک نہیں مجھے یقین ہے کہ جو آپ کہتی ہیں وہی کریں گی، مگر میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں اُس درجہ پر رہنا چاہتی ہوں جس درجہ پر خُدا نے مجھکو رکھا ہے۔ ایسی جھوٹی حکومت مجھکو منظور نہیں جب میں محکوم ہوں تو حاکم بن کے کیوں بیٹھوں، میں آپ کی اطاعت کرنے کو حاضر ہوں مگر مجھے بنائیے نہیں۔

اختری ۔ "کو اس اکھل کھرے پن سے بہت ملال ہوا ۔ مگر اس کا کوئی علاج نہ تھا ۔ ایک شخص کی طبیعت ہی اسی ڈھنگ کی تھی"۔ آخر اختری کو کہنا پڑا ۔ بہتر ہے جو آپ کی مرضی ہو وہی کیجئے ۔ منت سماجت کی بھی حد ہے ۔

جعفری ۔ آپ کیوں منت کرتی ہیں ۔ میں خطاوار ہوں مجھکو منت کرنا چاہئے آپ کا اُلٹے اُلٹے منت کرنا بھگو بھگو کے جوتیاں مارنا ہے ۔ میں اپنی سزا کو پہنچ گئی، بس آپ معاف کیجئے ۔

اختری ۔ اس دل توڑنے والی باتوں سے آنکھوں میں آنسو بھر لائی ۔ نادری یہ حال دیکھ کے اختری کو اُٹھا لے گئی ۔

جعفری ۔ خانہ داری کا اہتمام اُسی طرح کرتی تھی جس طرح پہلے کرتی رہی تھی بلکہ زیادہ کفایت کے ساتھ جہاں کسی ماما اصیل نے کسی قسم کی رعایت چاہی اپنے حصہ سے کچھ زیادہ لینا چاہا، یا رخصت مانگی جعفری نے صاف کہدیا ۔

اَب میں اس گھر کی مالک نہیں ہوں، تمہاری طرح میں بھی پرائی تابعدار ہوں، مالک اختری بیگم ہیں، میں یہ کچھ جل کے نہیں کہتی جس کو خدا دے ۔ جہاں کسی ماما نے کہا حضور آپ آپ ہی ہیں ہم ہمیں ہیں، آپکی ہماری کیا، برابری، آپ وہ برابر... ہیں ہم تابعدار ۔

جعفری ۔ بوا کریمن سنو یہ سچ ہے کہ میں تمہارے برابر نہیں ہوں مگر پرائی تابعداری میں شک نہیں، اچھا تو تم مجھے اس گھر کی داروغہ مان لو ۔ بس یہ میرا عہدہ ہے میں تمھاری افسر ہوں تم سب میرے ماتحت ہو اور میں بیگم صاحبہ کی ماتحت ہوں ۔

کریمن ۔ نہیں صاحبزادی تم بھی مالک ہو وہ بھی مالک ہیں ۔

جعفری ۔ یہ جھوٹی خوشامد ہے میں خود بدولت، اختری بیگم سے بھی کہہ چکی

ہوں کہ اگر اس رُتبہ پر مجھی رکھیں گی تو میں کام کو حاضر ہوں نہیں تو میرا استعفا ہے۔

کریمن۔ وہ تو آپ کو اپنا بڑا سمجھتی ہیں باجی کہتے کہتے منہ خشک ہوتا ہے دیکھئے وہ اس وقت نہیں ہیں مگر صاحبزادی ہم خدا لگتی کہیں گے۔ انھوں نے تو آپ کے ہوتے کبھی حکومت نہیں جتائی۔

جعفری۔ یہ اُن کی ریاست ہے۔ اور باجی کہنے کو، جو کہو، تو پُرانے نوکروں کو بھی نوکر نہیں کہتے۔ میں تو خوش ہوں وہ مجھے دروغہ صاحب کہا کریں۔

اختری نے تو زبان جل جائے جو کبھی یہ لفظ کہا ہو۔ ہاں نادری ہنسی ہنسی میں کہہ جاتی تھی۔

دروغہ صاحب آج آپ کیا پکوائیے گا۔؟ کہئے بزار سے کیا خریدا گیا؟

جعفری۔ ہاں ہاں تم بھی یہی کہو۔ میں کچھ چڑھتی ہوں؟ یہ تو میری عین خوشی ہے۔

غرض جعفری جس مرتبے کی تھی وہی مرتبہ اُس نے اختیار کیا۔ اختری کی دولت منت خوشامد اُسی کی ضد کے سامنے سب ہیچ ٹھہری، مضبوط ارادے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں وہ اپنی بات کی پکی اور ضد کی پوری تھی۔ جب تک باپ کی دولت سمجھ کے وہ اُٹھا رہی تھی۔ اُس کو اختری (اُس کے خیال سے مفت خوری) کا خرچ فضول معلوم ہوتا تھا۔ اُس کو باپ کی تباہی کا قلق تھا وہ سمجھتی تھی کہ باپ کی تباہی کا سبب اختری ہے۔ باپ کے بیہوش ہوتے ہی اُس کی رائے میں اختری کے ساتھ رعایت کرنا گناہ تھا۔ جب سے اُس کو معلوم ہوا کہ معاملہ برعکس ہے بلکہ اُن کے والد خود اختری کے دستِ نگر ہیں وہ اختری کے مطیع بن کے رہنا پسند کرتی تھی بجا حکومت پرائے مال پر اپنا تصرف ناجائز خیال کرتی تھی وہ اپنی حالت پر بہت جلد راضی ہو گئی۔ وہ اس حال میں اپنی تقدیر پر شاکر تھی۔ اُس کے چال چلن میں صرف ایک

بات اخلاق کے خلاف تھی یعنی مراد علی سے ساز کر کے اختری کی حالت کی تفتیش اُسکی ماں کی خبر یہ مراد علی کو بھیجنا، مگر جعفری کوئی فرشتہ نہ تھی کہ اُس کی زندگی لغزشوں سے پاک ہوتی ایک چھپے ہوئے بھید کے کھلنے ایک پہیلی کے بوجھنے ایک معمے کے حل کرنے کا کس کو شوق نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسا معمہ جس میں اُس کے نزدیک اُس کے باپ کا روپیہ برباد ہو رہا تھا۔ نادری اختری سے ہل کے اچھی رہی اختری بھی اُس سے خوش رہی اور خورشید مرزا بھی۔ جعفری اپنے کھرے پن کی وجہ سے اختری سے بھی بُری ہوئی اور باپ سے بھی۔ آخرکار اُس کو اختری کے ماتحت ہو کے زندگی بسر کرنا پڑی۔ اختری اُس سے صاف تھی۔ مگر اختری کی صفائی کی اُس کو پروا نہ تھی۔ باپ کا دل کبھی صاف نہ ہوا۔ یہ جعفری کی تقدیر کہ اُس نے باپ کی خیرخواہی میں یہ ذلت برداشت کی مگر وہ اُس سے خفا ہی رہی۔

نواب مرزا کے دونوں بچوں کو نادری اور اختری نے بڑی خاطرداری سے رکھا۔ چار چار جوڑے کپڑے بنا دیئے۔ کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی پیسے اٹھانے کے ملتے تھے۔ لڑکے اچھی طرح ہل گئے۔

اختری۔ تم ہمارے پاس رہوگے؟

لڑکے۔ اس خاطرداری سے اُن کو کبھی بُرا خیال پیدا ہوتا تھا۔ کیوں کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کا سن و سال تھا بہت ناسمجھ نہ تھے۔ اُن کے خیال میں یہ خاطرداری نہ آتی تھی کہ ماں باپ کے ہوتے ہم کیوں یہاں رہنے لگے۔

اختری پہلے تو اس خیال کو نہ سمجھی تھی جب اُس نے اُن کو یہاں رہنے کا ذکر سُن کے بسورتے دیکھا تو فوراً اُس کی سمجھ میں آگیا۔ ہائے بن ماں باپ کا ہونا کس قدر بلائے عظیم ہے اس راحت و آرام کی ہرگز ان بچوں کو پروا نہیں ہے یہ سمجھ کے اختری نے یہ بُرا خیال بچوں کے دل سے دُور کیا اب وہ اُن کے ماں باپ کے

آنے کا اکثر ذکر کرنے لگی اس تذکرہ سے بچے بہت خوش ہوتے تھے۔
خط کا انتظار تھا۔ بمبئی سے چوتھے دن خط آتا ہے ابھی تو یہ لوگ پہنچے ہونگے۔
ساتویں دن ان لوگوں کے بخیر و عافیت پہنچنے کا خط آیا۔ نواب مرزا کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے خدانخواستہ جان کا خوف ہو۔ زخم گہرے تھے۔ اب حالت اچھی ہے ابھی بات کرنے کی طاقت نہیں ہے نہ ڈاکٹر کی اجازت ہے کہ کوئی بات کرے، مراد علی گرفتار ہے۔ رحیم بخش اور شرفو کا حلیہ جاری ہے۔ بوٹن کی ماں بھی بمبئی میں بیٹی سے ملنے کو آگئی ہیں۔ بوٹن کا اظہار ہوا تھا وہ سخت انکار کرتی ہے، مراد علی نے ہرگز نہیں مارا۔ سب سمجھاتے ہیں، پولیس دھمکی دیتی ہے مگر وہ یہی کہے جاتی ہے کہ مراد علی" نے نہیں مارا اُس نے پولیس میں بھی یہی اظہار دیا اور ہم لوگوں سے بھی یہی کہتی ہے مگر اُس کی بات کا کسی کو یقین نہیں ہے، مراد علی پر جرم ثابت ہے۔ ضرور سخت سزا ہوگی۔ بوٹن کی حالت پر سب کو سخت افسوس ہے۔ اور غصہ بھی آتا ہے۔
نواب خورشید مرزا۔ حکیم جعفر علی۔ امام علی خدمت گار اور رہرقزی یہ سب بمبئی میں قریب ۴ بجے پہنچے، حکیم جعفر علی پہلے نواب مرزا کو دیکھنے کے مشتاق تھے مگر معلوم ہوا کہ بغیر اطلاع اور اجازت ڈاکٹر صاحب کے ملنا غیر ممکن ہوگا۔ پولیس کے ذریعہ سے بوٹن کا پتہ ملا، حکیم جعفر علی نواب مرزا کی بیوی کو ڈھونڈھنے نکلے یہ آٹھ دن پہلے بمبئی میں پہنچ گئی تھیں۔ پولیس اسپتال کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں پہلے اتری تھیں وہاں جا کے معلوم ہوا کہ پولیس نے اُن کو شوہر کے پاس ٹھہرنے کی اجازت دیدی ہے مگر چونکہ مقدمہ سنگین ہے اس لئے بلا اجازت ڈاکٹر صاحب اُن سے بھی ملنا محال ہے۔ حکیم جعفر علی لکھنؤ کے سول سرجن کی ایک چھٹی لیتے گئے تھے اس میں ان کے اعزاز اور پیشہ طبابت کا ذکر تھا۔ یہ چھٹی بہت کام آئی۔ اُس دن شب کو ملنا نہ ہو سکا مگر دوسرے دن آٹھ بجے یہ پولیس اسپتال میں جا پہنچ گئے نو بجے

تک ڈاکٹر کا انتظار کرنا پڑا۔ نو بجے ان کو زخمی مریض کے پاس جانے کی اجازت ہوئی۔ حکیم صاحب کی خبر سُن کے کمرہ کے دروازہ کے پاس آئیں۔

نواب مرزا کی بیوی۔ آج تو آنکھ کھولی ہے مجھکو پہچانا، مگر ڈاکٹر کا حکم بات کرنیکا نہیں ہے۔

حکیم صاحب۔ آپ ذرا پردہ کر لیجئے میں ڈاکٹر کی اجازت سے آیا ہوں۔

نواب مرزا کی بیوی۔ آپ بھی تو حکیم ہیں۔ اچھا میں ہٹی جاتی ہوں، یہ کہہ کے نواب مرزا کی بیوی گوشہ میں بیٹھ گئیں، حکیم صاحب اندر گئے۔

حکیم صاحب کو نواب مرزا نے فوراً پہچانا۔ حکیم صاحب نے زخم دیکھے ایک زخم بائیں گال پر تھا۔ ایک ماتھے پر، سر دو جگہ سے کھُل گیا تھا، نواب مرزا کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ کہاں وہ وجاہت مُنہ پر ایک جھری نہ تھی کسرتی بدن تھا بالکل ضعیف ہو گئے۔ خون سیروں بہہ گیا۔ بڈھوں کا سا مُنہ ہو گیا۔ کلے پچکے ہوئے عجب حالت تھی۔ مگر یہی شکر ہے کہ جان بچ گئی زندگی ہے تو پھر توانا ہو جائیں گے یہ کس کو یقین تھا کہ زندہ دیکھیں گے۔ ظالم نے قتل کا ارادہ کیا تھا۔

حکیم صاحب۔ نواب مرزا صاحب آپ پر بڑا ستم ہوا۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ کے اہل و عیال پہ اللہ نے رحم کیا۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ بہت جلد صحیح و سالم ہو جائیں گے۔ خورشید مرزا صاحب بھی آئے ہیں کل شاید آپ کے دیکھنے کو آئیں گے۔

نواب مرزا۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد تیورا آتا ہے سر میں درد ہے مگر خفیف ضعف بہت ہے۔

حکیم صاحب۔ آپ کی ہمت تو یہی چاہتی ہے کہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں مگر ابھی شاید ایک ہفتہ تک آپ پلنگ سے اُٹھنے کے قابل نہیں ہوں گے اور ہوں بھی تو حرکت

کرنا مُناسب نہیں ہے خدانخواستہ زخموں نے خون دے دیا تو نقصان پہنچیگا، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ملزم حوالات میں ہے۔

نواب مرزا۔ (نہایت افسوس کے ساتھ) جی ہاں معلوم ہوا۔ مگر حکیم صاحب آپ سعی کریں کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ یقیناً مجنون ہے اور شریعت بھی مجنون مرفوع القلم ہے۔ قانون کا بھی یہی منشا ہے۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہر کے سب میری محنت رائگاں ہوئی، مرآد علی فرار ہو گیا۔

حکیم صاحب۔ (متعجب ہو کے) مرآد علی تو گرفتار ہے اُسی نے تو آپ کے قتل کا قصد کیا ہے، یہ آپ مجنون کس کو بتا رہے ہیں۔

نواب مرزا۔ (چونک کے۔ نہایت جوش کے ساتھ جس سے حکیم صاحب کو خوف ہوا کہ زخم نہ پھٹ جائیں، گویا اُٹھنے کا قصد تھا، حکیم صاحب نے زور سے ہاتھ پکڑ کے روکا) نہیں میں اُٹھوں گا نہیں، مگر آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ مرآد علی کو چور بدمعاش جو جی چاہے کہیئے اور وہ سخت سزا کا مستوجب ہے مگر اس جُرم سے اُس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھکو اُس نے نہیں مارا۔

حکیم صاحب کو یقین نہ ہوا، معلوم ہوا بچانا چاہتے ہیں۔ اچھا تو ہوا کیا؟

نواب مرزا۔ میں اُس منحوس ہوٹل کے روکار کا نقشہ بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص اجنبی جس کو میں نے عمر بھر نہیں دیکھا تھا آکے دفعتہً مجھ پر برس پڑا۔ ایک لوہا لگا ڈنڈا اُس کے ہاتھ میں تھا جب تک سنبھالوں تین چار ڈنڈ پڑ گئے۔

حکیم صاحب۔ ممکن ہے کہ مرآد علی بھیس بدل کے آیا ہو۔ کسی اور آپ سے کیا سروکار تھا۔

نواب مرزا۔ مرآد علی ہرگز نہیں تھا وہ کسی بھیس میں ہوتا میں اُس کو پہچان لیتا۔ مرآد علی جوان ہے۔ وہ شخص جس نے مجھکو مارا ہے بوڑھا تھا۔ میانہ قد سے

کچھ ہی کم - سر کے بال سفید بہت چھوٹے جیسے آٹھ دن سر منڈانے کے بعد ہوتے ہیں - چہرہ گورا سرخی لئے ہوئے، میں نے اسکو اچھی طرح دیکھا جیسے اسوقت آپ کو دیکھ رہا ہوں، واقعی مجھ سے اسکو کوئی غرض نہ تھی - میں کہتا ہوں، وہ دیوانہ تھا -

حکیم صاحب - (کو اب تک یقین نہیں ہوتا، نواب مرزا نے اپنی جوانمردی سے مراد علی کو بچانے کے لئے، یہ حکایت تصنیف کی ہے)، جناب میرے سمجھ میں یہ بات نہیں آتی -

نواب مرزا - میں خود حیران ہوں - میں بیٹھا نقشہ بنا رہا تھا - اتنے میں وہ شخص آیا پہلے کچھ بڑبڑایا جس کو میں نہیں سمجھا، پھر کچھ ماں بہن جورو کا ذکر کیا یہ بھی میرے فہم میں نہیں آیا میں نقشہ بنانے میں ایسا محو تھا کہ میں نے بالکل توجہ نہیں کی، نہیں کچھ جواب دیا جس سے وہ ٹل جائے اس نے ایک ڈنڈا رسید کیا جو میرے منہ پر پڑا ابھی اس ضرب سے میں سنبھلا نہ تھا کہ دوسرا سر پر جمایا - میں نے ہاتھ بڑھا کے روکنا چاہا مگر اب میں تیورا گیا تھا - شاید اس حالت میں اس نے ایک اور وار کیا - میں بیہوش ہو چکا تھا - پھر خدا جانے کیا ہوا - آپ کہیں گے کہ مار کھایا کئے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا - اول تو میں نہتا تھا، دوسرے بے خبر، تیسرے وہ کھڑا تھا - میں بیٹھا ہوا تھا، اس کا پورا وار مجھ پر پڑ سکتا تھا جب تک اٹھوں اٹھوں وہ اپنا کام کر چکا - مجھ سے بہت بوڑھا تھا - مگر آدمی گٹھیلا اور کثرتی معلوم ہوتا تھا اگر دونوں ایک حالت میں ہوتے تو شاید وہ مجھ سے نہ جیت پاتا -

حکیم صاحب - (بالکل حیرت میں تھے مگر نواب مرزا کی انداز تقریر سے معلوم ہو گیا کہ بیان واقع ہے یا کم از کم جو یہ سمجھے وہی بیان کرتے ہیں جان بوجھ کے غلط بیانی کا شبہ دور ہو گیا) اچھا مانا کہ مراد علی بے قصور ہے - پھر کیا کیا جائے، آپ

وہی گرفتار ہے۔ حتی الوسع اِس الزام سے بچانے کی کوشش کی جائے گی، مگر سرکار مدعی ہے۔

نواب مرزا۔ گرفتاری تو بے جا نہیں ہے معاملات صاف ہوجائیں گے خیر ہماری آپ کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ اور بھی کچھ سُنا آپ نے مراد علی سے مصالحت پر میں راضی ہوگیا تھا۔ اگرچہ یہ رعایت مراد علی کی ذات سے نہ تھی، اُس کی جورو کے رونے پر مجھ کو ترس آگیا۔ بہت کم سن کسی شریف کی لڑکی ہے۔ افسوس!

حکیم صاحب۔ تو کیا اُس کی جورو نے آپ سے اپنے شوہر کی سفارش کی تھی؟

نواب مرزا۔ جی ہاں، اُسی کی وجہ سے میری یہ گت ہوئی۔ نہیں تو میں مراد علی کو مع مال مسروقہ لکھنؤ گھسیٹ کے لیجاتا۔

حکیم صاحب۔ لکھنؤ سے اُس کے فرار ہونے کی آپ کو اطلاع ہوگئی تھی، اور یہ بھی معلوم تھا کہ مال لے کے بھاگا ہے۔

نواب مرزا۔ میں نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا سایہ کی طرح ساتھ رہا۔ لکھنؤ میں اُس نے مجھ کو خوب جھکائیاں دیں۔ میں بھی سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے رہا۔ پہلے تو اُس کو میرا حال معلوم نہ ہوا۔ پھر اُس نے مجھ کو دیکھ لیا کہ یہ میری ٹوہ میں ہیں، دو تین مرتبہ نوبت گفتگو کی بھی آئی مار پیٹ ہوتے ہوتے رہ گئی میں تو چاہتا تھا کہ فوجداری ہوجائے تو کُل حال کُھل جائے گا، مگر وہ بڑا ہوشیار ہے اس کی نوبت اُس نے خود نہ آنے دی، ایک دن کا واقعہ سُنئے۔

یہ مہاجن کی کوٹھی کی طرف جھپٹا ہوا چلا جاتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا، وہاں سے نکل کے مجھے خیال ہوا شاید نواب خورشید مرزا کے مکان کی طرف معافی خواہی کی ہوا جائے اُس نے کالکوں سے چوک کا راستہ لیا پھر چھنگا مل کی کوٹھی میں گیا پھر اور دو مہاجنوں کی کوٹھی میں گیا جن کو میں نہیں جانتا۔

حکیم صاحب۔ جہاں جہاں نواب صاحب کی دھر دو رہتی اس کو سب کو معلوم تھا۔ اسی دن اُس نے سب نوٹ اور جواہرات قابو میں کئے تھے۔

نواب مرزا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ افسوس خورشید مرزا صاحب سے مجھ سے تعارف نہ تھا۔ ورنہ فوراً اُن کے پاس جاکے اطلاع کرتا۔

حکیم صاحب۔ تو کیا ہوتا، نواب صاحب کو وہ سمجھا دیتا کہ مجھے خوف ہے کہ مہاجن دیوالیہ نہ ہو جائیں۔ اس لئے آپ کا مال نکال لیا، نواب صاحب اُس کے کہنے میں تھے، ہاں پھر کیا ہوا۔ آپ کی بات رہی جاتی ہے۔

نواب مرزا۔ یہ اپنے گھر کی طرف چلا، آپ کو معلوم ہے کہاں رہتا تھا۔

حکیم صاحب۔ وہی اپنے چچا کے مکان میں گھڑیالی کے پاس۔

نواب مرزا۔ جی نہیں اُس نے وہ مکان چھوڑ دیا تھا، اب ایلچی خاں کے کے میدان کے قریب تنگ و تاریک گلیوں میں اُس نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا بڑی مشکل سے پتہ لگا، غرض یہ مکان میں گھس گیا، میں باہر ٹھہرا رہا۔ مجھے خیال تھا کہ یہ فرار ہونا چاہتا ہے اس لئے کہ سب مال، میری رائے میں اس کے قبضہ میں تھا اب ٹھہرنے میں اندیشہ تھا۔ میری رائے غلط نہ تھی یہی واقعہ تھا۔ جب یہ چپاٹل کی دوکان سے نکلا ہے اس کے پاس ایک چھوٹا صندوقچہ تھا۔ چوک میں آکے اُس نے کہ مجہ کا بیگ لیا۔ جس میں کنجی قفل ہوتا ہے۔ شاید دس بارہ روپے کو آتا ہے خرید کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ویسے ہی ایک بیگ کی قیمت دریافت کی معلوم ہوا ایک بیگ بارہ روپیہ کو بکا ہے، دوسرا اُسی کے جوڑ کا تھا۔ یہ مکان سے نہ نکلا، میں نے پانچ بجے تک انتظار کیا، سخت پریشان تھا، سردی کا موسم تھا۔ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا۔ گلی میں تاریکی ہو گئی تھی۔ میں نے مارے سردی کے جیبوں میں ہاتھ ڈال لئے۔ چھتری بھی پاس نہ تھی، کوٹ کا کالر پلٹ لیا۔ اب

رات ہوگئی۔ ساڑھے ۶ بجے گھر کا دروازہ کھلا۔ مرادعلی تو نہیں نکلا ایک لونڈا کالا سا ہاتھ میں چلم لئے شاید آگ کی تلاش میں نکلا۔ میں نے دریافت کیا کہ منشی جی کیا کرتے ہیں۔ اُس لڑکے نے کہا وہ گئے بھی۔

اَب میں سخت حیران ہوا آخر جلد جلد قدم بڑھا کے سڑک پر آیا دیکھا ایک یکہ پر سوار ہو رہا ہے۔ میں بھی اُسی یکہ پر جا بیٹھا، اب ہم دونوں چپکے بیٹھے، گویا ایک دوسرے سے کوئی مطلب نہیں۔ اکہ وکٹوریہ گنج کی سڑک سے اسٹیشن پہونچا، یہاں میں نے اُس کو خورشید مرزا کے مکان پر چلنے کو مجبور کیا آخر اُس کو پلٹنا پڑا، اسٹیشن سے سیدھا چلا آیا مگر نخاس کے پُل پر آکے اکہ سے کود پڑا۔ اُس کے اُترنے کے تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اکہ والے کو کرایہ دے کے اُترا۔ پھر دوڑ کے اس کا پیچھا کیا، یہ پھر اپنے مکان پر آیا۔ اَب یہ گھر میں گھس گیا۔ مکان میں جاتے وقت اُس نے اتنا کہا آپ بیکار میرے پیچھے پڑگئے ہیں۔ اچھا اب میں آپ کے ساتھ چلوں گا جہاں جی چاہے چلئے مگر تھوڑی دیر اس گلی میں چہل قدمی کیجئے۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔ مگر یہ مجھ کو پہلی مرتبہ خیال نہیں آیا تھا کہ جس مکان میں یہ رہتا ہے اس کا دوسرا دروازہ پچھواڑے ہے۔ اَب میں نے بڑی دیر انتظار کیا، آخر دروازے پر آواز دی، وہی کالا سا لونڈا نکلا۔ آپ کس کو پوچھتے ہیں، میں نے کہا منشی جی کو۔ لونڈا۔ کون منشی جی؟ میں سخت برہم ہو کے مرادعلی کو اور کس کو۔ لونڈا اوہ گئے بھی۔

ئیں، کہیں نہیں مر گئے میرے سامنے مکان میں گئے تھے جب سے میں یہیں کھڑا ہوں۔

آپ خود آکے گھر میں دیکھ لیجئے، دوسرے دروازہ سے چلے گئے۔ میں مکان کے اندر تو نہیں گیا۔ اِس لئے کہ پرائے مکان میں بلا اجازت جانا اچھا نہ تھا،

مکان بھی دشمن کا مگر دوسری طرف سے جا کے دوسرا اور دروازہ دیکھ لیا۔ اپنی غلطی پر سخت افسوس کیا، مگر کیا کرتا مجبور تھا۔ پھر میں نے سڑک پر آکے اسٹیشن کا قصد کیا، مینہ برس رہا تھا اور سخت مشکل سے ملا۔ غرض اسٹیشن عین وقت پر پہنچا۔ اگر دو منٹ اور نہ پہنچتا تو پھر مراد علی کا سراغ نہ ملتا۔ آخر اسی کے ساتھ ساتھ میں بمبئی تک آیا یہاں یہ آفت ہوئی، ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ وہ بیگ جس میں مال تھا میں نے قابو میں کر لیا تھا۔ میرے بے ہوش ہونے کے بعد خدا جانے کیا ہوا۔

حکیم صاحب، واقعی آپ نے سخت تکلیف اٹھائی، اختری کو آپ کے زخمی ہونے کا سخت صدمہ ہے۔ مجھ کو روزانہ تار دینے کو کہا تھا۔ اب آپ سے رخصت ہو کے جاتا ہوں تار دیتا ہوں۔ خدا حافظ۔

# باب ۲۶

حکیم صاحب نے تار دیا، پھر ہوٹل میں آئے، خورشید مرزا مرآد علی سے ملنے کے لئے حوالات گئے تھے، ایک بارسٹر کو ساتھ لے لیا تھا، مرآد علی نے اُس بیگ سے بہت سا مال علیحدہ کر کے اپنے منی بیگ میں رکھ لیا تھا، گرفتاری کے وقت وہ بھی لے لیا گیا تھا۔ نواب مرزا کے پاس جو بیگ تھا وہ بھی پولیس کی حفاظت میں تھا۔ یہ سب عدالت سے خورشید مرزا کو دیدیا۔ مرآد علی نے خیانت مجرمانہ کی سزا سے بچنے کے لئے بخوشی کل مال حوالہ کیا، صرف ہزار روپیہ ذات خاص کے خورشید مرزا نے واپس دیئے وہ بھی پولیس کی حفاظت میں رکھے گئے، بوٹن حوالات کے قریب ایک کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بڑی مشکل سے پتہ لگا کے پہنچے ہرمزی کے آنے کا حال بیان کیا اُس نے جانے سے انکار کیا۔ آخر ہرمزی بوٹن کی ماں کو جواب ہرمزی کے ساتھ تھیں لے کے بوٹن کے پاس گئیں، آخر ماں جلکے لپٹ گئی۔ ہائے بچی یہ تو نے کیا اندھیر کیا، ارے ہم نے کس محنت سے پالا پرورش کیا کم بخت تجھکو کچھہ بھی خوفِ خدا نہ ہوا۔ باپ ایسا چاہنے والا باپ جو صورت دیکھ کے جیتا تھا۔ تو نے جیتے جی مار ڈالا، آئے تو ہیں خدا جانے کہاں مارے مارے پھرتے ہوں گے وہ اپنے ہوش ہی میں نہیں ہیں۔

بوٹن کے منہ میں جواب نہ تھا۔ سوائے رو دینے کے۔

ماں۔ ارے ایک اُچکے چور بدمعاش جس کو نہ چوری کرتے دیر لگی نہ ایک

غریب کو مار ڈالنے میں کوئی کسر رکھی۔

بوٹن۔ یا تو رو رہی تھی یا فوراً، اماں چور یا بدمعاش جو جی چاہے کہو مگر اُس نے مارا نہیں۔ اس مقدمہ میں وہ بالکل بے قصور ہے۔

ہرمزی۔ اب تو اُس پر ثابت ہے اور کون ہوتا۔ ممانی آپ کو کیوں کر خبر ہوئی۔

بوٹن۔ بیٹی بُری بات کہیں چھپی رہتی ہے۔ پہلے میں لکھنؤ آئی تھی، اسٹیشن سے نکل کے ایک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی رو رہی تھی۔ اتنے میں ایک مسافر وہیں آکے کھڑا ہوا اُس نے حال پوچھا، میں اس سے کہہ رہی تھی۔ ایک ریل کا قلی وہیں آکے چلم پینے لگا۔ وہ چپکا سُنا کیا، پھر چلا گیا۔ کنوئیں کی جگت کے پاس ایک عورت اوڑھے لپیٹے بیٹھی تھی، میں نے اُس کی شکل نہیں دیکھی۔ مجھ میں اتنے حواس کہاں تھے قلی اُس عورت سے کچھ باتیں کرتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا اُس عورت نے بٹوے سے کچھ نکال کے قلی کو دیا اور وہاں سے اُٹھ کے چلی گئی اور وہ مسافر جو میرے پاس کھڑا تھا وہ بھی اُسی طرف کو چلا گیا۔ قلی اُن کے جانے کے بڑی دیر کے بعد آیا مجھ سے کہا بڑی بی تمہاری بیٹی بمبئی گئی ہے۔ ایک مرد اُس کے ساتھ ہے اب میں نے اندازہ کیا کہ ہو نہ ہو وہ شرفو ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کٹنی یہاں بیٹھی ہے نہیں تو موئی کو فوراً گرفتار کرا دیتی۔ وہ بھی اُس سے کچھ لے مرا ہوگا اُس سے، جب وہ چلی گئی جب مجھ کو خبر دی، آخر میں بمبئی کا ٹکٹ لے کے یہاں پہنچ گئی۔ بڑی مشکل سے تم لوگوں کا پتہ ملا۔ بوٹن کے باپ پہلے ہی لکھنؤ آئے تھے آخر میری مامتا نے نہ مانا میں بھی چل کھڑی ہوئی۔

حکیم صاحب۔ دروازہ کے قریب یہ سب بیٹھے سُن رہے تھے۔ آخر اُن کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ فوراً بوٹن کی ماں سے پوچھا ذرا مجھ سے اپنے شوہر کا

حلیہ تو بیان کیجئے شاید میں تلاش کر سکوں، بوٹن کی ماں نے بیان کیا، گورے ہیں سرخ وسفید رنگ ہے، قد کے بہت لمبے نہیں ہیں، بہت ٹھگنے بھی نہیں ہیں۔

حکیم صاحب۔ نواب مرزا نے یہی صورت بیان کی تھی یہ اور آفت ہوئی۔ ضرور سزا ہو جائے گی، بیٹی کا صدمہ ایک طرف ایک شریف آدمی دوسری بلا میں مبتلا ہوئے۔ غصہ میں کچھ خیال نہ آیا اچھی طرح دریافت نہ کیا۔

حکیم صاحب۔ بوٹن سے اچھا ذرا اتنا تو بتا دو نواب مرزا صاحب سے تم سے کہاں باتیں ہوئی تھیں۔

بوٹن۔ ذرا جھجک کے شاید اس کا خیال بھی اصل واقعہ کی طرف فوراً پہنچ گیا نواب مرزا صاحب ہوٹل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے میں بھی موقع پا کے وہیں چلی گئی تھی۔ وہ بیچارے بڑے نیک آدمی ہیں جو میں نے کہا فوراً مان لیا۔

حکیم صاحب۔ بس مجھے اتنا ہی دریافت کرنا تھا، سخت مشکل کا سامنا ہے۔

ہرمزی۔ ابھی تک تو یہی سمجھ رہی تھی کہ بوٹن مراد علی کو بچانے کے لئے جھوٹ کہہ رہی ہے کہ وہ بے گناہ ہے مگر اب اصل واقعہ کی طرف اُس کا بھی خیال رجوع ہوا۔

بوٹن کی ماں فوراً بات کی تہ کو پہنچ گئی، سر پیٹ کے، ہے کم بخت پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ جہاں اور چار کو رو پیٹ کے بیٹھ رہی تھی اس کو بھی رو لیتی۔ اس ضعیفی میں باپ کو کس آفت میں ڈالا۔

حکیم صاحب۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ نواب مرزا کو آپ نہیں جانتیں وہ فوراً راضی نامہ دیدیں گے، ہر طرح کی رعایت کی جائے گی۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ سرکار مدعی ہے۔ خیر جو کچھ ہو سکے گا کیا جائے گا۔

حکیم صاحب۔ ان سب کو ہوٹل میں لے گئے۔ خورشید مرزا صاحب بھی آ گئے تھے، اُنھوں نے بیان کیا کہ مراد علی نے کُل کاغذات نوٹ زیور جواہر سب حوالہ

کر دیا۔ کر ہی کیا سکتا تھا۔ اُس کا ہزار روپیہ سرکار میں محفوظ ہے۔

حکیم صاحب۔ لیکن اس مقدمہ میں کیا ہوگا۔

خورشید مرزا۔ (ابھی بوٹن کے واقعات سے بے خبر تھے، مراد علی اس جرم سے انکار کرتا ہے مگر شہادت اُس کے خلاف ہے۔ ہوٹل کے آدمی نے گلا گھونٹتے دیکھا ہے۔ کئی بار نواب مرزا میں اور مراد علی میں سخت گفتگو ہو چکی تھی اس کی بھی شہادت ہے۔ بیگ نواب مرزا نے چھین لیا تھا وہ اُن کے اسباب سے نکلا، کنجی مراد علی کے جیب سے نکلی۔ عدالت کو پورا واقعہ تو معلوم نہیں مگر یہ قیاس کیا گیا ہے کہ معاملات زر کی تکرار تھی۔ اُس عورت کو جس کا نام بوٹن ہے نواب مرزا سے باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔ غرضکہ یہ سب واقعات سے نواب مرزا اور مراد علی میں خصومت کا ثبوت ملتا ہے۔ مراد علی کو سخت سزا ہو گی۔ میری شہادت کی بھی نوبت آئے گی، ان سب عورتوں کی شہادت ہو گی۔ کوئی صاحب محسن علی بھی ہیں، ان واقعات کے سلسلہ میں کل شام سے گرفتار ہیں۔

حکیم صاحب۔ گھبرا کے محسن علی گرفتار ہو گئے۔

خورشید مرزا۔ کیا آپ محسن علی کو جانتے ہیں؟

حکیم صاحب۔ محسن علی ہرمزی کے ماموں ہیں۔

خورشید مرزا۔ اُن سے کیا واسطہ۔ ہاں اب میں سمجھا یہ بوٹن اُنھیں کی صاحبزادی ہیں۔

بوٹن کی ماں۔ حضور ہاں اس نامراد بیٹی کی بدنصیب باپ وہی ہیں۔ دیکھئے بڑھاپے میں کیا قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔

خورشید مرزا۔ سخت افسوس کر کے، آپ خاطر جمع رکھئے نواب مرزا کا راضی نامہ ہو جائے گا۔ میں بارسٹر سے کرا دوں گا، ہر طرح اُن کے بچانے کی کوشش

کی جائے گی، مگر کیا کیا جائے، اس معاملہ میں مشکل ہی مشکل ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ یہ بھی مراد علی کی حرکت ہے مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم میں وہ بےقصور ہے، میں تو کہتا ہوں وہ کم بخت پھنس جاتا تو خوب ہوتا۔

حکیم صاحب۔ مگر ناکردہ گناہ کو سزا دلوانا بھی تو خلاف انصاف ہے خواہ کیسا ہی بدمعاش ہو۔

خورشید مرزا۔ یہ درست ہے تو پھر محسن علی صاحب کا بچنا محال ہے کیونکہ سرکار مدعی ہے۔ نواب مرزا کے راضی نامہ سے جرم خفیف ضرور ہو جائے گا۔

محسن علی کی رہائی کے لیے پوری کوشش کی گئی، نواب مرزا نے راضی نامہ داخل کر دیا، بارسٹر نے جملہ واقعات پوست کندہ بیان کیے، جوان لڑکی کا فرار ہونا، عالی خاندانی عزت چال چلن یہ سب کہا گیا، فوری جنون کے دورہ پر بڑی بحث ہوئی، مگر سرکار مدعی قتل انسان مستلزم سزا۔ آخر کار قرار داد جرم پر میعاد چھ ماہ قید با مشقت یا پانسو جرمانہ۔ جرمانہ کی رقم خورشید مرزا نے ادا کی۔ اپیل کی تجویز ہوئی مگر وکلا نے کہا کہ سزا بالکل کم دی گئی ہے۔ ایسا نہ ہو اپیل سے اور بڑھ جائے پھر جیل میں ریشہ دوانی ہوئی۔ آخر اسپتال میں لے گئے۔ اب بمبئی میں آئے ہوئے ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ لکھنؤ کی واپسی پر مشورہ ہوا۔

بوٹن کو سب نے سمجھایا کہ ماں کے ساتھ گھر چلی جائے مگر اس بدنصیب لڑکی نے کسی کی نہ سنی ایک زبان وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ اب تو جو کچھ میری تقدیر کا لکھا تھا پورا ہوا۔ اب میں ہرگز گھر نہ جاؤں گی آخر سب نے مجبور ہو کے اس کو اس کی تقدیر پر چھوڑا۔ نواب مرزا نے جو وعدہ ہزار روپیہ کا اس سے کیا تھا خورشید مرزا اگرچہ اس کے خلاف تھے مگر جب انھوں نے نواب مرزا کو اپنے پاس سے دینے پر آمادہ پایا، کچھ روپیہ اُن کے پاس تھا باقی کے لئے بیوی کا زیور گرو دی

کرنے کے لئے موسیٰ بھائی سے بات چیت کی، موسیٰ بھائی بلا رہن زیور ہزار روپیہ قرض دینے کو آمادہ ہو گئے۔ نواب مرزا کی جواں مردی اور مروّت کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا تھا۔ خورشید مرزا نے بخوشی ہزار روپئے دے دئے۔

بوٹن کی رخصتی قیامت کا سامنا تھا ہرمزجی نواب مرزا کی بیوی سب سمجھا کے تھک گئے۔ ماں چیخیں مار مار رو رہی ہیں۔ سب سے مل کے نہایت بے پروائی کے ساتھ جہاز میں سوار ہو گئی، جہاز میں جا کے وطن ماں باپ کی عزت عزیز کنبہ کی جدائی کا خیال آیا ایک کونہ میں جہاز کے منہ چھپا کے بیٹھ رہی۔ جہاز کا لنگر اٹھا سب ہوٹل کو واپس آئے کوئی بوٹن کو برا کہہ رہا ہے، کیسے کڑے دل کی ہے نہ باپ کی قید کا خیال نہ ماں کے رونے پیٹنے کا۔ مگر اُس کے چلتے چلتے یہی کلام تھا کہ اب تو جو قسمت میں لکھا تھا پورا ہو کر کے چھوڑ دینا بہت برا ہے۔ اس کے بعد سُنا گیا کہ بوٹن پر سخت مصیبتیں گذریں، مراد علی نے چھوڑا تو نہیں مگر ناداری ایسی تھی کہ صبح سے شام تک دشواری سے پیٹ بھر کے کھانے کو ملتا تھا۔ مگر وہ اپنی قسمت پر شاکر رہی اور وطن کا رُخ نہ کیا۔ بُری ہو یا بھلی بات کی سچی اور قول کی پوری تھی۔

ماں باپ کی اکلوتی دُلاری لڑکی جس کو ماں باپ کے دُلار نے تباہ کیا، کس ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ ہر بات میں اپنی ضد" باپ آنکھ دکھاتے ہیں تو اماں جان بگڑ رہی ہیں۔ "اب یہی ایک تو اندھیارے گھر کا اُجالا ہے کیا اسکو بھی مار ڈالو گے" ماں کبھی خفا ہوئیں تو باپ بیٹی کی طرف سے لڑ رہے ہیں، "دیکھو صاحب تم میری لڑکی کو کچھ نہ کہا کرو۔" کسی کا خوف اُس کے دل میں نہ تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ جو کچھ میرا جی چاہے وہی اچھا ہے کیونکہ اُس کی ہر بات کو سب اچھا ہی اچھا کہتے رہے تھے غرض دونوں نے اپنے کئے کی سزا پائی۔

خورشید مرزا، نواب مرزا، حکیم صاحب، ہاتم علی، ہرمزجی، بوٹن کی ماں، نواب مرزا

کی بیوی یہ سب لکھنؤ پہنچ گئے، اختری کے جواہرات نوٹ سب اختری کو مل گئے کیوں کہ اُس کے قانونی بلوغ میں تین مہینہ اور باقی تھے۔

بمبئی سے آنے کے بعد اختری نے ہرمزی کو اسکول کی نوکری نہ کرنے دی۔ گھر میں کام ہے تو باہر کی نوکری کیوں کرتی ہو۔ ہرمزی اس کو قبول نہ کرتی تھی مگر اختری کا ایسا ہی دباؤ سب پر تھا۔ خواہ دولت کا دباؤ ہو خواہ نیکی کا دباؤ ہو، بلکہ دونوں کو اُس کی بات کا ٹالنا دشوار تھا۔ اختری نے ہرمزی کے بارے میں ایک فیصلہ کرلیا تھا ابھی وہ مُنہ سے نہیں نکالتی تھی۔

# باب ۲۷

اختری کی دولت کا حال کھلتے ہی سینکڑوں خواہاں پیدا ہو گئے۔ سینکڑوں رقعہ خواستگاری کے لئے خورشید مرزا صاحب کے پاس آئے۔ آخر خورشید مرزا نے عندیہ لینے کو ہرمزی کی ماں کے ذریعہ سے خود اختری سے دریافت کیا اُنھوں نے نہایت بزرگانہ طریقہ سے اختری سے پوچھا، ایک دو مرتبہ تو اختری اُس بات کو ٹال کے اُٹھ گئی جب زینت بیگم نے اصرار کیا، اختری نے صاف انکار کیا۔

اختری۔ دیکھئے وہ میری اماں جان کی بات سامنے آئی نہ؟ پانچ برس سے ماموں جان کے گھر میں رہتی ہوں لوگوں کو معلوم تھا کہ میں اُن کی روٹیوں پر پڑی ہوں اُس زمانہ میں کسی کا رقعہ نہ آیا اب کیا مجھ میں شاخ زعفران ہے کہ میری شادی کے پیام روزمرہ آتے ہیں۔ میں نے سب کچھ سُنا اور تو اور خود میرے نوکروں نے مجھ سے مہمل تذکرے کئے میں نے کسی کو نرمی سے کسی کو سختی سے جواب دیدیا، مجھکو ہرگز منظور نہیں۔

زینت بیگم۔ تو کیا بیٹی زندگی بھر بیٹھی رہو گی، ہماری تو خوشی یہی ہے کہ کہیں تمہاری شادی ہوتی بال بچے ہوتے، آخر دولت ہوئی تو کیا ہوا جب اُس کا مزا نہ پایا۔

اختری۔ آپ بزرگ ہیں میں آپ کو جواب نہیں دے سکتی۔ اتنا کہتی ہوں کہ ابھی تو کسی طرح مجھے منظور نہیں ہے، پہلے بہن نادری اور جعفری کا ٹھکانا ہو جائے

ہرمزی بہن کے بارے میں تو ایک بات میرے دل میں ہے اگر اُن کی شادی کیجئے تو پہلے مجھ سے دریافت کر لیجئے گا۔

اسی زمانہ میں اختری کا ٹھاٹھ امیرانہ ہونے لگا تھا۔ عملہ بڑھایا گیا تھا۔ باہر کئی خدمتگار اور سپاہی نوکر ہوئے تھے، پہرے چوکی کا انتظام قرار واقعی کیا گیا تھا۔ اندر پیش خدمتیں، مغلانیاں، مصاحبین، چٹھی نویس، کہاریاں، باری دارنیاں، پُرانے نوکروں کی تنخواہیں بڑھائی گئیں، رحیمن محلدار ہوئیں۔ امام علی جمعدار تھے، فنس کہار غرضکہ پورا امیرانہ سامان اچھی خاصی سرکار بن گئی۔

بیگم شکار لوگوں کے منہ میں پانی بھرآتا ہے کوئی نام پر عاشق کوئی دیوانہ کوئی باہر نکلنے والے نوکروں کے ہاتھ جوڑ رہا ہے روپیہ دکھا رہا ہے۔ ہمارا پیام کوئی کہتا ہے ہماری ایک گلوری کھلادو، کوئی کہتا ہے ہمارے رقعہ کا جواب لا دو پچاس روپیہ ابھی گنوا لو۔

ان سب میں ایک بہت ہی چالاک ماما نئے نوکروں میں مسماۃ حسینی نے نام و پیام کے بہانے سے بہت سے روپے کھائے، اسی زمانہ میں ایک نوجوان عورت شہزادی چٹھی نویسوں میں نوکر ہوئی، صورت شکل کی اچھی تھی۔ اختری سے کچھ جھجک سی ملتی تھی۔ بڑی خوش مزاج بامذاق، بات بات میں شعر غزل لطیفہ گانے بجانے میں مشاق خوش گلو۔ یہ اپنی صحنچی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پاندان کھلا ہوا تھا۔ حسینی جو باہر سے آئی تو وہ بھی پان کے لالچ سے اُنھیں کے پاس جا بیٹھی، اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

چٹھی نویس۔ یہ لفافہ کس کا ہے۔

حسینی۔ کیا کہوں بیوی ایک مردوا میرے پیچھے پڑ گیا ہے کہ یہ لفافہ اپنی سرکار کو پہنچادو۔ میں نے کہا موئے کچھ شامت آئی ہے۔ ابھی سپاہیوں کو بُلا کے کہہ دوں گی

تو خاصی مرمت ہو جائے گی، موئے کٹنے ہماری سرکار کو نی کسبی خانگی ہیں جو باہر کے مردوں سے رقعہ بازی کرتی ہیں۔ مجھ سے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُدھر سے حسین علی (خدمت گار کا نام ہے) نکلے، اُنھوں نے مجھ سے آنکھ اشارہ کیا لے بھی لے، پھر اُسی مردوئے سے اور حسین علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔ وہ مردوا چلا گیا حسین علی نے مجھ سے کہا کہ لفافہ مجھ کو دیدو۔ میں نے کہا واہ میں بھی تو دیکھ لوں اسکو چھٹی نویس سے پڑھوا کے اس میں لکھا کیا ہے۔ لو یہ لفافہ کھول کے پڑھو تو ذرا ہم بھی سنوں۔ لفافہ تو بڑا پیارا ہے دیکھو کناروں پر جالی کیسی پڑی ہے اور خوشبو کیسی آتی ہے عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔

چھٹی نویس نے لفافہ کھولا۔ "خط نکلا جیسا لفافہ تھا اُسی کے جوڑ کا غذ کیسے خوبصورت کنارے سفید جیسے ہاتھی دانت کے اور کیسی خوبصورت باریک جالی کٹی تھی اگر کے عطر سے بسا ہوا تھا، دیکھو اس لفافہ کا حال کسی سے نہ کہنا دیکھنا کیسی دل لگی ہوتی ہے۔ شام کو حسین علی کی ڈیوڑھی پر بلانا ذرا اُس سے دو دو باتیں ہو جائیں۔ مردوئے اپنے کو بڑا چالاک جانتے ہیں کوئی ہم پر عاشق ہو جائے سب دولت ہم کو کھلا دے۔ یہ اختری بیگم ہیں کوئی اور چھوکری نہیں کہ جلدی سے پھسل جائے ہماری سرکار خدا رکھے ہفت زبان ہفت قلم نہیں معلوم کون کون سی بدیا پڑھی ہیں وہ کسی کے دام میں آنے والی نہیں۔ چھٹی نویس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کوئی دیکھتا نہ ہو رقعہ پڑھا۔ لکھا تھا۔

"گل گلزار خوبی بلبل شاخسار محبوبی زید حسنہا۔ جب سے آپ کے حُسن خُداداد کی تعریف سُنی ہے" نادیدہ مبتلائے عذاب ہوں نہ دن کو چین آتا ہے نہ رات کو نیند، دن رات آپ کی یاد دل میں اور آپ کا نام زبان پر رہتا ہے اگر چندے یہی حال رہا تڑپ تڑپ

کے مر جاؤں گا، آپ پر ایک بندۂ خدا کا خون ہوگا، للہ میری حالت
زار پر رحم کیجئے اور اپنا جمال جہاں آرا ایک نظر دکھا دیجئے،
میری جوانی پر ترس کھائیے اگر سخت جانی مرنے نہ دیگی کچھ کھاکے
سو رہوں گا۔ میرے تھوڑے لکھے کو بہت سمجھنا زیادہ سوائے
اشتیاق کیا لکھوں"

راقم اُمیدوار دیدار، نام درمیانی سے معلوم ہو جائیگا۔

چھٹی نولیس۔ اے ہے عاشقانہ خط لکھنے کی بھی تمیز نہیں، آپ نے دیکھا نہ بھالا آپ عاشق ہیں جان دیتے ہیں مرجائیں گے کچھہ کھا کے سو رہیں گے، بہتر ہے آپکی اماں جان کو بڑا رنج ہوگا اور کسی کی بلا کیوں رنج کرنے لگی۔

بُوا حسینی تو یہ خط سُن کے کڑھنے لگیں، چھٹی نولیس ٹھٹھے لگانے لگیں۔

بُوا حسینی۔ اے ہے بیوی تم بڑے دل کی کٹر ہو۔ اور جو سچ مُچ کھاکے سو رہے تو خون ہوا نہ؟

چھٹی نولیس۔ بُوا افیم بہت مہنگی ہے کون کھاتا ہے۔ کوئی افیمی ہوگا کسی دن ماشہ بھر زیادہ کھالے گا، مرتے ہزاروں کو سُنا جنازہ کسی کا نہ دیکھا نہ کوئی مرتا ہے نہ جیتا ہے، یہ مردوں کے فیل ہیں۔

بُوا حسینی۔ اے ہے ہنسی کی بات نہیں ہے ابھی ہمارے محلہ میں ایک نواب رہتے تھے کیسے جوان خوبصورت رنڈی سے کچھہ تکرار ہوئی ہرتال پھانک لی مر گئے۔

چھٹی نولیس۔ خوب ہوا ایسے نالائقوں کا مرنا ہی اچھا۔ خس کم جہاں پاک۔ اچھا تمہاری خاطر سے میں مرنے نہ دوں گی۔ برسوں سسکتا رکھوں گی، ذرا تُم حسین علی کو میرے پاس بلا لانا موقع دیکھ کے کوئی ڈیوڑھی پر اور نہ ہو۔

مختصر یہ کہ بُوا حسینی حسین علی خدمتگار، اور چھٹی نولیس کی ایک گٹھ ہو گئی حسین علی

نے خط کا جواب پہنچا دینے کا وعدہ کیا چھٹی نویس نے جواب لکھا۔

وصل میں تاخیر ممکن ہی نہیں،
عشق بے تاثیر ممکن ہی نہیں

"آپ کا اشتیاق نامہ دیکھ کے ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ ہنسی تو اس لئے کہ نادیدہ "گرفتاری اور بیقراری آہ و زاری اختر شماری اگر کہیں میری صورت دیکھ لی تو دشمنوں کی جان پر بنجائے گی اس لئے پردا ہی مناسب ہے افسوس اس لئے ہوا کہ خدانخواستہ اگر آپ نے رحلت کی تو ہم کو کون چاہے گا۔ آپنے لکھا ہے جی چاہتا ہے کچھ کھا کے سو رہوں، آپ کو اپنی پیاری جان کی قسم ایسا نہ کیجئے گا۔ اور اگر بالفرض یہ قصد مصمم ہو گیا ہو تو ہماری ناز برداری کے لئے کسی اور کو تجویز فرما دیجئے گا۔"

باقی اُمیدوار راقمہ وہ جس کا نام آپ کو خوب یاد ہے۔"

یہ رقعہ لکھ کے چھٹی نویس نے حسین علی خدمتگار کی معرفت عاشق زار دلِ فگار کو پہنچا دیا۔

اس رقعہ کے انعام میں دس روپیہ ملے پانچ روپیہ چھٹی نویس نے لئے تین روپیہ حسین علی کو اور دو بوا حسینی کو ملے، پہلی بوہنی ہوئی۔

منصور نگر میں حیدر بیگ خان کی حویلی کے پچھواڑے ایک اونچے ٹیلے پر پختہ مکان ہے صحن بہت وسیع ہے۔ یہ مکان کسی زمانہ میں خوب سجا سجایا قابلِ سکونت کے ہوگا بالفعل فقط آگے پیچھے دو دالان اندر کا دالان جس کی آدھی چھت متواتر برساتوں میں ٹپکتے ٹپکتے آخر آدھی گر پڑی، آدھی چھت کا پانی اسطرف گر پڑا کرتا ہے اس لئے اب تک نہیں گری آگے کے دالان کی چھت باقی ہے اور

یہی نواب گو ہر مرزا کی سکونت کا مقام ہے - اس مکان کے اور کمرے کی صحنچیاں اور کوٹھریاں سب گر پڑی ہیں - ڈیوڑھی باقی ہے اور اس میں نواب صاحب کا ملازم خاص بردار خدمت گذار دربان چوبدار بکاول غرض جو کچھ ہے یہی ہے نواب صاحب کے مصاحبین کوئی درمانہ نہیں پاتے - صرف ایک ماشہ بھر افیون روزانہ نواب صاحب کی خاص ڈبیہ سے ملجاتی ہے - یہ ڈبیہ بی چھنی جان کی بخشی ہوئی تھی مگر اب اس کا وہ قدیم اثر تو جاتا رہا ہے، لیکن پھر بھی کچھ باقی ہے - افیم جو اس میں رکھی جاتی ہے اُس میں بڑی برکت ہوتی ہے -

## چُھنی جان کی بخشی ہوئی ڈبیا

روایت ہے کہ ایک صاحب علی مرزا نامی افیون سے شوق رکھتے تھے اور آمدنی بہت قلیل تھی آخر اثاث البیت کے فروخت کی نوبت آگئی - آج ایک پتیلی گئی کل دوسری اسی طرح ایک ایک کرکے تمام تانبے کے برتن گروی ہوگئے جب بنئے کا سود زیادہ بڑھ گیا تو آخر بیچنا پڑے اب مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا پکنے لگا، کپڑوں کی نوبت آئی وہ بھی سب بک گئے آخر نوبت بایں رسید کہ ایک دن بیوی کا ایک پائجامہ باقی تھا وہ شادی مہمانی میں جانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا کچھ ایسا قیمتی نہ تھا - افیم نہ تھی گروی ہونے کو نکالا گیا، آج علی مرزا کو طیش آگیا پائجامہ چھین کے رکھ لیا اور قسم کھا بیٹھے کہ آج سے افیم نہ پیوں گا، دو تین وقت تو خیر کسی طرح گذر گئے مگر تیسرے دن بُرا حال ہوا - چارپائی پر پڑے ہیں دست جاری ہیں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے - ادوائن کاٹ دی گئی ہے - مال بہنیں قسمیں دے رہی ہیں - بیوی قدموں پر سر رکھ رہی ہیں، دوست منت کر رہے ہیں مگر یہاں ایک نہیں ہزار نہیں کسی طرح نہیں سُنتے - اب غشی کی نوبت ہے دم شماری کا عالم ہے سب نے سمجھ لیا کہ

کہ اُن کی موت اسی بہانہ لکھی تھی۔ اب کوئی دم کے مہمان ہیں۔ اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی۔

علی مرزا صاحب۔ گھر میں عورتوں نے جواب دیا کہ آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں اس کا جواب کوئی نہیں ذرا اُن کو یہاں بھیجدیجیے۔ کہا گیا کہ اُن میں باہر آنے کی طاقت نہیں ہے پھر اُس نے کہا آپ اُن کو ذرا بھیجدیجئے ارے صاحب کس کو بھیجدیں وہ اپنے ہوش میں بھی ہوں اُس نے پھر باآواز بلند پکارا۔

علی مرزا صاحب۔ اُنھوں نے غش سے آنکھیں کھول دیں۔ چارپائی سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ سب کو حیرت ہو گئی۔ اب باہر سے کسی طرح اندر نہیں آتے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا۔ آخر ایک عورت نے دروازہ کے پاس جاکے دیکھا دروازہ پر کوئی نہیں۔ علی مرزا اُس پکارنے والے کے ساتھ چلے گئے۔ سخت تعجب ہے۔

علی مرزا جب مکان سے باہر نکلے تو ایک خدمتگار باہر کھڑا تھا اُس نے کہا چلئے بُلایا ہے یہ ساتھ ہو لئے وہ اُن کو کشاں کشاں تال کٹورے کی طرف لے چلا۔ اب یہ لاحل معمہ ہے کہ اُن میں طاقت رفتار کہاں سے آگئی۔ غرض اُس کے ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔ تال کٹورے سے بہت دُور پہنچ کے ایک جنگل پڑتا ہے اس جنگل میں ایک خیمہ لگا تھا چلمنیں پڑی تھیں۔ خدمتگار نے کہا جائیے آپ سے کوئی چھپنے والا نہیں ہے خیمہ کے اندر گئے دیکھا ایک ادھیڑ سی عورت بیٹھی ہے آدھے بال سفید آدھے سیاہ موٹی سی سیاہ فام سی اور ایک نازنین دھانی ساری باندھے بسنتی دوپٹہ اوڑھے پلنگڑی پر منہ لپیٹے لیٹی ہے۔ علی مرزا کو دیکھتے ہی اُس ادھیڑ عورت نے کہا۔

واہ صاحب اسی طرح کسی سے چاہ کرتے ہیں دیکھئے اسی لئے بچاری چھوکری آپ کو منہ نہیں لگاتی تھی آپ پیچھے پڑ گئے آخر جب اُس نے منہ لگایا تو آپنے چھوڑ دیا

جاؤ صاحب ذرا اُس کا منہ کھولو، ہاتھ منہ دُھلواؤ، پان کھلواؤ۔ یہ آگے بڑھے منہ سے دوپٹہ ہٹایا دیکھا کہ جوان عورت کوئی سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ سال کا سن تھا، پری کا سا نقشہ مگر سیاہ فام، اب اُن کو معلوم ہوا کہ یہی چینی بیگم ہیں جن کو لوگ افیم کہتے ہیں۔ علی مرزا نے ہوشیار کیا قسمیں دے کے پلنگ سے اُٹھایا منہ دُھلوایا پان کھلوایا مگر اُن بڑی بی سے یہ کہا کیا کریں۔ حضت کہاں سے ان کی خاطرداری کریں، پیسہ کا تو کہیں پتہ نہیں روٹیوں کی محتاجی ہے۔ بڑی بی اچھا جو آپ سے محبت کرے گا وہ اس کا بھی خیال رکھے گا۔ ایک ڈبیہ افیون سے بھری ہوئی اُن کو دی اور یہ کہا کہ یہ لیجئے خود لیجئے، لوگوں کو پلائیے مگر ایک کام کیجئے گا، کیسی ہی ضرورت ہو تھوڑی افیم اس میں چھوڑ دیجئے گا۔ ایک خشخاش کے دانہ کے برابر یہ نہ کیجئے گا کہ کبھی بالکل خالی کر کے ڈبیہ دھو ڈالیے، نہیں تو پچھتائیے گا۔ علی مرزا کے پاس یہ ڈبیہ برسوں رہی خود بھی پیتے تھے لوگوں کو پلاتے تھے، پھر ڈبیہ بند کر کے رکھ دیتے تھے پھر جب کھولا اُسی قدر افیم موجود پائی۔ ایک دن اُن کی بیوی نے جو کھول کے ڈبیہ دیکھی اُن کو اس کی کیا خبر تھی کیونکہ علی مرزا کو کسی سے اس راز کے بیان کرنے کی اجازت نہ تھی بیوی نے ڈبیہ دھو کے رکھدی اب جو علی مرزا نے دیکھا سر پیٹ لیا ادھر بیوی بیچاری کا ٹوٹو لہو نہیں۔ ہائے میں کیا جانتی تھی، علی مرزا صاحب کے انتقال کے گوہر مرزا صاحب یہ ڈبیہ پاندان بیہ علی مرزا کی بیوی کو دے کے لے آئے تھے اب بھی اس میں اتنی تاثیر تھی کہ اس ڈبیہ میں جو افیم رکھی جاتی ہے اس میں دوگنا نشہ ہوتا تھا۔ جو دو ماشہ پیتا تھا اُس کو ایک ماشہ کفایت کرتی تھی۔ ناظرین کہیں گے کہ یہ قصہ بالکل دروغ ہے۔ ہم کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ جس طرح سُنا تھا لکھدیا دروغ بگردن راوی۔ واہمہ خلاق ہے اور افیون کا خاص اثر اس وقت یہ ہے ممکن ہے کہ اُسی کا کرشمہ ہے اور علی مرزا نے اُس حالت میں جب افیون چار پانچ دن سے

نہیں بی تھی، اس کرشمہ کا دیکھنا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے۔ جو صاحب اس کے قائل نہ ہوں کچھ دن شوق کر کے چھوڑ دیں جھوٹ سچ کھل جائے گا۔

نواب صاحب کے ہاتھ میں وہی رقعہ ہے بار بار پڑھتے ہیں اور مصاحبین کو سناتے ہیں۔

مصاحب ۱۔ (میر صاحب) واللہ نواب بڑا پڑاؤ مارا۔ لاکھوں کی دولت پائی۔

مصاحب ۲۔ (خاں صاحب) اس میں تعجب کیا ہے ہمارے نواب صاحب کیا ایسے ویسے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی فقط صورت شکل ماشاء اللہ ہزار دو ہزار میں ایک ہیں۔ ایسے طرحدار جوان دیکھنے میں آتے ہیں،

نواب صاحب کی صورت ملاحظہ ہو۔

رنگ گورا ہے مگر تن بدن میں خون کی ایک بوند نہیں۔ چہرہ کی رنگت جیسے چھپکلی کا پیٹ، سن شریف ۵۰ برس سے کچھ اوپر، گدھے کی صورت، کمر جھکی ہوئی منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ ماشاء اللہ افیون کی خوشامد حسن میں یکتا چاند میں میل ہے اور ان میں نہیں۔ یہ تعریفیں نواب صاحب سن رہے ہیں باچھیں کھلی جاتی ہیں۔

نواب صاحب۔ تو پھر اب کچھ سامان کرنا چاہیئے، داروغہ صاحب کو بلوائیے۔

داروغہ صاحب۔ (سب سے بڑھے ہوئے افیونی کمر بالکل دوہری ہو گئی ہے، پینک میں تھوڑی دیر کے بعد پیشانی زمین کے بوسے لیتی ہے جب کوئی جونکا دیتا ہے تو پھر تن کے بیٹھتے ہیں مگر ٹیڑھے ہوئے جاتے ہیں) آخر تو کیا تشریف لائیں گی؟ دعوت کے لئے پخت ہونا چاہیئے۔

نواب صاحب۔ ابھی سے نصیبن کہہ گئی ہے کہ آج سہ پہر کو سوار ہونگی، آپ بھی سوار ہو کے آئیے۔ عیش باغ موتی جھیل کے کنارے آمنا سامنا دو دو باتیں ہو جائیں گی۔

داروغہ صاحب۔ تو پھر کون سے سامان کی ضرورت ہے۔ کرایہ کی گاڑی منگوا لیجئے، میر صاحب اور خان صاحب کو ساتھ لے لیجئے چلے جایئے۔

مصاحب۲۔ (مرزا صاحب) میں ضرور ہمراہ چلوں گا۔

نواب صاحب۔ بھلا میں بغیر آپ کے کہیں جاؤں گا۔ آپ ہیں داروغہ صاحب سب صاحب چلئے دو خدمتگار ساتھ ہوں۔

داروغہ صاحب۔ تو پھر دو گاڑیاں ہوں۔

مصاحب۱۔ دو گاڑیاں کیا ہوں گی، ایک ہی گاڑی پر اُترتے چڑھتے چلے چلیں گے۔

مصاحب۲۔ واللہ کیا بات کہی ہے۔

مصاحب۳۔ یہ بھی بیل گاڑی ہے کہ اُترتے چڑھتے چلے جائیں گے۔

مصاحب۴۔ کیا خوب یاد دلایا ہے بیل گاڑی منگوا لیجئے واللہ سفر کا لطف بیل گاڑی میں ہے "سفر کیا دُور و دراز کا ہے عیش باغ امین آباد سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔

داروغہ صاحب۔ اچھا تو میں نہ جاؤں گا۔

نواب صاحب۔ نہیں واللہ، ایسا نہیں ہو سکتا۔ داروغہ کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔

داروغہ صاحب۔ نواب آپ تو سمجھتے نہیں اب کیا عرض کروں، میرے کپڑے ابھی دھوبن نہیں لائی، میلے چیکٹ ہو رہے ہیں۔ ایسے کپڑے پہن کے جانا مناسب نہیں ہے۔ آپ کی بدنامی ہے۔

مرزا صاحب۔ کھڑے گھاٹ دُھلوا لو، لے لو میں دریا جاتا ہوں اپنے بھی کپڑے دُھلوا تا لاؤں گا، اور آپ کے بھی۔

داروغہ صاحب۔ پہلے کچھہ روپیہ کا بندوبست کرنا چاہیے، تو کپڑے آپ کو دیدوں پھر مہاجن کے پاس کیوں کر جاؤں۔

نواب صاحب۔ روپیہ کی تدبیر مقدم ہے تو آپ جائیے۔ اور ہاں خوب یاد آیا۔ چاندی کا خاصدان لُٹیہ۔ چاندی کی گُڑگُڑی یہ سامان بہت ضروری ہے۔

داروغہ صاحب۔ اسی لئے تو میں نے عرض کیا تھا ابھی میرا جانا نہ ہوگا، گیا آج ہی کا دن خدا چاہتا ہے تو ابکی آپ کے دولت خانہ پر تشریف لائیں۔

مرزا صاحب۔ ذرا دولت خانہ کی حالت تو دیکھئے۔

نواب صاحب۔ مناسب ہے کہ ایک مکان سرِ راہ کرایہ پر لے لیا جائے اور وہیں نشست رہا کرے۔

خان صاحب۔ آجکل مکانوں کا کرایہ بہت گراں ہو گیا ہے۔ بیس پچیس روپیہ ماہوار سے کم کا نہ ہو۔

شیخ صاحب۔ درست ہے اس سے بھی کیا کم ہو۔

داروغہ صاحب۔ مگر یہ صرف کہاں سے آئے گا۔ کوئی جائداد رہن یا بیع کیجائے۔

نواب صاحب۔ روپیہ کا بندوبست کسی طرح ہونا چاہیے رہن ہو یا بیع۔

داروغہ صاحب۔ یہ ہزاروں کے معاملے ہیں آج تو ہوئے نہیں جاتے آج تو خاصدان لٹیہ گڑگڑی مہاجن سے کرایہ پر منگوالی جائے گی۔ پچاس روپیہ میں کسی نہ کسی طرح لے ہی آؤں گا۔ مگر میں صاف کہہ دوں مجھے تو ابھی یہ معاملہ خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اتنا کہنا تھا کہ خان صاحب شیخ صاحب میر صاحب مرزا خود نواب صاحب بیچارے داروغہ پر گویا برس پڑے جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔

خلاف قیاس کیا یوں سمجھیے کہ یہ معاملہ ہو گیا۔ ذرا رقعہ کو ملاحظہ کیجیے۔ دوسرے حسینی قسمیں کھاتی ہے کہ بیگم صاحب نواب صاحب کے نام پر فدا ہیں۔ حسین علی کو میں خوب جانتا ہوں وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہ کہے گا۔ اور آج ہی سر شام تک کا انتظار ہے جھوٹ سچ کھلا جاتا ہے۔

داروغہ صاحب۔ خیر خدا ایسا ہی کرے۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔

سر شام موتی جھیل کے کنارے دو گاڑیاں کھڑی ہوئی نظر آئیں کوئی پچاس قدم کے فاصلہ سے، جب سورج غروب ہو گیا نواب صاحب تنہا طلب ہوئے، معمولی مزاج پرسی، گاڑی کے اندر سے پاندان کے کھلنے کی آواز آئی۔ ایک پان بنا کے نواب نواب صاحب کو دیا گیا۔ نواب صاحب نے اپنا خاصدان منگایا وہ گاڑی میں داخل ہوا پھر تھوڑی دیر میں مہری سے حقہ مانگا گیا۔

مہری نے جواب دیا، حضور لونڈی خطاوار ہے بھول گئی، یہ گویا حُسنِ طلب تھا۔ نواب صاحب نے گڑگڑی چلم سلگتی ہوئی منگوا کے گاڑی کے اندر اپنے ہاتھ سے دی، نواب صاحب کا بیان ہے کہ میں نے اچھی طرح بیگم صاحب کو دیکھا مگر فوراً دوپٹہ سے منہ چھپا لیا۔ بیگم صاحب نے خود کوئی بات نواب صاحب سے نہیں کی۔ ساتھ والیاں بات چیت کرتی رہیں۔ دوبارا نواب صاحب کے مکان پر ملنے کا وعدہ کیا۔ نہ خاصدان پھر گاڑی سے نکلا نہ گڑگڑی۔ بیگم صاحب سے کس کی مجال تھی جو مانگ سکتا۔ نواب صاحب رخصت ہو کے اپنی گاڑی پر آئے۔

داروغہ صاحب۔ خاصدان اور گڑگڑی تو منگوا لیجیے۔ اب یہ مشورہ ہونے لگا کہ مانگنا مناسب ہے یا نا مناسب۔ داروغہ صاحب خاں صاحب کی رائے تھی کہ منگوا لینا چاہیے۔

میر صاحب۔ واللہ کہیں ایسا غضب نہ کیجیے گا ذلت ہو جائیگی۔

نواب صاحب۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

شیخ صاحب۔ میرے نزدیک بھی یہی مناسب ہے کہ نہ منگوائیے۔

داروغہ صاحب۔ برہم ہو کے کیسا نامناسب۔ مہاجن کو کیا جواب دونگا۔

اَب اسی پہ کثرت رائے ہوئی کہ منگوانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مگر بیگم صاحب کی گاڑی وکٹوریہ گنج کی سڑک کی طرف سو قدم پہ پہنچ گئی تھی دانے کا وقت تھا گھوڑے سرپٹ جا رہے تھے۔

نواب صاحب۔ کیا مضائقہ ہے۔ گھر سے منگوالیں گے۔

داروغہ صاحب۔ ان دونوں مردوں سے ہاتھ دھوئیے مہاجن کو تمسک لکھ دیجئے۔

میر صاحب۔ کیا چوروں سے ہو رہا ہے۔ ہم منگوا دیں گے۔

داروغہ صاحب۔ اب میں کہتا ہوں ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ اگر خود بھجوا دیں تو خیر مانگنے میں بات اوچھی ہو جائیگی۔

اب گھر پہ بلانے کی تیاری ہونے لگیں۔

حسینی (دوسرے دن گھر پر آئی) خاصدان کا تذکرہ ہوا، لے ہے رکھا ہی میں لانا بھول گئی۔ بیگم نے اُسی وقت کہا تھا کہ نواب کو تکلیف ہو گی یہ سب فوراً بھجوا دو۔ مگر میری یاد پہ پتھر پڑیں خیال تھا کہ لیتی جاؤں گی مگر چلتے وقت بھول آئی۔ اچھا اب میرا انعام تو دلوائیے۔ دیکھئے میں نے آمنا سامنا کرا دیا۔ اب نواب جانیں بیگم جانیں۔ ہمارا جو کام تھا وہ ہم کر چکے۔

میر صاحب۔ اچھا بُوا حُسینی یہ تو کہو ہمارے نواب صاحب کچھ پسند بھی آئے۔

حسینی۔ اَے ٹھٹھا لگا کے، اے لو خدا رکھے پسند کیوں نہیں آئے آدھی رات تک گانا بجانا ہو گیا نواب صاحب ہی کا ذکر رہا۔ پھر چُپکے سے بیگم تو خط ہی کو دیکھ کے

لوٹ گئی تھیں، میاں میں نہ مانوں گی عطر پڑھا ہوا تھا۔

مرزا صاحب عطر کیسا؟

حسینی۔ اب آپ مجھے چندراتے ہیں، وہ جو خط میں لگا تھا اور خاصدان کی گلوری جب سے کھائی ہے جب سے تو کیا کہوں بیگم صاحب کے دشمن جیسے دیوانی ہو گئی ہیں۔ یہیں کی رٹ لگی ہے۔ یہی حال رہا تو میں جانتی ہوں چار ہی دن میں نواب صاحب کے پہلو میں آ بیٹھیں گی۔ میاں ہم بھی بچپنے سے بیگموں کے پاس رہے زندگی انھیں فیلوں میں گذری۔ ہم عورت کی نگاہ پہچانتے ہیں۔ اچھا اب میرا انعام دلوائیے دیر ہوتی ہے۔ میری یاد ہو رہی ہو گی۔ میری حسینی کہاں گئی ایک گھڑی بھر بغیر میرے قرار نہیں ہے۔ ادھر میں آنکھ سے اوجھل ہوئی اور میری پکار ہونے لگی۔

شیخ صاحب۔ ہمارے نواب صاحب بھی تم کو زندگی بھر سمجھتے رہیں گے، ہمارے نواب بھی دل کے بڑے فیاض ہیں۔

مرزا صاحب۔ نہال ہو جاؤ گی۔

انعام اکرام میں نواب صاحب کے ملازمین کا بھی آدھا ساجھا تھا۔ رلی بھگت تھی، نواب کو بڑھارے دے رہے تھے۔ آخر داروغہ صاحب سے اور نواب صاحب سے تخلیہ میں گفت گو ہوئی۔ پچاس روپیہ دیا گیا۔ پچیس ۲۵ ادھر ہے پچیس ۲۵ اُدھر۔

داروغہ صاحب اور حسینی۔ حسینی تو دلوائے ہوتے پچاس تو ہم لوگوں کے پلے پڑتے یہ تو کچھ نہ ہوا۔

داروغہ صاحب۔ دو سو روپیہ کی رقم خاصدان لٹیہ گرہ گڑی نہیں جا چکی ہے۔

حسینی۔ تو کیا وہ ہم کو ہضم ہوئی جاتی ہے۔ کہو تو دے جاؤں، مگر بیگم کو پسند ہیں، میں جان کے نہیں لائی، میں تو آپ لوگوں کی بات بنا رہی ہوں۔ خدا رکھے ہماری بیگم کے آگے ایسی ایسی چیزوں کی کوئی اصل ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے ایسے ایسے خاصدان بیس پچیس تو ہوں گے۔ حقوں کا کوئی شمار نہیں۔

نواب صاحب کو اور نواب صاحب کے ملازموں کو یہی گمان تھا کہ اختری بیگم کے پھانسنے کی تدبیر ہو رہی ہے۔ اس کے بعد خاصدان گڑگڑی لیٹے کا نہ کسی نے تقاضہ کیا نہ واپس آیا۔

# باب ۲۸

امین آباد میں سرِ راہ ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ مکان اس طرح کا تھا کہ اندر بہت وسیع مکان زنانہ کے لئے باہر دو کمرے سرِ راہ مردانہ نشست کے لئے تیس روپے ماہوار پر ایک مہینہ کا کرایہ پیشگی دے کے فرش فروش جھاڑ کنول میزیں، کرسیاں، غرضکہ عمدہ فرنیچر سے آراستہ کیا گیا۔ مگر یہ سب سامان جیسے کسی مالک کا ہوتا ہے اور اُس کے نوکر چاکر اسکو کام میں نہیں لاتے اس طرح نواب صاحب نے اِن کمروں کو بالکل چھوڑ کے ایک مختصر سا کمرہ نیچے مکان میں تھا۔ یہاں نشست اختیار کی۔ اتنی جرأت ہی نہ تھی کہ ایسے صاف ستھرے آراستہ کمرے میں بیٹھیں زندگی تو ٹوٹے کھنڈر میں گذر گئی۔ گویا یہ کمرے اِن کی شان کے نہیں بلکہ کمروں کی شان اِن کے قابل نہ تھی۔ اِن کی بے تکلف صحبت میں۔ ایک میلی سی دری بچھی ہے مدار یہ حقے پُھنک رہے ہیں۔ یارانِ طریقت بیٹھے ہوئے ہیں، گنے چھل رہے ہیں چلمیں اُلٹی جاتی ہیں داستان ہو رہی ہے۔ شام کے وقت بڑے لُطف کی صحبت ہوتی ہے۔ نواب کے کمرے کے پہلو میں چاہ کا پتیلہ چڑھا ہے ایک چولھے دودھ کی پتیلی ہے۔ دُودھ جوش ہو رہا ہے۔ ملائی اُتاری جاتی ہے۔ پتیلے میں سبز چائے جوش کھا رہی ہے۔ سجی دے کے اُچھالی جا رہی ہے۔ افیونی رنگ دیکھ رہے ہیں۔ ابھی رنگ نہیں کٹا سجی اور دینا چاہیئے سامنے بسکٹ والے بیٹھے ہیں۔ چار سپیئے والے خرید رہے ہیں ادھر فالودہ والے کھیر کی قفلی والے برف والے خاصہ میلا لگا

ہے۔ یہ سب نواب صاحب کے دَم کا ظہور رہا ہے۔ مہاجن سے پانچ ہزار روپیہ سُودی پر دو نوٹ لکھ کے گویا علی الحساب سلے لئے گئے ہیں، گاؤں کے بارہ آنے کا معاملہ طے نہیں ہوا ہے۔ یہ سب روپیہ شہزادی اور اُس کے شریک داروں کی تقدیر کا ہی نواب صاحب اختری کے نام کی تسبیح پڑھا کرتے ہیں۔ ایک کروڑ کی جائداد کے مالک ہوا چاہتے ہیں۔

ایک حکیم نے لکھا ہے کہ اگر کسی دیوانہ کو یہ خیال ہو جائے کہ میں بادشاہ ہفت اقلیم ہوں تو اُس کا علاج کرنا اُس کے قتل کرنے سے بدتر ہے۔ جو صدمہ بادشاہ کو تخت کے نیچے اُترنے سے ہوتا ہے ویسا ہی صدمہ اس مجنون کو ہوش میں آنے سے ہوگا۔ نواب صاحب مُدّتوں اس خیال میں رہے اور بہت خوش رہے۔ یہ سودا عمر بھر نہ گیا۔

آخر اس مکان میں بیگم صاحبہ (شہزادی) تشریف فرما ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے دعوت کا سامان ہوا۔ پلاؤ، زردہ، فیرنی، شیرمال، کباب، کئی رنگ کا سالن، امیرانہ دعوت تھی۔ مُفت خوروں نے خوب ہتّے مارے۔ چلمن کی اوٹ سے خوب رمز و کنایہ ہوئے۔ طرفین سے اشتیاق کے دفتر کھُلے مگر

دیر آید درست آید۔

ساتھ والیاں پردے کی ذمہ دار تھیں۔ حضور ابھی کم سن ہیں۔ بن بیاہی کیوں کر ایکا ایکی آپ کے سامنے آ کے بیٹھ جائیں۔ راہ و رسم بڑھنے دیجئے۔ ہوا کو ٹوٹنے دیجئے۔ دیکھئے جلدی نہ کیجئے گا۔ نہیں تو سونے کی چڑیا سے ہاتھ سے نکل جائے گی یہ پردہ کھولنے کا قصد کرتے ہیں اُدھر سے دھمکی دی جاتی ہے۔ ابھی اُٹھی چلی جاؤنگی اہا! ایسی جلدی میں آئے تو صاحب کیا میرے دشمن کوئی بازاری کسبی خانگی ہیں، کیوں بُوا حُسینی اسی لئے تم ہم کو لائی تھیں۔

حسینی۔ نہیں حضور کیا مجال بغیر آپ کی مرضی کے کوئی بات ہو سکتی ہے۔
تھوڑی دیر میں سوار ہو کے چلتی ہوئیں، نواب صاحب منہ دیکھ کے رہ گئے۔

آج بھی خاطر خواہ روپیہ اُٹھا، نوکروں چاکروں نے انعام پایا، بیگم صاحبہ کی فرمائشیں پوری کی گئیں۔ چار تھان ململ کے بھیجدو۔ دو تھان اطلس کے ابھی روانہ کردو۔

نواب صاحب۔ تو پھر آخر کیا ہوگا۔

حسینی۔ حضور جو دنیا زمانہ کا قاعدہ ہے رقعہ دیجئے ہم بڑے حضور کے پاس لے جائیں۔ اُدھر سے ہم لوگ۔ بیگم کی طرف سے رضامندی کا اظہار کریں گے دھوم دھام سے شادی ہو جائے گی۔

نواب صاحب نے داروغہ صاحب اور جملہ مصاحبین سے مشورہ کیا۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا، اب یہ سوال پیدا ہوا کہ رقعہ کون لے جائے گا، حسینی اس کی ذمہ دار ہوئی۔ میں رقعہ پہنچا دوں گی، جواب لا دوں گی۔ شادی ٹھہرا دوں گی مانجھا آئے گا۔ مگر حضور مانجھے کے دن سونے کے کڑے بھاری جوڑا پہن کے بیٹھوں گی۔

شہزادی بیوہ تھی وہ اس فکر میں لگی ہوئی تھی کہ رئیس کے گھر میں بیٹھ جائے اختری کے محل میں نوکری کرنے کا منشا یہ تھا کہ کسی طرح نواب خورشید مرزا سے آنکھ لڑا کے تعلق کرلوں، اس ارادے کے پورا کرنے کے لئے بڑی کوشش کی، خوب بنی سنوری رہتی تھی کسی نہ کسی بہانے سے خورشید مرزا کے سامنے آجایا کرتی تھی۔ کہیں پان بنانے کے لئے جاتی ہے، باہر سے وہ آئے کپڑے اُتارنے کھڑی ہوگئی خورشید مرزا کو پہلے تو چنداں خیال نہیں ہوا جب کئی بار یہ حرکتیں دیکھیں سمجھ گئے

اختری سے کہہ کے منع کرا دیا۔ یہاں شہزادی کی آس ٹوٹی۔ ادہر یہ مشغلہ مل گیا، گوہر مرزا اختری بیگم کے دھوکے میں گرفتار ہوگئے۔ شہزادی کو خوف تھا کہ اس راز کے کھلنے پر نواب گوہر مرزا سزا نہ دیں اس لئے اس نے دو تین مرتبہ کی آمد و رفت کے بعد سامنا کر کے نواب گوہر مرزا کو اپنی صورت کا دیوانہ بنالیا۔ اب اُس کو یہ اندیشہ جاتا رہا اگر راز کھُل بھی جائے گا تو دھندلا کے احمق بنالوں گی۔ مُردا کیا بنالے گا۔

واقعی شہزادی نے دو ہی دن میں گوہر مرزا کو اپنا فریفتہ ایسا کرلیا کہ راز کھُلنے کے بعد گوہر مرزا کی زبان سے ایک حرف شہزادی کے خلاف نہ نکل سکا۔

شہزادی۔ بس مردوئے جائداد ڈھونڈھتے ہیں، آدمی سے کوئی غرض نہیں اختری بیگم سے میں کس بات میں کم ہوں ذات پات، صورت شکل، ہاں روپیہ پیسہ میرے پاس نہیں ہے۔ روپیہ ہے کیا، ہاتھ کا میل ہے۔

گوہر مرزا۔ تو پھر تم نے فریب کیوں کیا۔ پہلے سے کہدیا ہوتا۔

شہزادی۔ ہُنو! لو اب بات یہ ہے۔ اتنا کہہ کے گردن جھکا کے چپ ہو رہی۔

گوہر مرزا۔ ہاں، ہاں کہو کہتے کہتے کیوں رُک گئیں۔ بات نہ چبایا کرو۔ یہ بُری بات ہے۔

شہزادی پھر شرما گے۔ اب اس کو نہ پوچھو، ایسی ہی کچھ بات ہے میرے مُنہ سے نہیں نکلتی۔ حسینی کو آنے دو۔ بلا بھیجو۔ حسینی کو دیکھتے ہی خوب اچھے موقع پر آئیں، اچھا بُوا حسینی نواب کو سمجھاؤ کہ یہ میں اُن سے دوسرے کا نام لے کے کیوں ملی۔

حُسینی راول درجہ کی مشاق کُٹنی تھی پہلے ہی سے بات بنا رکھی تھی، اچھا نواب کہہ دوں، نواب صاحب آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے۔ شہزادی بیگم کی ایسی بیوی آپ کو ملی پڑھی لکھی دست و قلم پری کی صورت پھر آپ کی عاشق زار وہ خود سے آپ پر گر رہی، خدا جانے کیا تھا کہ آپ کا رقعہ دیکھتے ہی دیوانی ہوگئیں۔ وہی عطر پڑا ہوا تھا

کسی اچھے سیانے نے آپ نے پڑھوایا تھا۔ آپ کو اختری بیگم کی دُھن تھی۔ بھلا کوئی عورت جو کسی مرد کو چاہے گی وہ یہ گوارا کرے گی کہ کوئی دوسری عورت اُس مرد کے پہلو میں بیٹھے آخر اس غریب کو یہی بن پڑا۔ اسی بہانہ سے آپ سے ملی۔ آپ کو پسند نہ ہو تو ابھی سوار کر کے لئے جاتی ہوں۔ اُس کے بھی سینکڑوں گاہک ہیں نواب خورشید مرزا ہاتھ جوڑتے تھے کہ میرے ساتھ نکاح ہو جائے۔ اختری خود پیچھے پڑی تھیں، شہزادی نے آپ کے پیچھے اپنی سلطنت مٹادی۔

ادہر حسینی یہ باتیں کر رہی تھی اُدہر منہ پھیر کے شہزادی نے رونا شروع کیا۔

آخر گوہر مرزا کو منانا پڑا۔ رونی کیوں ہو میں تو کچھ نہیں کہتا۔ دو آنسوؤں نے وہ دفتر ہی دھو ڈالا۔

شہزادی۔ خود گرنے کی یہی سزا ہے۔ اختری میں لال لگے ہیں، مجھ میں کیڑے پڑے ہیں۔

مرد کی گرفتاری کے لئے کوئی لاسا کوئی جال کوئی پھندا اس سے بڑھا ہوا نہیں ہے کہ عورت اُس کو اپنا عشق جتائے بشرط حسن و جمال شہزادی سَو دو سَو عورتوں میں ایک تھی۔ گوہر مرزا اپنی قسمت پر نازاں تھے۔ اُن کو گانے کا شوق تھا، شہزادی خوب گاتی تھی۔ افیون سے بھی شوق تھا مگر چنڈو سے نفرت تھی یہ جلسہ اُسکو پسند نہ تھا کہ مرد عورت ایک حلقے میں لیٹے ہیں۔ درمیان میں لمپ جل رہا ہے چھینٹے بنائے جاتے ہیں، شہزادی کے طعنوں سے نواب صاحب کا بھی یہ شوق ترک ہوا۔ اس کے بعد اور مشغلہ شروع ہوئے اُس نے راگ میں رنگ کو ملایا عشق کو چمکایا۔ باغوں کی سیر، جنگل کی ہوا، مصاحبوں کا ساتھ، پردا ہو توف، آزادی کی دُھن، شہزادی کو دولت کی ہوس حد سے زیادہ تھی۔ ہر وقت نئے عاشق کی جویا تھی اختری کے دم سے ایک جگہ اسکو پوری کامیابی ہوئی تھی، بُوا حسینی نئے شکار کی جستجو میں تھیں۔

اختری بہن کے محل سے شہزادی کے ساتھ حسینی اور حسین علی یہ دونوں بھی نکال دیئے گئے تھے۔ آخر ایک بڑے رئیس کو دام میں لانے کی کوشش ہونے لگی، جہاں حسین علی ایسے بے بدل کٹنے کارگذار ہوں وہاں انتظار کا شکوہ نہ فراق کا رونا نہ آہ و زاری کی ضرورت نہ اختر شماری کی حاجت چند ہی روز کے ہیر پھیر میں مصنوعی اختری شہزادی کی سواری بڑے تزک و احتشام سے ـــ راجہ صاحب کی کوٹھی میں پہنچ گئی، کہار سُرخ بانات کی وردیاں پہنے۔ بی حسینی گلبدن کا لہنگا پھڑکاتی ہوئی چاندی کی مچھلی مانگ کے پاس چمکتی ہوئی رفنس کا پایہ پکڑے ہوئے سواری اُتری بسم اللہ! خود راجہ صاحب تا لب فرش لینے کو آئے۔ بیگم صاحبہ بڑی تمکنت کے ساتھ زربفتی مسند پر رونق افروز ہوئیں۔ پیچوان منہ سے لگا ہے۔ راجہ صاحب سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔

# باب ۲۹

نواب مرزا اختری کے خیر خواہ قدیم اُن کی بیوی اُن کے بچے سب کے سب اختری کی فیاضیوں سے مالا مال ہو چکے یہ گھر کا گھر اختری کے نام پر جان دینے کو آمادہ۔ نواب مرزا اپنے تصویر بنانے کے کمرے میں بیٹھے ایک تصویر میں رنگ بھر رہے ہیں۔ اس اثناء میں ایک صاحب مقصود علی نامی اُن سے ملنے کے لیے آئے۔

نواب مرزا نے زنانہ کی طرف کا دروازہ بند کر کے باہر کا دروازہ کھول دیا اسی کمرہ میں بُلالیا۔ باتیں ہونے لگیں۔ نواب مرزا صاحب کے زخم سب اچھے ہو گئے تھے مگر دو نشان سیاہ ایک بائیں رخسارے پر اور ایک پیشانی پر بہت نمایاں تھے۔

مقصود علی۔ یہ نشان پہلے تو آپ کے چہرہ پر نہ تھے۔

نواب مرزا۔ جی ہاں آپ سے ایک مدت ہوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ عجیب واقعہ ہے۔

مقصود علی۔ ضرور بیان فرمائیے یہ تو اگلے زمانہ میں جب بات بات پر تلواریں کھنچا کرتی تھیں اس زمانہ میں بہت عجیب نہ معلوم ہوتے، اس امن وامان کے عہد میں البتہ قابل استفسار ہیں۔

نواب مرزا۔ مگر یہ قصہ کسی قدر طولانی ہے شاید آپ کو اتنی مہلت نہ ہو اور مختصر بیان آپ کے سمجھ میں نہ آئے گا۔

مقصود علی۔ اگر آپ کوئی خاص ضرورت ہو جس سے میرا حاضر رہنا اس وقت خلاف مصلحت ہو تو خیر ورنہ میں ہمہ تن گوش ہوں ضرور کہیے۔

نواب مرزا۔ مجھے ایسا کوئی کام نہیں ہے اس وقت آٹھ بجے ہیں میں دس بجے تک گھر میں رہوں گا۔ دس بجے کے بعد سرکار کا کچھ کام ہے۔ کچہری تک جانا ہے۔

مقصود علی۔ سرکار کون! میں تو جانتا تھا آپ خانہ نشین ہیں کسی کے نوکر نہیں ہیں۔

نواب مرزا۔ یہ سچ ہے میں نوکر نہیں ہوں مگر جس کا نمک کھائے وہی سرکار ہے۔ اختری بیگم صاحبہ کو خدا سلامت رکھے انھیں کا نوکر سمجھ لیجیے۔ بلا شرط خدمت۔

مقصود علی۔ اختری بیگم کے نام پر مسکرائے۔ نواب مرزا نے دیکھا مگر کچھ ایسا خیال نہیں ہوا ممکن ہے کوئی اور خیال آگیا ہو انسان کا ذہن تو ایک سیر ہے جہاں سینکڑوں منظر ہر وقت پیش ہوا کرتے ہیں۔

نواب مرزا نے اس کے بعد پورا واقعہ منصوری، لکھنؤ، بمبئی اور جو واقعات خصوصاً مراد علی کے تعاقب سے متعلق تھے سب بیان کیے۔ ان سب واقعات کو ناظرین اچھی طرح جانتے ہیں۔ اختری کے نام پر مقصود علی کے چہرہ کی تبدیلی اور مسکراہٹ مختصر یہ کہ سب امور نواب مرزا کی نظروں سے گذرے نواب مرزا کو مقصود علی کی یہ حرکت ناگوار ہوئی مگر اس خیال سے کہ ایک عورت کی شکر گذاری کا اظہار مقصود علی کو عجیب معلوم ہوا ہوگا کیونکہ اکثر قصبات کے رہنے والے عورتوں کی چنداں وقعت نہیں کرتے۔ مقصود علی نے خود ہی اس راز کو کھولنا شروع کر دیا مقصود علی کو یقین تھا کہ اختری غالباً راجہ صاحب کی کوٹھی میں ہوں گی کیونکہ وہ سر شام جاتی ہیں اور دوسرے دن بارہ بجے گھر آتی ہیں۔

مقصود علی۔ یہ اختری بیگم بڑی شوقین ہیں۔
نواب مرزا۔ پہلے ہی سے مقصود علی کی حقارت آمیز تبسم سے بدگمان ہو رہے تھے، اس لفظ پر سخت برہم ہو گئے۔ بس بس جناب میں اپنی محسنہ کے بارے میں جو ایک نہایت باعصمت بی بی ہے یہ لفظ (شوقین)، نہیں سن سکتا۔ شاید آپ نے یہ لفظ کسی برے خیال سے نہ کہا ہو مگر ہم اہل لکھنؤ اس لفظ کو مستورات خصوصاً بن بیاہی لڑکیوں کی نسبت نہیں کہتے۔
مقصود علی۔ بڑا تعجب ہے۔ اختری بیگم بن بیاہی ہیں پھر تو معاف فرمائیے میں نے اس لفظ کو بے محل استعمال نہیں کیا۔
نواب مرزا۔ کو ایسا ہی غصہ آیا جیسے کسی شریف کو فحش گالی دینے سے آسکتا ہے۔ مگر غصہ کو تھام کے ذرا اپنا مطلب صاف صاف کہیے۔
مقصود علی۔ بن بیاہی لڑکیاں اگر غیر مردوں سے بے تکلف ملیں دوسرے الفاظ میں ناجائز تعلقات پیدا کریں تو ان کو شوقین کہنا کوئی بری بات نہیں ہے۔
نواب مرزا۔ استغفراللہ! محال۔
مقصود علی۔ اس حسن ظن کا تو کوئی جواب نہیں ہے۔ وہی کلکتہ والی بیگم جو خورشید مرزا صاحب کی تولیت میں تھیں۔
نواب مرزا۔ تو پھر انھوں نے کس ...... سے ناجائز تعلق کیا۔ بالکل جھوٹا بہتان افترا۔
مقصود علی۔ خیر آپ جو چاہیں فرمائیں۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ وہ اس وقت کوٹھی میں راجہ صاحب کے پہلو میں تشریف رکھتی ہیں۔
نواب مرزا۔ آپ کو دھوکا ہوا ہوگا۔
مقصود علی۔ میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں۔

نواب مرزا - آپ کا بیان چشم دید تو ہو نہیں سکتا، سُنی سُنائی بات پر اتنا اعتبار ۔

مقصود علی - بے شک یہ صحیح ہے - مگر بعض سماعی اُمور بھی مثل معائنہ کے ہوتے ہیں - میں ایسے شخص کی زبانی بیان کرتا ہوں جس نے بیگم صاحبہ کو پہلے بھی دیکھا تھا اور اب اس موقعہ پر دیکھا جس کا میں نے بیان کیا -

اتفاقاً نواب مرزا کی بیوی یہ سب باتیں دروازہ کے پاس کھڑی سُن رہی تھیں اُنھوں نے کنڈی کھڑکھڑائی - نواب مرزا اندر گئے - مجھے پان دینے والی ہیں -

نواب مرزا کی بیوی - تم کیوں بے کار حجت کرتے ہو -

نواب مرزا - لاحول ولاقوۃ یہ کیا کہتی ہو، تو میں مان لوں کہ بیگم نے راجہ صاحب سے آشنائی کرلی -

نواب مرزا کی بیوی - اُن کے دشمن مگر اس میں ایک بھید ہے - اُن کو ٹالو - میں تم سے کہہ دوں گی، شہزادی کو تم جانتے ہو -

نواب مرزا - پورا واقعہ تو نہیں سمجھے، مگر بیوی کے کہنے سے اب اُنھوں نے باہر آکے مقصود علی سے یہ کہا -

اچھا تو اب اس تذکرہ کو جانے دیجئے، ایک ہفتہ کے بعد میں آپ سے خود ملوں گا، اب کچھ اور ذکر فرمائیے -

مقصود علی - مناسب ہے پھر ادھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے رخصت ہوئے نواب مرزا گھر میں گئے -

بیوی - تم کو یہ حال نہیں معلوم - ایک عورت شہزادی نام کی چند روز ہوئے بیگم کے پاس نوکر ہوئی تھی، اب وہ نکال دی گئی، صورت شکل کی اچھی ہے اور بیگم سے کچھ یوں ہی سی جھجک بھی ملتی ہے اُس نے کئی رئیسوں کو ٹھگا ہے - میں خوب سمجھ گئی

یہ اُسی نے کوئی گُل کھلایا ہے۔

نواب مرزا۔ تم نے اُس کو دیکھا ہے، ایک بدمعاش عورت کو قرار واقعی سزا دینا چاہیئے۔

بیوی۔ ہاں میں خوب پہچانتی ہوں۔ بیشک ناک چوٹی کاٹ گدھے پر سوار کر کے منڈوانا چاہیئے۔

نواب مرزا۔ تو پھر اسکی قلعی کھولنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ ایک بے گناہ عصمت دار رئیس زادی کو بدنام کر رکھا ہے۔

بیوی۔ پہلے گوہر مرزا کو پھانسا تھا۔ اُن کے ہزار دو ہزار روپیہ بگڑوا دئے۔ اب کی بڑا ہاتھ مارا۔ راجہ صاحب کو دام میں لائی۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اگر کسی غریب کو لالچ ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے ایسے ایسے بڑے آدمیوں کو بھی دولت کی ہوس ہے۔

نواب مرزا۔ دولت کی طمع سے کوئی خالی نہیں۔ مگر اب تمہاری رسائی راجہ صاحب کی کوٹھی میں کیوں کر ہو۔

نواب مرزا کی بیوی۔ مشکل یہ ہے کہ راجہ صاحب کی کوٹھی مردانہ مکان ہے۔ وہاں میں نہیں جا سکتی۔ اور ایسی صحبت میں تمہارا بھی گذر نہیں ہو سکتا۔ رانی صاحبہ سے تو میں مل سکتی ہوں۔

نواب مرزا۔ تمہاری خالہ وہاں جاتی ہیں۔ اُن کے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

نواب مرزا کی بیوی۔ اچھا میں جاؤں گی، کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئیگی پھر اس کے بعد کوئی بات دل میں سمجھ کے خوب ہنسی۔

نواب مرزا۔ یہ آپ ہی آپ ہنسیں کیوں۔

نواب مرزا کی بیوی۔ یہ ابھی نہیں بتائیں گے۔ لو تم جاؤ جہاں جاتے ہو میں

خالہ کو ابھی بُلاتی ہوں۔

نواب مرزا کی بیوی نے ڈولی بھیج کے اپنی خالہ کو بُلا بھیجا ایک نورانی صورت ضعیفہ تسبیح ہاتھ میں سجدہ کا گھٹا ماتھے پر آئیے اُتریں۔ بیٹا مجھے کیوں بُلایا ہے۔

نواب مرزا کی بیوی۔ خالہ ایک ایسا ہی کام تھا۔ تم رانی صاحبہ کے پاس کب جاؤ گی۔

خالہ جان۔ میں جب جی چاہے جاؤں کوئی میری روک ٹوک ہے۔

مرزائی بیگم۔ میری اچھی خالہ آج ہی چلو اور مجھکو ساتھ لے چلو۔

خالہ جان۔ تم ایک دفعہ گئی بھی تھیں۔

مرزائی بیگم۔ جی ہاں کوئی پانچ برس ہوئے۔

خالہ جان۔ تو اب کیا کوئی کام ہے۔ مجھ سے کہو۔

مرزائی بیگم۔ آپ سے کہنے کا نہیں ہے۔

خالہ جان کچھ اور سُنا راجہ صاحب نے کوئی نئی رنڈی کی ہے۔ رانی اُس کے غم میں گرفتار ہیں۔ کسی سے کوئی تعویذ لکھوا دو، اپنے میاں سے کہہ کے کوئی عمل پڑھوا دو، یہ موئی چھوٹ جائے۔

مرزائی بیگم۔ اسی لئے تو چلتی ہوں، میں چھڑا دوں گی۔

خالہ جان۔ اے بیٹی یہ بڑا کام ہے۔ رانی بچاری سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہیں آخر کیوں کر چھڑا دو گی۔ کوئی مُلّا سیانا ہے یا کوئی عمل ہے۔ مجھ سے تو کہو۔

مرزائی بیگم۔ مجھے خود ایک ایسا عمل یاد ہے کہ وہ رنڈی آپ سے چلی جائے گی اور نہ جائے تو راجہ صاحب جوتیاں مار کے نکلوا دیں گے۔

خالہ جان۔ اے بیٹی تیرے مُنہ میں گھی شکر۔ میں خود صحنک رتجگہ کروں گی اُبکی درگاہ میں چلا تو باندھ آئی تھی اچھا تو پھر کپڑے بدل لو۔

مرزائی بیگم۔ جلدی جلدی نہائیں، کنگھی کی سر میں تیل ڈالا اپنی حیثیت کے موافق کپڑے پہنے۔

دونوں خالہ بھانجیاں سوار ہو کے حسین گنج پہونچیں۔ ڈیوڑھی پر سواریاں لگائی گئیں اندر اطلاع ہوئی دونوں طلب ہوئیں۔ مرزائی بیگم نے رانی صاحبہ کو جھک کے تسلیم کی۔ رانی صاحبہ نے خود اِن کی خالہ کو اٹھ کے بندگی کی۔

رانی صاحبہ۔ آہاہ، یہ مرزائی بیگم آج کہاں بھول پڑیں۔

مرزائی بیگم۔ حضور کو سلام کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ اور کچھ کام بھی ہے۔

رانی صاحبہ۔ سلام تو ہو گیا۔ اب کام بھی کہہ ڈالو۔

مرزائی بیگم۔ یہ جو کوئی بیگم راجہ صاحب کے پاس تشریف لائی ہیں ذرا اُن کے سلام کو میں آئی ہوں۔

رانی صاحبہ۔ خفا ہو کے۔ تو پھر میرے پاس کیوں آئیں، مردانی ڈیوڑھی پر گئی ہوتیں۔

مرزائی بیگم۔ مردانی ڈیوڑھی پر ہم غریبوں کا کیا کام ہے، وہاں تو بیگمات کا گذر ہو سکتا ہے۔ میں حضور کے ذریعہ سے ملنا چاہتی ہوں۔

رانی صاحبہ۔ تعجب سے (میرے ذریعہ سے) مرزائی بیگم نے اختری بیگم کا حال بیان کیا، اوّل سے آخر تک پھر چٹھی نویس کا اُن کے پاس نوکر ہونا۔ اُس کی چالاکی لوگوں کو اُن کے نام سے پھانسنا۔ یہ سب واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔

رانی صاحبہ۔ نواب خورشید مرزا نے جس لڑکی کو پرورش کیا تھا اُسی کا نام اختری بیگم ہے۔ تو یہ، اُس کے نام سے لوگوں سے ملتی پھرتی ہے۔ اب میں سمجھی۔ اچھا تماشہ ہے۔

خورشید مرزا میرے عزیز ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں۔

مرزائی بیگم۔ آپ سے نواب صاحب سے قرابت ہے۔ تو اختری بیگم یہاں چلی آئیں گی۔

رانی صاحبہ۔ خورشید مرزا میرے بلوانے سے فوراً بھیجدیں گے۔

مرزائی بیگم۔ یوں نہ آئیں مجھہ کو جانا پڑے گا۔ مگر یہ بات ذرا ظاہر نہ ہولنے پائے مجھے خوف ہے کہ نقلی اختری کہیں بھاگ نہ جائے۔

رانی صاحبہ۔ کیا مجال جو کسی پر ظاہر ہو۔ اچھا تم جاؤ۔ آج ہی جاؤ۔

مرزائی بیگم۔ حسین گنج سے سوار ہوئیں، معالی خاں کی سرا پہنچیں۔ اختری بیگم اُن کے یک بیک اُتر پڑنے سے متعجب ہوئیں۔

اختری بیگم۔ یہ آج کہاں آئیں۔ میں خود بلوانے کو تھی۔ جعفری بیگم کی نسبت آئی ہے۔

مرزائی بیگم۔ آپ کو بلوانے کو تھیں میں خود حاضر ہوئی۔ کچھ خبر بھی ہے دُنیا میں کیا شہرے اُڑے ہوئے ہیں۔

اختری بیگم۔ کیا کوئی نیا گل پھولا ہے۔

مرزائی بیگم۔ یہ شہزادی جو آپ کے پاس نوکر تھی۔ اب وہ اختری بیگم بن گئی ہے۔ اب کیا کہوں کیا غضب کیا ہے۔ راجہ صاحب کے پاس پہنچی۔

اختری بیگم۔ ہائے غضب! یہ تو بڑا ستم ہے۔ مجھ بے گناہ کو بدنام کرتی ہے پھر کیا کرنا چاہیئے۔

مرزائی بیگم۔ آپ رانی صاحبہ کے پاس چلی چلیے۔

اختری بیگم۔ ماموں جان شاید نہ جانے دیں۔

مرزائی بیگم۔ رانی صاحبہ سے اور نواب صاحب سے عزیزداری ہے وہ جانتے ہیں اور پھر وہ گھر ایسا ویسا نہیں ہے۔ ضرور جانے دیں گے۔ آپ کہدیجئے گا۔

رانی صاحب نے مجھے بُلانے کو بھیجا ہے۔

اختری بیگم ۔ اور یہ شہزادی کا تو حال نہ کہوں۔

مرزائی بیگم ۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے ۔ مردوں سے کوئی ایسی بات کہنا ہے ۔

اختری بیگم نے اجازت حاصل کی ۔ نہایت تزک و احتشام سے سوار ہوئیں ۔ رانی صاحبہ کو اطلاع پہلے سے دی گئی تھی ۔ ڈیوڑھی پر سواری بڑی عزت سے اُتری ۔ اختری بیگم رانی صاحبہ کے پاس گئیں ۔ رانی صاحبہ اُسی طرح ملیں جسطرح چھوٹے رشتہ کے عزیزوں سے ملتے ہیں ۔ اختری بیگم کی تمیزداری اُدب سلیقہ سے بہت ہی خوش ہوئیں ۔

اختری بیگم نے نہایت عمدہ جوڑا ۔ بہت قیمتی زیور پہنے تھیں ۔ ملازم بھی زرق برق لباس سے گہنے پاتے سے آراستہ تھے اختری بیگم، جو کمسنی میں بن بیاہی لڑکیوں کا رویہ ہوتا ہے ۔ بہت شرمائی ہوئی سر جھکا ہوا نہ تمکنت نہ غرور ہر شخص سے اس کی شان کے موافق ملنساری سے پیش آنا ۔ صورت پر بھولا پن، نور کی صورت بن بیاہے پن کی حالت ہر انداز سے پیدا تھی ۔ تمام محل کی عورتیں اس کم سن رئیس زادی کو دیکھ کے گویا فریفتہ ہو گئیں ۔ اب تو حال ہی کھُل گیا تھا ۔ سب شہزادی کو لعنت ملامت کر رہے تھے ۔ اکثر باہر نکلنے والی عورتیں شہزادی کو جھانک جھانک دیکھ آئیں ۔ آپس میں چرچے ہونے لگے ۔

ایک عورت ۔ ماشاءاللہ کہاں یہ کہاں وہ، ہاں صورت کچھ یوں ہی سی ملتی ہے ۔

دوسری عورت ۔ اُن کے منہ پر امیرانہ پن ہے اس پر ڈومنی پنا برستا ہے کہاں یہ شرمائی شرمائی نیچی نظریں، بھولی صورت، کہاں وہ چالاک بیباک آنکھیں ذرا

لحاظ نہیں۔ اُن کے منہ پر ہلکی سی مُسکراہٹ کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ایک اُس کو دیکھو جیسے منہ پر ٹھیکرے لوٹتے ہیں۔ کیسے سوکھے ٹھٹھے لگا رہی ہے۔

تیسری عورت۔ ہے گہنے کو بھی خیال کیا۔ میں تو سمجھتی ہوں بیتل کا ہے جھوٹے موتی ہیں۔

پہلی۔ بیتل تو نہیں ہے۔ میرے نزدیک تو ملمع ہے۔ وہی دلّی وال کندلے کا کام ——

دوسری۔ اور وہ سچا بھی ہے تو کیا ہوگا کوئی پانسو چھ سو کا۔ بیگم کا ہر عدد بھاری سول کا ہے۔

خود رانی صاحب۔ آنکھ مار کے۔ کیا باتیں کر رہی ہو۔ اِس زیور کی اُس کے گہنے سے کیا مقابلہ —— یہ جواہرات کہاں سے پا سکتی ہے۔ اِسی سے اصلی نقلی کی تمیز ہو سکتی ہے۔ خُدا جانے مردوں کی کیسی نگاہ ہوتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کو آنے دو۔ اِسی زیور سے بات نکلے گی۔ اختری اُن کے سامنے تو جا نہیں سکتی۔ زیور دیکھ کے راجہ صاحب کی آنکھیں کُھلیں گی۔ دیکھیں تو اُن کی بیگم صاحبہ کے پاس کوئی عدد اس جوڑ کا نکلتا ہے۔

راجہ صاحب رات کو دس بجے رانی صاحبہ کے ساتھ خاصہ نوش فرماتے تھے حسب معمول تشریف لائے۔ راجہ صاحب، تختوں کے چوکے پر مسند بچھی ہے تکیہ تکیہ سے لگے بیٹھے ہیں۔ مختصر دسترخوان۔ ہے سامنے رانی صاحبہ بیٹھی ہیں کھانا چُنا جاتا ہے۔ خاصہ والی کے سامنے چھوٹی چھوٹی پتیلیاں چاندی کی رکھی ہیں ایک اور پیش خدمت چینی کی رکابیاں خاصہ والی کے آگے رکھتی جاتی ہے۔ رانی صاحبہ کے آگے سیلاب چی آفتابہ آیا ہے کُلّی کر کے دستِ پاک سے ہاتھ پونچھ رہی ہے۔ راجہ صاحب کی طرف متوجہ ہو کے یہ آج کل کون بیگم صاحبہ آپ کی سرکار میں داخل ہوئی ہیں؟

اُن کے تو بڑے شہرے ہیں۔

راجہ صاحب۔ کسی قدر تیوری چڑھا کے۔ میں نے آپ سے بارہا کہا ہے کہ مردانہ کے بارے میں آپ کچھ دخل نہ دیا کریں۔ خدا جانے کون آتا ہے۔ کون جاتا ہے۔ آپ کو باہر کے دھندوں سے کیا سروکار۔

رانی صاحبہ۔ میں کچھ دخل دینا نہیں چاہتی اور نہ میں نے آج تک کسی کی ٹوہ لی۔ اِن بیگم صاحبہ کے واقعہ سے میرا ایک ذاتی تعلق ہے۔ نہ وہ تعلق جو صرف آپ کے واسطے ہو بلکہ میرے ایک عزیز کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

راجہ صاحب۔ شاید آپ کے کسی عزیز کو نقصان پہنچتا ہو مگر میرا تو فائدہ ہے۔ بالفعل میں مقروض ہوں اور بیگم صاحبہ کے پاس اُن کے ذاتی نوٹ ہیں قرضہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔ شاید بہت کم سود پر اُن سے روپیہ مل جائے۔ اس معاملہ کے سلسلہ میں میری اُن کی راہ و رسم ہو گئی ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

رانی صاحبہ۔ مسکرا کے، تو یہ بیگم صاحبہ سودی روپیہ چلاتی ہیں۔ کتنا روپیہ اُن کے پاس ہے اور وہ کس بینک میں جمع ہے۔

راجہ صاحب۔ آپ کو یقین نہیں آتا، اس لئے آپ مذاق سمجھتی ہیں۔ میں خود بینک کے منیجر سے مل کے دریافت کر چکا ہوں۔

رانی صاحبہ۔ یہ بالکل درست ہے۔ منیجر نے صحیح اطلاع دی ہے۔ مگر جن کا روپیہ ہے اُن کو آپ جانتے بھی ہیں۔ کیوں کر آپ نے سمجھ لیا کہ یہ وہی ہیں۔

راجہ صاحب۔ ایک قہقہہ لگا کے۔ وہ روز میرے پاس آتی ہیں۔

رانی صاحبہ۔ میں اور کچھ نہیں کہتی صرف ایک بات پر غور کر لیجیے۔ جس شخص کا اتنا روپیہ بینک میں جمع ہو اور وہ گندلہ کی بالیاں جھوٹے موتیوں کی پہن کے آئے۔

راجہ صاحب۔ جھوٹے موتی یہ کسی نے غلط کہا ہے۔

رانی صاحبہ۔ بھلا اُن کا سب زیور آپ کی نگاہ میں کتنی مالیت کا ہوگا۔

راجہ صاحب۔ میں کوئی سُنار نہیں جوہری نہیں جو زیور کی مالیت آنک سکوں۔

رانی صاحبہ۔ پھر آپ رئیس ہیں خُدا نے آنکھیں دی ہیں۔ لاکھوں کا زیور دیکھ ڈالا ہوگا۔ بقول شخصے راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال۔

راجہ صاحب۔ یہ بالیاں سادی ہیں مگر جھوٹے موتی نہیں۔

رانی صاحبہ۔ اچھا وہ سچے ہی چھوٹے چھوٹے موتی جیسے غریب لوگ بالیوں میں ڈالتے ہیں۔ کرڑے شیر دہاں کے، چمپا کلی۔ دُھکدھگی۔ سونے کی پازیب، اچھا اسی پر فیصلہ ہے۔ پاؤں کا زیور سُنہری ہے رُوپہلی۔

راجہ صاحب۔ روپہلی۔ سونے کا کون پہنتا ہے۔

رانی صاحبہ۔ یہ نہ کہو جس کو خُدا دے۔ اختری کی دھکدھگی اور مالا سامنے رکھ دیا ایسا کوئی عدد ہے۔

راجہ صاحب۔ یہ تمہارا زیور ہے۔

رانی صاحبہ۔ جی نہیں میرا نہیں ہے۔ میرے پاس بھی ایسے قیمتی عدد کہاں ہیں؟ ایک پیش خدمت کو اشارہ کر کے۔ سب گہنا اُتروالا۔

پیش خدمت نے ایک چاندی کی کشتی میں تمام زیور اختری بیگم کا لا کے سامنے رکھ دیا۔

راجہ صاحب۔ یہ کیا فروخت کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک عدد اُٹھا کر غور سے دیکھنے لگے، کیسا زیور ہے؟

رانی صاحبہ۔ بڑی فخر کے ساتھ، یہ اختری بیگم کا زیور ہے وہ جن کے لاکھوں روپیہ بینک میں جمع ہیں۔

راجہ صاحب۔ یہ آپ کے پاس کس طرح آیا؟

رانی صاحبہ۔ جس کا زیور ہے وہ خود میرے پاس موجود ہے۔ میری عزیز ہے۔ اُس کے دشمنوں پر کیا ایسی بنی تھی کہ وہ غیر مردوں کے پاس آشنائی کرنے کو دوڑی جاتی۔ بن بیاہی لڑکی۔ نیک عالی خاندان اُس کا رونگٹا غیر مرد نے آنکھ سے نہ دیکھا ہوگا۔

راجہ صاحب۔ تو یہ کون ہے؟

رانی صاحبہ۔ یہ اختری بیگم کی چھٹی نویس ہے پندرہ روپیہ پر نوکر ہوئی تھی خراب چال چلن تھا۔ اس لیے بھائی خورشید مرزا نے نکال دیا۔ اب وہ لوگوں کو جعل سے ٹھگتی پھرتی ہے۔ پہلے ایک رئیس ہیں گوہر مرزا اُن کو یہی جال دیا۔ جب جال کُھلا ہاتھ جوڑنے لگی۔ خاموش ہو رہے۔ اَب بھی اُن کے پاس ہے۔ کچھ لوگ اختری بیگم کے بیگم صاحبہ کو سلام کرنا چاہتے ہیں اگر آپ کی اجازت ہو تو بھیجدی جائیں۔

راجہ صاحب۔ مگر کوئی فساد نہ ہو۔

رانی صاحبہ۔ کیا مجال فقط سلام کر کے مزاج پوچھ کے چلے آئیں گے مگر پھر وہ یہاں ٹھہریں گی نہیں۔ اگر آپ کا جی چاہتا ہو کہ وہ آپ کی سرکار میں اور کچھ دن رہیں تو خاموش ہو جائیے دل میں سمجھ لیجئے اور جو نکالنا منظور ہو تو اِن لوگوں کو جانے دیجئے۔

راجہ صاحب۔ اس فقرہ سے کہ گوہر مرزا کے پاس ہے بالکل برخواستہ خاطر ہو گئے تھے۔ مرزائی بیگم اور ایک مغلانی کو جانے کی اجازت دی گئی۔ شہزادی گاؤ تکیہ سے لگی، بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مرزائی بیگم اور وہ مغلانی دونوں سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ شہزادی کا یہ حال ہوا جیسے کسی پر دفعتہً بجلی گر پڑے۔ اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر منہ کھول کے رہ گئی۔ ان دونوں

کو بے بسی کی نگاہ سے گھور کے دیکھا مگر فوراً منہ جھکا کے بغلیں جھانکنے لگیں۔ ان لوگوں نے بھی زیادہ چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی فوراً اُلٹے پاؤں واپس آئیں۔ اِدھر شہزادی نے سب کی نظر بچا کے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ سوار ہو کے گئی یا پیدل بھاگ گئی۔

جب یہ لوگ محل میں واپس گئے بڑی دیر تک اُس کی ہنسی رہی۔ رانی صاحبہ کے سامنے اس کی نقل کی گئی۔ ایک عورت بیگم صاحبہ بن کے بیٹھی۔ ان دونوں نے اسی طرح جھک کے تسلیمیں کیں، غرض پورا ایکٹ کیا گیا، راجہ صاحب باہر جا چکے تھے۔ نوکروں سے اُس کے جانے کی کیفیت دریافت کی گئی۔ سب نے بیان کیا نہیں معلوم زمین میں سما گئی یا آسمان پر اُڑ گئی۔ یہ کچھ نہ معلوم ہوا کہ ڈولی کون لایا۔ آخر یہ قیاس کیا گیا کہ حسین علی ڈیوڑھی پر موجود تھا وہ اپنا چادرہ اُڑھا کے پیدل لے گیا۔ ایک ملازم جو سودا لینے گیا تھا اُس نے حسین کے ساتھ ایک عورت کو سڑک کے کنارے دیکھا۔ اکڑ جھکایا جاتا تھا۔

اس کے بعد اختری بیگم مع اپنے عملہ کے گھر پر آئیں۔ یہاں خورشید مرزا صاحب سے یہ واقعات بیان ہوئے۔ نواب مرزا بھی موجود تھے۔ یوں ہی کوری نکل گئی، میں ہوتا سر مونڈ لیتا، ناک کاٹ لیتا۔ کچھ نہیں تو پانچ جوتے تو لگا دیئے ہوتے ہائے یوں ہی چھوڑ دیا۔

اسی سلسلہ میں رانی صاحبہ سے اختری بیگم سے پیام سلام کے بعد قرضہ کا معاملہ طے ہوا۔ کئی لاکھ روپیہ علاقہ کی کفالت سے قرض دیا گیا۔ راجہ صاحب کو اختری کے دھوکے سے جو نقصان ہوا تھا اُس سے کہیں زیادہ نفع ہوا۔

---

پھر حکیم جعفر علی کے ساتھ نادری کی شادی کا سامان ہوا۔ خود اختری

مانجھالے گئے۔ بڑی دھوم سے بارات آئی۔ ہزاروں کا جہیز دے کے نادری کی رخصتی ہوئی۔ نواب مرزا کے ایک بھائی سلطان مرزا نے نواب مرزا کے اشارے سے جعفری کا پیام دیا۔ جعفری راضی نہ ہوتی تھی مگر سب نے سمجھا کے اُن کی بھی شادی کردی۔ نادری کو جتنا جہیز دیا گیا تھا۔ اسی کے مثل جعفری کو بھی ملا۔

جب دونوں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں تو اختری نے طرفین پر زور ڈال کے خورشید مرزا کا نکاح ہرمزی کے ساتھ کردیا۔ مگر اختری اپنی شادی پر کسی طرح راضی نہ ہوئی۔



ختم شد

سید وصی اشرف چشتی دہلوی نے ضیا پریس میں چھپوا کر کتب خانہ علم و ادب کراچی سے شائع کیا۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | |